قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

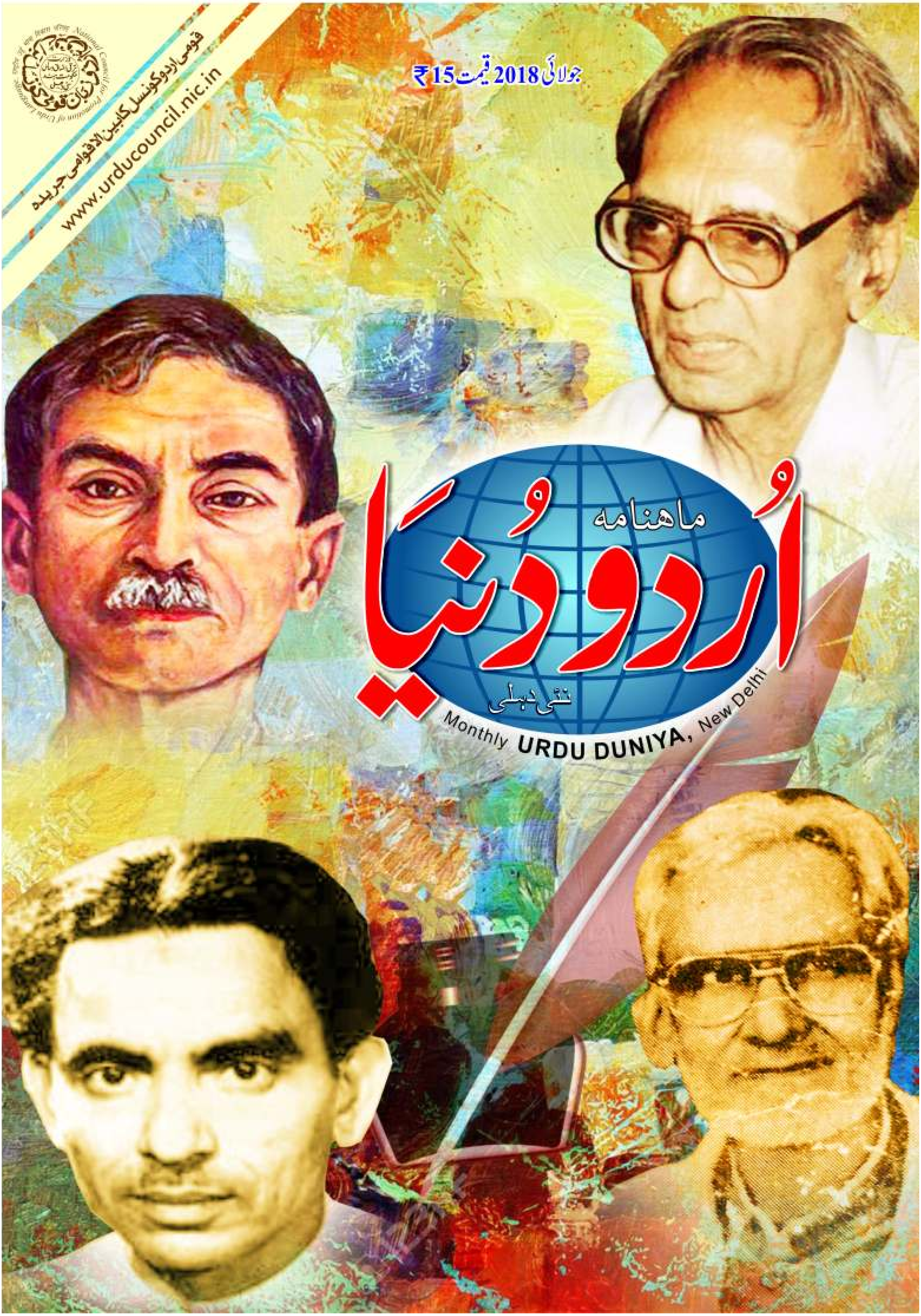

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

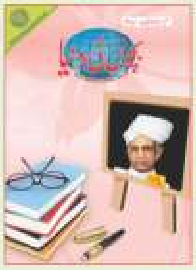

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

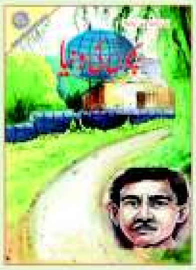
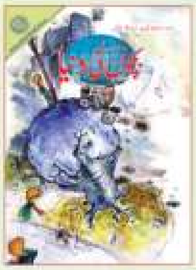

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اُردو دُنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20،شمارہ:07،جولائی2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم،حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II-نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ:محمد اکرام

ڈیزائننگ:محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

خراج عقیدت

فضیل جعفری اور لحن شورانگیز عتیق اللہ 7

انٹرویو

شمیم طارق محمد انصر 11

زبان و تعلیم

عہد حاضر میں اساتذہ کی تربیت محمد اطہر حسین 15

جولائی کے جامع الکمالات

شین مظفر پوری کے افسانوں کی
عصری معنویت شہاب ظفر اعظمی 18

روش صدیقی
سچے محب وطن اور فدائے اردو رضوان احمد فاروقی 21

پریم چند کے افسانوں میں قومی یکجہتی امتیاز احمد خواجہ 23

پروفیسر محمد حسن کی پریم چند شناسی نورعالم خان 25

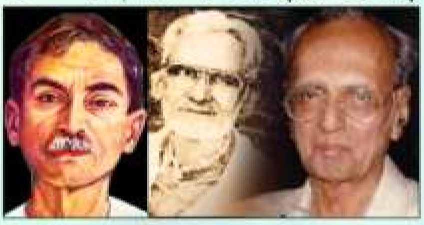

شخصیات

گوہر جان گوہر:ایک مغنیہ،ایک شاعرہ شاہد ساز 27

خورشید آرا بیگم کی ادبی و سماجی خدمات محمد اسداللہ 29

نقد و نگاہ

قاضی سلیم:ضمیر کی آواز کا شاعر ابرار رحمانی 31

اردو افسانے کے رجحانات مسعود جامی 34

مراسلہ نگاری اور ذرائع ابلاغ بدر محمدی 36

اردو گیت کا سفر بحوالہ پنجاب ندیم احمد ندیم 38

داستان امیر حمزہ کی مختلف اشاعتیں عرشی خاتون 42

نگر نگر اردو

بھٹکل کی موجودہ ادبی صورت حال شاہ رشاد عثمانی 44

خصوصی مطالعہ

کلیاتِ خواجہ احمد عباس حقانی القاسمی 49

دانش گاہیں

جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ نبی احمد 57

سلسلۂ صحافت

اردو رسائل کے خصوصی شماروں کی اہمیت فرزانہ بیگ 60

گفتگو

محمد اقبال سے بات چیت جویریہ قاضی 63

نیا آسماں، نئے ستارے

شاہ عالم آفتاب کی شاعری محبوب الٰہی 65

اردو ادب میں انشائیہ منظر کمال 68

طب اور صحت

تمباکو حکیم حبیب الرحمٰن 72

کمپیوٹر

ورڈ پیڈ 74

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 76

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 86

ہماری بات

ہر معاشرے میں منفی اور مثبت قوتوں کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ منفی قوتوں کا مقصد حقائق کو مسخ کر کے ذہنوں میں غلط فہمیاں پیدا کرنا ہوتا ہے جبکہ مثبت قوتیں اپنے ذہن کے اس زاویے کو استعمال کرتی ہیں جس سے معاشرے میں تعمیر اور تشکیل کا جذبہ پیدا ہو۔ ان دونوں قوتوں کے تصادم میں کبھی کبھی منفی قوتیں اس لیے غالب آ جاتی ہیں کہ مثبت سوچ رکھنے والے خاموش رہ جاتے ہیں۔

یہ تصادم صرف سماج یا سیاست کی سطح پر نہیں ہے بلکہ ادب وثقافت کا بھی یہی المیہ ہے۔ یہاں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو ہر شے کو منفی زاویے سے دیکھنے کا عادی رہا ہے اور مثبت پہلوؤں کو نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ اپنے تخریبی اندازِ نظر کو ذہنوں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب وثقافت کے تعلق سے جو حقیقی صورتِ حال ہے وہ سامنے نہیں آپاتی اور سادہ لوح ذہنوں میں ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جو حقائق کے منافی ہوتی ہے۔

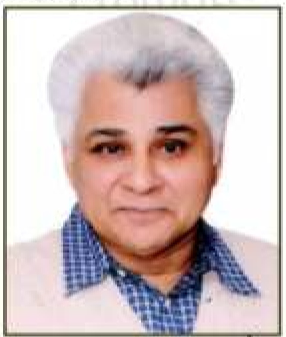

اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے پورے ہندوستان میں جو ادارے کام کر رہے ہیں چاہے وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، ان کے تعلق سے بھی کچھ لوگوں کا منفی اندازِ نظر ہے اور اس کی وجہ معلومات کی کمی، حقائق تک عدم رسائی کے علاوہ ذہنی تعصبات وتحفظات بھی ہیں جو انھیں حقیقت حال سے دور رکھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اردو ادارے فروغِ اردو کے لیے سرگرم اور سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے محدود یا وسیع تر دائرۂ عمل میں زبان وادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر ادارے کا اپنا دائرۂ کار، اپنی ترجیحات، اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں جن سے ان اداروں کو گزرنا پڑتا ہے۔ تمام سیاق وسباق اور جہات وجوانب کا خیال رکھتے ہوئے ہر ادارہ اپنا کام کرتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ جو ذمے داریاں اسے تفویض کی گئی ہیں وہ خوش اسلوبی سے انجام دی جائیں اور اس کے لیے ماہرین سے مشورے اور تجاویز بھی طلب کیے جاتے ہیں اور ان کی روشنی میں ایک لائحۂ عمل طے کیا جاتا ہے۔ پھر بھی کوئی ادارہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے مگر تنقید برائے اصلاح ہو تو اس کی افادیت مسلّم ہے اور اگر وہ صرف اپنے تعصبات کے اظہار کے لیے ہو تو یہ نہایت مضر ہے۔ اس سے نہ صرف اداروں کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ عوام میں بھی ایسے تعصبات کا غلط پیغام جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اس کی بھی اپنی ترجیحات اور پالیسیاں ہیں۔ اس ادارے نے اپنے قیام سے لے کر اب تک فروغ اردو کے لیے جو کوششیں کی ہیں اب وہ تاریخ کا نمایاں باب بن چکی ہیں۔ مختلف سماجی، سائنسی، تکنیکی، ادبی موضوعات پر معیاری کتابوں کی اشاعت ہو۔ سمیناروں اور مشاعروں کے انعقاد میں مالی تعاون ہو یا مختلف موضوعات پر پروجیکٹ کا سلسلہ ہو یا ای کتاب، ہندوستان کے طول وعرض میں اس ادارے کے ذریعے مختلف حوالوں سے اردو زبان وادب کو فروغ مل رہا ہے۔ کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر کے ذریعے بھی اس ادارے کا رشتہ ہندوستان کے تمام شہروں، قصبات اور دیہات سے جڑا ہوا ہے اور فاصلاتی نظامِ تعلیم کے وسیلے سے بھی بیشتر افراد اور علاقوں سے جڑنے کی کوشش جاری ہے۔ ایسی تمام کوششوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی اردو کونسل اپنے تاسیسی مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اردو زبان وادب کے شیدائی کونسل کی کارکردگی کی نہ صرف ستائش کرتے ہیں بلکہ زبان وادب کے فروغ میں اس کی نمایاں خدمات کا اعتراف بھی مختلف سطحوں پر ہوتا رہا ہے۔ تحقیقی مقالوں اور مضامین کی صورت میں بھی قومی اردو کونسل کی اشاعتی اور دیگر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے حوصلہ افزا بات ہے کہ پورے ہندوستان سے اردو سے جڑے ہوئے افراد قومی اردو کونسل کو اردو کا ایک معتبر اور باوقار ادارہ تسلیم کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے بھی نوازتے ہیں جن کی روشنی میں ہم کونسل کے دائرے کو اور آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں ان محبانِ اردو کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو تعصبات وتحفظات سے پاک ہو کر مثبت زاویۂ ذہن سے ہماری کارکردگی کا نہ صرف جائزہ لیتے ہیں بلکہ ہر محاذ اور ہر موقعے پر ہماری حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

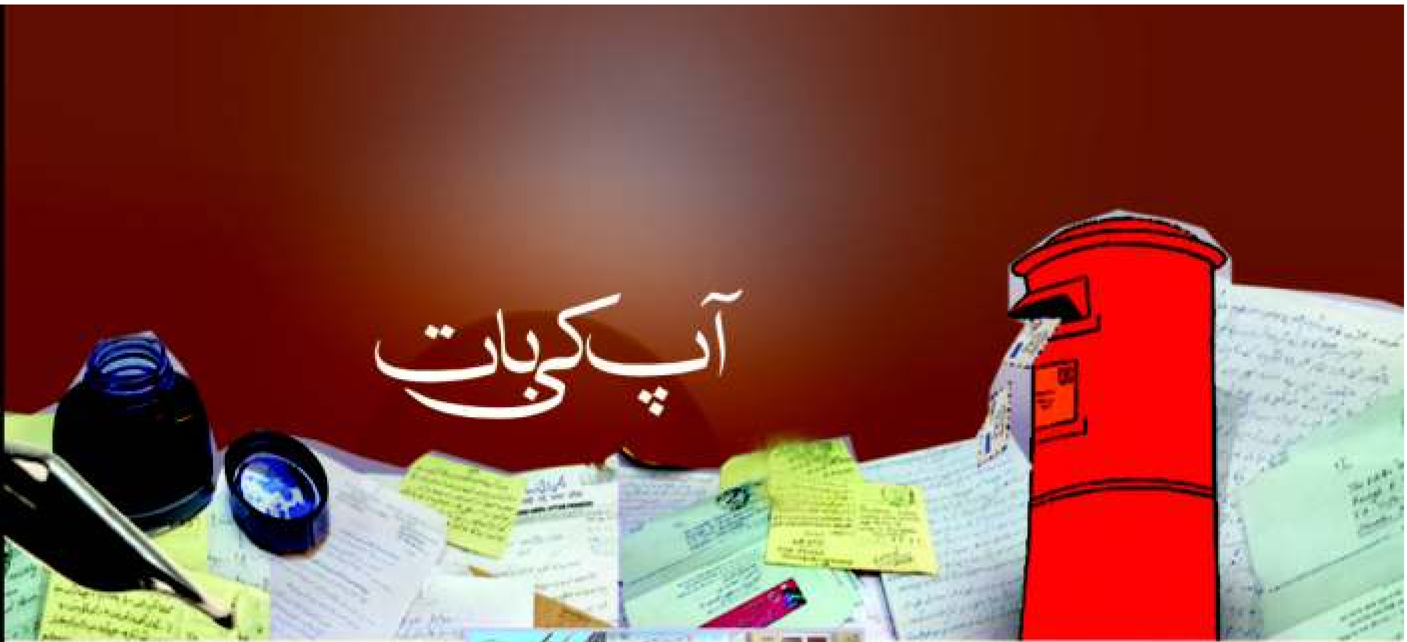

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' کی مئی 'ہماری بات' میں آپ نے کتابوں کی اہمیت کو پوری صراحت سے واضح کرتے ہوئے دورِ حاضر میں سرگرم عصری ٹیکنالوجی کو کتابوں سے جوڑنے کا موثر مشورہ دیا ہے جو برحق ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے راستے سہل کردیے گئے ہیں۔ ہند اور بیرونِ ہند میں انٹرنیٹ کے ذریعے سوشل میڈیا پر بہت سارے ویب منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں ہر ذوق اور ہر سطح کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔ اس کے باوصف جو بات صفحات و سائنس قرطاس کی صورت میں جو ہم کتابوں کے مطالعہ کو زندگی کا حصہ بنایا کرتے تھے عصری ٹیکنالوجی اس موثر رول کو ادا کرنے سے قاصر ہے مانا کہ انگلیوں کی جنبش سے دنیا جہاں کی کتابیں ویب سائٹس پر ہمیں مل جاتی ہیں اور ہماری معلومات میں اضافے بھی کرتی ہیں لیکن کیا ہم نے بھی اس تصویر کے دوسرے رخ کا جائزہ بھی لیا ہے کہ عصری ٹیکنالوجی نے کتابوں کی اشاعت وطباعت کو ناشرین اور (Publishers) کے ہاتھوں سے ان کے طباعتی و اشاعتی حقوق کو چھین لیا ہے۔ عصری ٹیکنالوجی کی وجہ سے کتنے کاتبین، منشی، قلم کار اور پریس کے مزدور بائنڈر، پرنٹرس بے روزگاری کا شکار ہوکر گھروں میں بیٹھ چکے ہیں۔ یہ اپنا ذاتی پیشہ چھوڑ کر مختلف سطحی کاموں میں منہمک ہوکر اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے ہیں ہمیں اس پہلو پر بھی غور وفکر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

مضامین کے حصے میں محمد نصر اللہ خان نے اپنے شیریں مضمون 'اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا رومان پرور جائزہ لیا ہے اور وہ خود بھی مبصر سے زیادہ مداح اختر کی صورت میں اپنے آپ کو اجاگر کرگئے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اختر شیرانی شاعر شباب کے طور پر رومان پرور دلوں پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں اور یہ ورثہ انھیں پر ختم نہیں ہوا۔ اختر شیرانی کی اس رومان پرور جانشینی شعوری اور لاشعوری طور پر ان کے ہم عصرین اور ان کے بعد آنے والے شعراء نے بھی اس شفق زارِ صنفِ عشق ومحبت کو اپنے اپنے انداز ولہجے میں اپنانے کی کوشش کی ہے ان کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ بالخصوص مجاز کے بعد ساحر، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، قتیل شفائی، فیض احمد فیض، شمیم کرہانی، حسرت جے پوری، احمد فراز، بیکل اتساہی اور راقم تک کو بھی اختر شیرانی کی وہ آتشہ رومانی فکر وفن کے جادو نے کسی نہ کسی صورت میں باندھے رکھا اور اختر شیرانی نے حسن وعشق کے رومانی جذبات سے لبریز مضامین کو نظموں اور نغموں کا روپ دیا۔ بلاشبہ وہ اس میدان کے شہ سوار اور امام فن کہلانے کے مستحق ہیں۔

مہ نور زمانی بیگم کا نام اور کام راقم کے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔ موصوفہ نے جنوبی ہند کے عصری ادب میں علاقائی اثرات کا جائزہ اپنی زمانہ ساز نقد ونگاہ سے لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوفہ نے اس دور کے رہن سہن، رسومات و رواج، شادی و بیاہ اور دسترخوان کے دکنی لوازمات کو اپنے پیمانے سے پرکھا ہے۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی تمل ناڈو

✍ اردو دنیا ماہ مئی 2018 کا شمارہ اسی آب وتاب کے ساتھ خوش نما سرورق اور معلومات و اردو ادب کی تازہ خبروں سے پر، وقت مقررہ پر موصول ہوا۔ حقانی القاسمی کے قلم سے لکھی پانچویں عالمی اردو کانفرنس کی روداد پڑھ کر دل خوش ہوا، اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر اردو کونسل کے تمام عملہ اور خاص کر پروفیسر سید علی کریم صاحب کو مبارکباد۔ دیگر مشمولات میں محترمہ مہ نور زمانی بیگم کی تصنیف جنوبی ہند کے عصری اردو ادب میں علاقائی اثرات، جناب عبدالرزاق زیادی کا مضمون اردو ادب اور ٹیگور، جناب ریاض احمد کا مضمون ملیالم اور اردو، اور دیگر مضامین اور قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کا خبرنامہ قابل تعریف اور قابل مطالعہ ہے۔

رفیق ابراھیم پرکار: مقام پوسٹ کرجی، کھیڑ ضلع رتناگیری مہاراشٹر

✍ محترمی، اردو دنیا کا حالیہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس موقر جریدے میں ہمیشہ ہی بہت کچھ پڑھنے اور ذہن کو جلا بخشنے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ مصنفین کی آرا سے اختلاف کیا جائے یا اتفاق، دل و دماغ کے دریچے ہر صورت میں کھلتے ہیں۔ فی الوقت میں 'فدائے لکھنؤ' (مصنفہ پروین طلحہ) کے اردو ترجمے پر کیے گئے تبصرے کے متعلق کچھ کہنا چاہوں گی۔ فاضل مبصر نے مجموعے کے مشمولات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن ایک گوشہ تشنہ ہے۔ چونکہ وہ انگریزی اور بنگال پر نہیں بلکہ ترجمے پر تبصرہ کررہے تھے اس لیے مترجم اور ترجمے کے وصف میں مزید کچھ لکھنا

ضروری تھا۔

صبیحہ انور صاحبہ خاصی معروف ادیبہ ہیں جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ایک سفرنامہ اور اردو میں خودنوشت سوانح کی اہمیت پر ایک ضخیم کتاب شائع ہوکر مقبول ہو چکی ہے۔ انگریزی سے اردو میں یہ ترجمہ ان کی پہلی کوشش ہے اور اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے کہ ترجمے کے میدان میں کوئی تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اتنا سلیس، بامحاورہ اور اصل سے قریب ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے لکھنوی تہذیب اردو زبان میں جس طرح ابھر کر سامنے آتی ہے، انگریزی میں نہیں آپاتی۔ یہی کتاب اردو میں لکھی جاتی اور انگریزی میں ترجمہ ہوتا تو یہ لطف نہ آتا۔ ترجمہ اصل متن کو دور دور تک لے جاتا ہے۔ اس طرح محترمہ طلعہ کی کتاب اردو داں حضرات تک پہنچانے کا سہرا صبیحہ انور صاحبہ کے سر ہے۔ ان کا اسلوب، بامحاورہ اور فصیح زبان جو بحیثیت افسانہ نگار ان کا خاصہ ہے، ترجمے میں بھی موجود ہے۔ اس طرح محترمہ طلعہ کے انشائیے بے حد دلچسپ صورت میں اردو قاری کے سامنے آتے ہیں۔

دوسری بات میں اردو دنیا کے گذشتہ شمارے اپریل 2018 میں شائع ہونے والے ایک مضمون 'اردو ادب میں سنت کبیر کا مقام' مصنفہ یوسف صابر، کے حوالے سے کچھ کہنا چاہوں گی (یہ راقم الحروف کی ذاتی رائے ہے جس سے اختلاف کا حق سب کو ہے) میرا خیال ہے کہ اردو ادب نے سنت کبیر کو اپنے یہاں جگہ دی ہی نہیں ہے۔ پہلے جگہ دی جائے اس کے بعد ہی ان کے مقام کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ بھکتی کال کے تقریباً سبھی شاعروں کے یہاں اردو فارسی کے الفاظ ڈھونڈنے سے مل جائیں گے لیکن کچھ اردو فارسی الفاظ کی شمولیت سے انھیں اردو کا شاعر نہیں قرار دیا جاسکے گا۔ ان تمام شعرا میں سب سے کھردری زبان کبیر کی ہے۔ وہ دراصل ایک مقصد کے تحت شاعری کرتے تھے۔ زبان کے حسن کی پروا ان کو نہیں تھی۔ جگہ جگہ گھومنے اور عوام کے ذہن و دل تک پہنچنے کے لیے ان کے یہاں مروج الفاظ کو اختیار کر لیتے تھے۔ ان کی زبان کے لیے لفظ سدھکڑی (सधुक्कड़ी) استعمال کیا جاتا ہے۔ کبیر سے منسوب سارا کلام کبیر کا ہے بھی نہیں اور اس معاملے میں ہندی محققین میں آج تک اتفاق رائے نہیں ہوسکا ہے۔ مضمون کے فاضل مصنف نے کبیر کے کلام پر روشنی ضرور ڈالی ہے لیکن آخر میں وہ کسی ایسے نتیجے تک پہنچنے (اور اپنے قاری کو پہنچانے)

میں کامیاب نہیں ہیں کہ اردو ادب میں سنت کبیر کا کیا مقام ہے۔ راقم الحروف نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر کے امتحان پاس کیے، علاوہ ازیں بی۔اے میں اردو ادب بطور اختیاری مضمون لیا لیکن کبیر کو پڑھا ہندی میں۔ ان میں سے کسی کورس میں کبیر نہیں پڑھائے گئے۔ ویسے وہ ہیں بہت پیارے انسان۔ بہت پیارے مصلح۔ اور کہیں کہیں واقعی خوبصورت زبان بھی لکھ گئے ہیں۔

✿ **ذکیہ مشہدی**: ایف 1، گرانڈ پلوی کورٹ، کورٹ روڈ، پٹنہ، بہار

مکتوب نگار کے لیے رسائل و جرائد کے مدیران حضرات کو مکتوب رقم کرتے وقت اداریہ کی بابت دو چند باتوں کا ذکر دیانتی نقطۂ نظر سے ناگزیر ہوجاتا ہے کیونکہ مدیر کا محنت اور لگن سے لکھا گیا اداریہ کسی بھی شمارے کا صدر دروازہ ہوا کرتا ہے، داخل مکان کے وقت آنے والے کو اگر دروازے پر دلکش و دلپذیر خوشبو کا احساس ہوگا تو مختصر ہی سہی آنے والا اس کا ذکر خیر کرے گا، سال 2018 کے اپریل مہینے کے اردو دنیا کا اداریہ بھی بے حد خوشبودار، معطر، معلوماتی نیز مبنی بر حقیقت ہے۔ حکومت ہند اردو کے فروغ کے تعلق سے قابل ستائش ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان محض ایک فعال ادارہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک ادبی، لسانی، تہذیبی اور تکنیکی دنیا کا تحریری، تاریخ ساز اور دستاویزی کارخانہ ہے جس کا موضوعاتی پروڈکشن تاقیامت کارآمد ثابت ہوتا رہے گا۔ محبوب خاں اصغر صاحب کا مظفر مجاز صاحب سے لیا گیا انٹرویو معلومات افزا ہے۔

✿ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ، بہار

پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب ابتدا تا اختتام کے لیے کسے مبارکباد دوں ارتضی کریم صاحب کی انتظامی صلاحیت کو، کانفرنس کے مختلف اجلاس کے شرکا کو، ناظرین کو یا مرکزی حکومت کے اس اعتماد کو جو اسے ارتضی کریم پر ہے؟ اشوکا ہوٹل سے اسکوپ بھون تک جس کامیابی کے ساتھ تمام اجلاس کا اختتام ہوا ہے اس کے لیے الفاظ کا انتخاب مجھے مشکل نظر آتا ہے۔

کانفرنس کا تیسرا اجلاس اور آخری یعنی ڈرامہ سے میں کلی طور پر مستفیض ہوسکا۔ تیسرے اجلاس میں داستان، افسانہ، غزل، نظم اور رباعی وغیرہ میں مختلف مکالمہ نگاروں نے مختلف عالمی مسائل کے تذکرے کو دکھانے کی کوشش کی لیکن سارے مقالے مجھے نصابی جیسے لگے۔ ایک غضنفر صاحب نے ایسا مقالہ پڑھا کہ میں اس میں تقریباً کھو سا گیا۔ پریم چند، کرشن چندر اور خود ان کی کہانی میں دلت کے دل کا درد انھوں نے کچھ اتنے تخلیقی انداز میں بیان کیا کہ وہ درد میں اپنے سینے میں محسوس کرنے لگا۔ جلسے کے اختتام پر میں نے انھیں مبارکباد بھی دی لیکن جب گھر آکر میں نے اس پر غور کیا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مقالہ دلت کی ہمدردی میں تھا یا بالمیکی کے اعتراض کے جواب میں۔

اب ڈرامہ 'میں اردو ہوں' کے بارے میں کیا لکھوں یہ تو کانفرنس کا حاصل تھا۔ اگر اس اجلاس سے میں غیر حاضر رہتا تو شاید خود کو بھی معاف نہیں کرتا۔ اس میں اردو کی تاریخ اس کا ارتقا اس کا عروج اور اسے زوال آمادہ بنانے کی کوشش سب کچھ ہے۔ جس لڑکی نے اردو کا کردار کیا اس نے تو اپنی اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ اردو سے جسے ذرا بھی ہمدردی ہوگی اس کی آنکھیں یقیناً بھیگ گئی ہوں گی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت، ہندی، اور دوسری زبانوں کی اداکارائیں اور اداکاروں نے بھی پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ اپنے اپنے کردار نبھائے۔ قابل مبارکباد ہیں ڈرامہ نگار ایس۔ این۔ لعل اور ہدایت کار اطہر نبی۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری تخلیقی قوت اس میں جھونک دی ہو۔ موسیقاروں نے بھی اپنے فن کا زبردست مظاہرہ کیا۔ آج کئی دن ہوگئے ہیں مگر آج تک اس ڈرامے کے اثرات سے میں باہر نہیں ہوسکا ہوں اور ہاں اس انتخاب کے لیے جناب ارتضی کریم کو مبارکباد نہ دینا صریحاً بے ایمانی ہوگی۔

✿ **بدنام نظر**: موضع کندا، شیخ پورہ، بہار

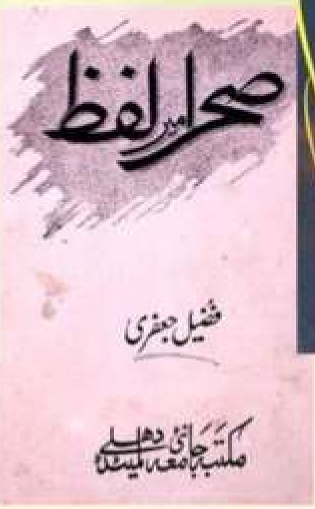

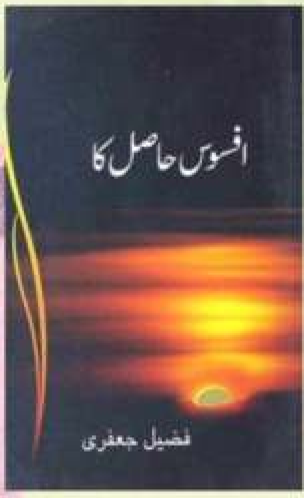

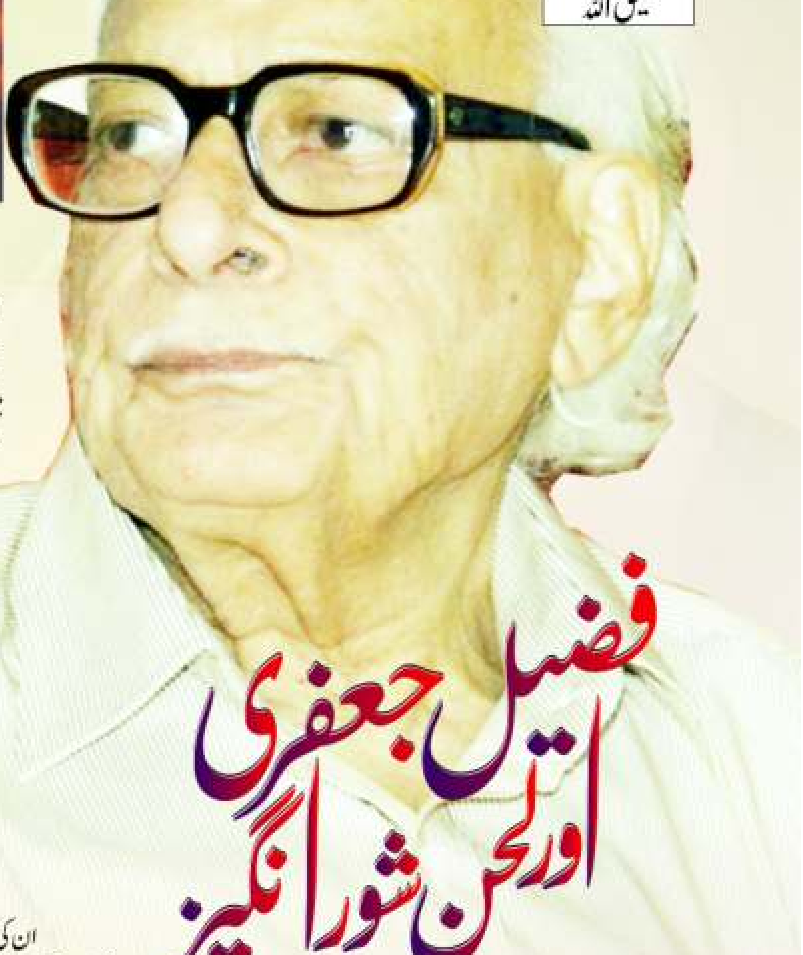

عتیق اللہ

فضیل جعفری اور لحنِ شور انگیز

فضیل جعفری بھی نہیں رہے (وفات 30 اپریل 2018) فضیل الہ آباد کے تھے۔ وہیں ایم اے انگریزی ادبیات تک تعلیم پائی۔ شروع ہی سے بے حد سرگرم اور فعال تھے۔ ان کے اپنے کچھ اصولِ زندگی تھے اور کچھ نظریاتِ ادب جنھیں عقیدت کی طرح انھوں نے حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا۔ ارادے کے مضبوط تھے۔ سو ثابت قدم رہے۔ انحراف، انکار اور اپنے قول پر قائم رہنے میں کبھی اپنے آپ کو کم زور نہیں ہونے دیا۔ تھے جعفری خاندان کے فرد لیکن اپنی آن بان میں ولایتی پٹھانوں جیسا کروفر تھا جو ایامِ جوانی میں شدید تھا اور یہ شدت کسی نہ کسی طور سے اورنگ آباد تک برقرار رہی، بمبئی جانے کے بعد تھوڑی سی دم لینے کی منزل بھی آئی مگر خود کو پسپائی، مورچہ چھوڑنے یا گوشہ گیری کا موقع فراہم نہیں کیا۔ میں جب 1971 میں اورنگ آباد منتقل ہوا تو وہاں ان کی یادوں کے محض کچھ نقوش لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھے۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ ان کی شخصیت میں کجی تھی لیکن وہ کج رو نہیں تھے، بعض کے لیے انا پرست، بعض کے لیے دوستوں کے دوست، اخلاق مند، بے ریا، بے لوث۔ اتنی بہت سی خوبیوں کی جو شخصیت مالک ہو اس میں اگر تھوڑی سی کجی ہو، وہ تھوڑا سا خودسر ہو تو اسے انگیز نہ کرنے میں کوئی اور چیز مانع نہیں ا سکتی۔ یہ کم نہیں کہ وہ خودسر تھے خود بیں نہیں تھے۔ خود رائے تھے خودخواہ نہیں تھے۔ اسی لیے اردو ادبی معاشرے میں انھوں نے پبلک ریلیشنگ پر کبھی یقین نہیں کیا۔ درباداری سے ہمیشہ دامن کش رہے۔ ان کی فرہنگِ حیات میں تشہیربازی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ یہی ان کی سعادتیں تھیں اور یہی انعام واکرام۔

مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ الہ آباد یونیورسٹی کے لائق طالبِ علم ہونے کے باوجود وہاں اپنے لیے کوئی راہ کیوں نہیں نکال سکے یا ملازمت کے حصول میں ان کا مزاج مانع آتا رہا۔ جامعات کے شعبے عموماً امیدواروں کی اہلیت کو کم ان کی خدمت گزاری، چاپلوسی اور غلامانہ ذہنیت کو زیادہ اہل اور مستحق سمجھتے ہیں۔ فضیل جعفری مرحوم کو اماں ملی بھی تو کہاں، سلطنتِ آصفیہ کا شہر اورنگ آباد، جسے ملک عنبر نے بسایا تھا اورنگ زیب نے جب اسے اپنا مستقر بنایا تو اس کا نام اورنگ آباد ہو گیا۔ جو دولت آباد سے بیس بائیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہ دولت آباد وہی ہے جسے محمد بن تغلق نے ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ جب فضیل اورنگ آباد پہنچے تو محمد بن تغلق کو دولت آباد سے رخصت ہوئے تقریباً چھ سو برس ہو چکے تھے اور اورنگ زیب کا انتقال 1707 میں ہو چکا تھا۔ سارا میدان خالی پڑا ہوا تھا۔ ان حالات میں اورنگ آباد میں فضیل کا ورود بامسعود ہوا جہاں بزرگوں میں مولوی یعقوب عثمانی مرحوم تھے۔ ان کے علاوہ سکندر علی وجد، جوگندر پال، قاضی سلیم، بشر نواز، قمر اقبال، شیخ عصمت جاوید، صفی الدین صدیقی، شمیم احمد، صادق، جاوید ناصر، رفعت نواز، عارف خورشید، یوسف عثمانی وغیرہ سے ادب کی انجمن آراستہ تھی۔ اس پر فضیل کی آمد آمد سونے پر سہاگا۔ جدیدیت کا بگل بج چکا تھا، سوغات، تلاش اور تخلیق کے علاوہ جس رسالے نے سارے منظرنامے کی کایا ہی پلٹ دی تھی، وہ تھا شب خون (الہ آباد) یعنی فضیل کی زادبوم اور ترقی پسندوں کا مرکز۔ فاروقی نے شب خوں مار کے ترقی پسندوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ادب کا میدان ایک اکھاڑے میں بدل گیا۔ وہ تو شکر کیجیے کہ اصلی ترقی پسند جنگ باز تو بڑھاپے کی کگار پر تھے اور قویٰ مضمحل ہو چکے تھے جب کہ جدیدیوں کی پلٹن نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ وہ زیادہ پرجوش، سرکش اور نئے ادبی رجحانات کا علم رکھتے تھے۔ انھیں میں فضیل جعفری بھی تھے، جو شاعر پیدا ہوئے

تھے اور اپنے انداز کے منفرد غزل گو تھے لیکن انگریزی بحرِ ادبیات کے شناور بھی تھے۔ ایک تو اورنگ آباد کی فضا نے مہمیز کی دوسرے علم کا زور، تیسرے جنگ بازی کو کھیل سمجھنے کا شوق۔ بس فضیل بھی محاذ آرا ہو گئے۔ جدیدیت کی خوب وکالت کی، ترقی پسند ادیبوں کی خوب خبر لی۔ دلائل کی دھونس دی، آہنگ کو بلند رکھا، شعر شور انگیز نہ کہا ہو لیکن لحن شور انگیز ضرور رکھا۔

فضیل جعفری ان معدودے چند نقادوں میں سے ہیں، جن کی تحریروں کا مجھے شدت سے انتظار رہا کرتا تھا۔ انتظار اس لیے کہ 'بے باکی اور صاف گوئی' ان کی تنقیدی گفتار کی ایک نمایاں شان ہے۔ میرے نزدیک وہ محمد حسن عسکری، سلیم احمد، شمیم احمد (پاکستان) اور وارث علوی کی قبیل کے نقاد ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ فضیل محض چھیڑ خانی پر اکتفا نہیں کرتے، وہ نہ استدلال پر تاثر کی بے محابا رَو کو حاوی ہونے دیتے ہیں نہ اپنے دعوے کو دیگر غیر متعلق جزئیات میں گم ہونے دیتے ہیں۔ فضیل جعفری کی نئی تنقیدی کتاب 'آبشار اور آتش فشاں' (جس میں سنہ اشاعت 2007 درج ہے اور جسے قومی کونسل دہلی نے شائع کیا ہے) ان کے اسی شعار کے ساتھ مخصوص ہے اور جو گیارہ طویل مقالات پر مشتمل ہے۔

فضیل جعفری کی پہلی تنقیدی تصنیف 'چٹان اور پانی' (1974) شروع سے آخر تک کئی متنازع ادبی مسائل کو محیط تھی۔ ان دنوں فضیل جعفری جوان العمر تھے اور وہ جدیدیت کا زمانہ عروج تھا۔ محمود ہاشمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کی تحریریں جدیدیت کا روزمرہ بن گئی تھیں۔ احتشام حسین اور عمیق حنفی کے مناظرے نے ان مباحث میں کافی شدت و حدت پیدا کر دی تھی۔ اسی دوران فضیل بھی جدیدیت کے ایک اہم علم بردار کے طور پر ابھرے اور اس فتیلے کو آگ دکھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ 'چٹان اور پانی' میں انھوں نے ترقی پسندی کے برخلاف جدیدیت کو قائم کرنے نیز جدیدیت سے متعلق ان شکوک و شبہات کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا جو قریب ترین پیش رَووں کی طرف سے پیدا کیے گئے تھے۔

فضیل اردو ادب کے استاد نہیں تھے اس لیے نصابی قسم کا کوئی مضمون 'چٹان اور پانی' میں عنوان نہیں بنا۔ بیش تر مقالات متنازعہ، ہنگامہ خیز، بحث طلب اور معاصر ادبی مسائل کو مختص تھے۔ زبان بہت ڈھیلی ڈھالی، اکھڑی اکھڑی بلکہ اکثر صحافتی نوعیت کا شائبہ فراہم کرتی تھی۔ اس دور میں فضیل کی نظر بس مسئلے پر ہوتی تھی کہ کہیں کوئی بحث کی راہ نکل آئے تو پھر ان کو روکنا مشکل تھا۔ آؤ دیکھتے نہ تاؤ پِل پڑتے۔ وہ اکھاڑ پچھاڑ مچاتے کہ ادبی ماحول عین سرما کے ٹھٹھرتے ہوئے دنوں میں بھی گرما گرم ہو جاتا اور پھر یار لوگوں کی وہ داد و دہش ملتی کہ فضیل اکھاڑہ چھوڑنے پر تیار ہی نہیں ہوتے۔ بشر نواز بھی کم سن چلے نہیں تھے۔ رسالوں کے کیڑے تھے۔ مجال ہے کوئی تحریر ان کی نظر سے بچ جائے۔ فضیل کو وہ اور بشر کو فضیل شہ دیا کرتے تھے۔ ایک اعتبار سے فضیل انھیں پٹری پر لے آئے۔ بشر بھائی نے ان دنوں کئی نہایت عمدہ مضامین لکھے۔ نثر بھی خوب لکھتے تھے اور فضیل سے اچھے نثر نگار تھے لیکن بشر بھائی کو بھی بس کوئی مسئلہ درکار تھا، جہاں کوئی ادبی مسئلہ کھڑا ہوا، بشر بھائی بھی اٹھ کھڑے ہوتے اور بے حد مدلل اور جامع گفتگو کرتے۔ فضیل کا انگریزی ادبیات کا پس منظر تھا اس لیے ان کی دلیلوں کی نہج کچھ اور ہوتی۔ فضیل جب تک اورنگ آباد میں انگریزی کے استاد رہے۔ شاعری کم کی مجادلے اور مناظرے زیادہ کیے۔ الٰہ آباد والے تھے اس لیے شب خون مارنا جیسے ان کی فطرت میں شامل تھا۔ معاف کیجیے گا یہ جملہ محض معترضہ تھا ورنہ فضیل کبھی شب خوں نہیں مارتے دوبدو، دوٹوک، صاف اور شفاف گفتگو کرتے۔ ان کے اورنگ آباد سے جانے کے بعد بشر بھائی نے بھی تنقید کا کاروبار چھوڑ دیا، قاضی سلیم اپنی عادت کے مطابق میٹر گیج گاڑی کی طرح سست رفتاری پر قائم رہے۔ سلیم بھائی کا دربار سلامت تھا، ادبی مسائل کے حل کے لیے وہی ایک محفوظ جگہ تھی اور جوگندر پال کا دم غنیمت تھا، جو پھونک پھونک کر اورنگ آباد کی ادبی فضا کو تازہ دم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

'آبشار اور آتش فشاں' کے بالترتیب دو مضامین موسوم بہ 'ساختیاتی کباب میں ردِ تشکیل کی ہڈی' اور 'تھیوری، امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت' میں مابعد جدیدیت پر فضیل اسی طرح حملہ آور ہوئے ہیں جس طرح 'چٹان اور پانی' میں ترقی پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان مضامین کو پڑھنے کے فوری بعد یہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ فضیل کی نگاہیں کہیں پر تھیں اور نشانے پر کوئی اور تھا۔ ورنہ دونوں مضامین میں محض ان حوالوں کو بنیاد بنا کر باتیں زیادہ بنائی گئی ہیں جو تصویر کے محض ایک رخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ گوپی چند نارنگ کو ذہن میں رکھے بغیر ان نظریات کے برمحل اور بے محل ہونے ہی پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی جاتی جن سے اس کے تناظر کی تشکیل ہوئی ہے۔ جدیدیت خود ایک صورت حال تھی، جس نے مغرب میں مذہبی سطح پر اصلاح و انکار کی روش کو ہوا دی تھی اور جو بہ یک وقت ادب ہی نہیں مصوری، موسیقی اور آرکی ٹیکچر کے اسالیب پر اثر انداز ہوئی تھی۔ ایڈولف لوز کے اس تصور نے ایک اشتہار کی صورت اختیار کر لی تھی کہ Decoration is a crime اور لی کوربیے کا یہ تصور کہ A house is a machine for living بہت مشہور ہوا تھا۔ اسی کی تمثیل کی ایک صورت اس زمانے کے 'جوتا گھروں' اور 'ڈبل دار عمارتوں' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے اثرات زگمنٹ باؤمن اور انتھنی گڈنس وغیرہ کے عمرانیاتی مطالعوں، بین الاقوامی رابطوں پر جیمس ڈیرڈیرین اور سیاست، اخلاقیات اور شناخت وغیرہ موضوعات پر جان ارّی اور اسکاٹ لیش وغیرہ کے مابعد جدید مطالعوں سے نئی اور بدلی ہوئی صورت حال کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بالخصوص سوزان ہیکمن، اسٹیون سیڈمین، ڈونا ہراوے اور کیتھرین ہیلیس کی تحریروں سے جنسی سیاسیات، تہذیبی شناخت، سائبر نیٹکس، جدید برقیاتی ٹکنالوجی اور ادب وغیرہ میں جو غیر روایتی اور بنیاد مخالف تصورات نے راہ پائی ہے، اسے مابعد جدید صورت حال ہی سے ملحق کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس مختصر تحریر میں فضیل جعفری کے خیالات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی مجھے مناظرہ آرائی سے کوئی خاص ذہنی نسبت ہے، بس اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ جو حوالے انھوں نے مابعد جدیدیت کو مسترد کرنے کی غرض سے یکجا کیے ہیں وہ یقیناً کم اہم نہیں ہیں لیکن مابعد جدیدیت کے حق میں جن کتابوں کا ایک انبار سا لگا ہے، انھیں چھونے کی بھی انھوں نے زحمت نہیں کی۔ ساختیات پس ساختیات کی قدر و قیمت گھٹانے کے ساتھ ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی نے پہلے غالب اور پھر میر کے صدہا اشعار کی تشریح جس انداز میں کی ہے اس کے ڈانڈے ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید سے ہی ملتے ہیں (سب سے پہلے میں نے ہی ڈی کنسٹرکشن کے ذیل میں فاروقی کے اس اطلاقی عمل کی طرف اشارہ کیا تھا، جو ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ بابت 1996 میں شامل ہے)۔ فضیل نے خلیل مامون کے بارے میں لکھا ہے کہ ایڈمنڈ ہُسرل اور مارٹن ہیڈیگر کے فلسفہ لسان پر سب سے پہلے انھیں نے بحث کی تھی۔ جب کہ ستر کے دہے میں محمد علی صدیقی نے نہ صرف انھیں اپنا موضوع بنایا تھا بلکہ ساختیات کے عنوان سے پہلا مضمون بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے، جو ان کی پہلی تنقیدی کتاب 'توازن' میں شامل ہے۔ مظہری ساختیات یا پس ساختیات پر ہائیڈیگر کے اثرات اور ہائیڈیگر زندہ

خداؤں کے درمیان جیسے مضامین میں ضمیر علی بدایونی نے ایسے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے جنھیں دیگر نقادوں نے چھوا تک نہیں تھا۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردوں کہ وجودیت پر سب سے پہلا مضمون بھی ضمیر علی بدایونی کا تھا۔ یہ مضمون 'اقبال وجودیوں کے درمیان' کے عنوان سے 'ماہ نو' (کراچی) میں شائع ہوا تھا۔

فضیل جعفری نے مابعد جدیدیت کے تعین زماں کے مسئلے پر بھی بحث کی ہے۔ جدیدیت کے آغاز اور خاتمے کے بارے میں بھی ہم کسی ایک تاریخ پر متفق نہیں ہوسکتے۔ آخری تجزیے کے طور پر بس یہی کہہ کر تسلی کرلی جاتی ہے کہ جدیدیت ایک سلسلہ جاریہ ہے اور ہر دور کی جدیدیت کے اپنے تقاضے اور اپنی پہچان کے معیار ہوتے ہیں۔ اینڈریو بینیٹ بھی مابعد جدیدیت کے تعلق سے اس خیال کا حامی ہے کہ مابعد جدیدیت میں 'مابعد' کا سابقہ خود ایک استبعاد کا حکم رکھتا ہے۔ کیوں کہ (مابعد : Post) یا عصری (جدید: Modern) کے بعد کیا۔ عصری کے بعد کیسے کوئی چیز واقع ہوسکتی ہے۔ جب کہ عصری محض عرصۂ رواں سے عبارت ہے۔ اس صورت میں وہ مابعد جدیدیت کے کسی بھی زمانی تعین کے خلاف ہے۔ جیسے جدیدیت کے لیے وقت کا تعین خود ایک چیلنج سے کم نہیں ہے۔ اگر معروضیت کے ساتھ غور کیا جائے تو جدیدیت کی قائم کردہ Vocabulary اور مابعد جدیدیت کی Vocabulary کے تقابل ہی سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ (خصوصاً) ادبی مطالعے میں دونوں میں جتنا اتفاق ہے اختلاف اس سے کم نہیں ہے۔ جدیدیت کی طرح مابعد جدیدیت سے بھی اختلاف کی کافی گنجائش ہے، لیکن مابعد جدیدیت نے ادب کی تفہیم کے دائرے کو وسیع بھی کیا ہے اور انکار کی اس روش کو برقرار بھی رکھا ہے، جس کے لیے پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ انکاریت ایک ایسی وبا ہے جو مغربی معقولیت پسندوں کی طویل روایت، استقامت اور اخلاقی نفاست کے تئیں ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہے۔ مابعد جدید تصور کے تناظر میں ردتشکیل Deconsrtuction کی خاص اہمیت ہے، جس کے بارے میں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی اس کا مقصد ہر اس روایت کو تہس نہس کرنا ہے (جیسے جدیدیت کے تشکیلی تناظر میں مستقبلیت اور دادائیت وغیرہ کے علاوہ ایسر ڈٹی کے تصور کا خاص حصہ تھا جن کی بنائے ترجیح NO پر تھی) جو صدیوں سے نکھرتی، سنورتی اور منتقل ہوتی چلی آرہی ہے یا اس تنظیم ہی کی مخالفت اس کے مقصد میں شامل ہے جو انسانوں کو یکجہتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بلند کوش مقصد پر

استوار ہے۔ کیا ردتشکیل کے پاس ان شبہات کا کوئی تدارک ہے کہ اس نے بھی Cynic علم واشاعت کے لیے زمین تیار کی ہے جو دانش ورانہ منظرنامے میں ایک ایسے مہلک کیڑے کی طرح ہے جو نباتات کو اندر اور باہر کی طرف کھوکھلا اور چھلنی کردیتا ہے۔

فضیل جعفری کی اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نظریات کے مباحث کو محض دو مضامین تک محدود رکھا ہے۔ دوسرے تمام مضامین کا تعلق اطلاق سے زیادہ عملی تنقید سے ہے۔ عملی تنقید میں فضیل پہلے سے قائم کردہ دعووں کی تکرار سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ اپنے اس عمل میں وہ دوسروں نقادوں کی طرح مغربی حوالوں کی بارات بھی نہیں سجاتے اور نہ ہی اقرار پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ 'انکار' ان کی تنقید کا بھی سب سے نمایاں کردار ہے۔ 'پریم چند کو سمجھنے کی ایک ناتمام کوشش' اس ذیل میں توجہ کے لائق ہے۔ پریم چند کا نام اور اردو فکشن کی روایت میں ایک آرچی ٹائپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انتظار حسین نے جس طور پر پریم چند کو رد کیا تھا، جدیدیت نے اس سے کہیں زیادہ پریم چند کو بے اوقات ٹھہرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ جس سے پریم چند کا تو کچھ نہیں بگڑا ہماری ایک پوری نوجوان نسل ضرور گم کردہ راہ ہوئی۔ فضیل نے پورے استدلال اور قوت کے ساتھ پریم چند کے غیر معمولی Contribution کو ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ فضیل کا یہ خیال نہایت درست ہے کہ ''پریم چند کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع ہے'' اور یہ بھی کہ ''منٹو، بیدی، کرشن چندر اور غلام عباس وغیرہ نے غیر محسوس طریقے سے پریم چند کی حسیت کی توسیع کی ہے۔'' لیکن خطابت وحمایت کی دھن میں وہ بعض مقامات پر غیر ضروری وکالت کرتے ہوئے عجیب سا تاثر مہیا کرتے ہیں۔ وہ یہ تو بتاتے ہیں کہ پریم چند نے جن راجپوت روایات (خودداری، قوم پرستی اور حب الوطنی وغیرہ) کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہ ہمارا قیمتی ورثہ ہی نہیں ہمارے لیے ایک زندہ حقیقت بھی ہے۔ (تسلیم) لیکن وہ یہ نہیں بتاتے ہیں کہ ان افسانوں کی فنی قدر کیا ہے۔ محض کسی قدر کو Glorify کرنے سے کوئی بھی تحریر، تخلیق کا درجہ حاصل نہیں کرلیتی۔ پریم چند کے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے، جس میں تنوع بھی ہے اور جو تخلیقیت کے اعتبار سے بھی کافی اہم ہے۔

فضیل جعفری نے غلام عباس یا احمد ندیم قاسمی پر قلم اس لیے نہیں اٹھایا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اہم فکشن نگار ہیں بلکہ اس لیے کہ انھیں مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ غلام عباس یقیناً ایک اہم افسانہ نگار ہیں اور بقول فضیل منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت کے ساتھ ان کا نام بھی لینا چاہیے۔ فضیل نے مجموعاً غلام عباس کی تکنیک کو موضوع بحث بنایا ہے نیز یہ کہ کردار نگاری، اسی تکنیک کا ایک حصہ ہے۔ فضیل نے غلام عباس کی کردار نگاری پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ خود غلام عباس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''کہانی لکھنے کے لیے سب سے پہلے مجھے ایک کردار کی جستجو ہوتی ہے۔ یہ کردار سچ کا یعنی گوشت پوست کا ہونا چاہیے۔ میں اسے اپنے ذہن میں تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ مجھے زندگی ہی میں مل جاتا ہے۔ میرا اس پر کچھ قابو نہیں ہوتا اور نہ میں اپنے نظریات اس کی زبان سے کہلواتا ہوں۔ میں تو خود چپکے چپکے اس کی باتیں سنتا اور اس کے اعمال وافعال کو دیکھتا رہتا ہوں اور یوں رفتہ رفتہ میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہوں۔ کردار اور افسانہ نگار کی اسی جان پہچان کو دراصل کردار نگاری سمجھتا ہوں۔'' فضیل، سیاہ وسفید بھنور، سایہ، غازی مرد، اور بردہ فروش' کے کرداروں پر بحث کرتے ہوئے اس نکتے پر بجا طور پر خصوصی زور دیتے ہیں کہ 'وہ (غلام عباس) کرداروں کی خارجی زندگی کا استعمال محض داخلی پہلوؤں کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کے مقصد سے کرتے ہیں۔'' 'عصمت چغتائی کا فن' عصمت کے فکشن پر لکھے ہوئے مضامین میں معرکے کا مانا جائے گا کیوں کہ فضیل نے نہایت معروضیت کے ساتھ عصمت کے مقام کا تعین کیا ہے اور بیانیہ پر ان کی مضبوط گرفت کو ایک دعوے کے طور پر پیش کیا ہے۔

'وارث علوی اور فکشن کی تنقید' ایک اچھا مضمون ہے۔ یہ اور بھی اچھا ہوسکتا تھا اگر فضیل ان کی کمزوریوں کو

بار بار Justify کرتے ہوئے نہ چلتے۔ وارث اوران کی تنقید فضیل کو عزیز ہے، اسی محبت آمیز رشتے نے فضیل کے قلم پر بھی قدغن لگائی اور وہ کھل کر وارث کو کٹہرے میں کھڑا نہیں کرسکے۔ ضرب مارنا، چکارنا، بچالینا بھی تنقید کے داؤ پیچ ہیں، جنھیں آزمانے کا فن ہمارے فضیل جعفری کو خوب آتا تھا۔ 'آبشار اور آتش فشاں' بھی اس طرح کے داؤ پیچ سے خالی نہیں ہے۔

لطف کا اک مقام ہے یہ بھی

بمبئی میں فضیل کی سرگرمی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ ایک کالج میں انگریزی کے استاد رہے۔ عہد ساز اور تاریخ ساز روزنامہ 'انقلاب' کی ادارت کے فرائض بھی بڑی دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ سنبھالے، جہاں رہے اپنی شرطوں کے ساتھ رہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جوان العمری کے خروش میں بھی تھوڑی بہت کمی آگئی تھی۔ ہر کسی دیوار سے سر پھوڑنے سے گریز بھی کیا اور پگڑی بھی سنبھالی۔ شاعری کو بالائے طاق رکھا یا شاعری کے لیے مہلت ہی کم ملی۔ معاصر تنقید پر ایک نہایت فکر انگیز تجزیاتی مطالعہ بعنوان 'کمان اور زخم' (1986) بمبئی کی عدیم الفرصتی کی دین ہے۔ کالج میں پڑھاتے بھی تھے اور ایک جامع منصوبے کے تحت مذکورہ عنوان کے ساتھ وفا بھی نبھاتے رہے۔ چونکہ جدید تنقید اور جدید نامور نقادوں اور مدحیہ نیز مزاحیہ تنقید کے نمونوں میں بہت کچھ ایسا تھا جسے برداشت کرنا فضیل جیسے سچے اور صاف گو صاحب علم کے لیے مشکل تھا، سو انھوں نے قلم کی دھار کو تیز رکھا، اپنے اسلوب نقد میں چھانٹ چھانٹ کے محاوروں کی مار مارتے رہے۔ سلیم احمد کی انھیں کی زبان سے خبر لی۔ آل احمد سرور، محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، وارث علوی وغیرہ کی تنقید کے لائق تحسین پہلوؤں کی تعریف بھی کی اور مزے لے لے کر ضربیں بھی ماریں۔ حامدی کاشمیری جیسے اہم نقاد سے انھوں نے کیوں صرف نظر کیا ہے؟ اس کے وہ یقیناً قصوروار ہیں۔ بس ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ انھیں معاف کرے۔

زبیر رضوی نے جدید نظم پر ایک سمینار منعقد کیا تھا۔ جس میں کلیدی خطبہ فضیل جعفری کا تھا۔ فضیل نے زبانی کچھ باتیں کیں جو بے حد سرسری اور تشنہ تھیں۔ وہ مجھے کچھ بجھے بجھے نظر آئے۔ سمینار ختم ہوا، شام کو زبیر بھائی کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ اورنگ آباد کا بھی ذکر نکلا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کیا بات ہے اورنگ آباد والا طرار فضیل کہاں گم ہوگیا۔

''نہیں بھائی ایسا کچھ نہیں ہے۔ کبھی موڈ ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا''، فضیل نے جواب دیا۔

''لیکن ابھی ابھی نارنگ کی کتاب پر تو آپ نے خوب جم کر لکھا ہے۔ ضربیں مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سامعین گوش برآواز تھے کہ آج اسی فضیل جعفری کا شعلہ انگیز خطبہ ہوگا، لیکن آپ——''

''ارے یار عتیق یہ سب چھوڑو تم نے بھی کس کی یاد دلادی، زبیر بیچ میں ٹپک پڑے فضیل نے لقمہ دیا'' بھائی سنو، ہم نے وہی لکھا جو صحیح سمجھا۔ کلیدی خطبہ وغیرہ یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کو مبارک۔ زبیر سے کہا بھی تھا یار، اس چکر میں مجھے مت ڈالو۔''

''فاروقی تو کسی یونیورسٹی سے منسلک نہیں ہیں، لیکن وہ تو گذشتہ تیس برسوں سے دھڑلے کے ساتھ سمیناروں کی صدارت بھی کررہے ہیں اور انھوں نے کلیدی خطبے بھی دیے۔''

''ارے یار آپ نے یہ کون سا مسئلہ چھیڑ دیا'' زبیر بولے ''نہیں زبیر بات یہ ہے کہ فاروقی نے جب شب خون نکالا تھا اس وقت جدیدیت کو قائم کرنا ان کا اوّلین مقصد تھا، ایلیٹ، رچرڈز، لیوس اور ولیم ایمپسن کے تصورات ان کے ذہن پر حاوی تھے۔ پھر تشریح و تفہیم کی راہ پر نکل گئے جس کے باعث جامعات اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبا میں بھی انھیں شہرت ملی اور اس طرح تعلیمی اداروں کے دروازے بھی ان پر کھل گئے۔ ہم تو کسی شمار میں نہیں۔ نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں۔''

''پھر بھی موضوع نئی نظم سے متعلق تھا اور آپ نے افتخار جالب کی ایک ایسی نظم کی معنی کشائی کی تھی کہ اسے مہمل کہنے والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا'' میں نے یاد دلایا۔

فضیل نے جواباً کہا'' یہ معنی کشائی خوب کہا، پہلی بار سنا، ارے یار ایسا نہیں ہے ان دنوں بکواس لکھنے والوں کی بھی ایک بھیڑ تھی، ابہام کا طوطا فاروقی نے نئے لکھنے والوں کو تھما دیا تھا، وہ لغو، بے معنی، مہمل لکھتے اور رسالوں کے خطوط میں خوب خوب تعریفیں حاصل کرتے۔''

''اب تو سارا منظرنامہ ہی بدل گیا ہے'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ تو ہونا ہی تھا''

''تو کیا اسے مابعد جدید دور کہنا چاہیے'' میں نے انھیں چھیڑا۔

اتنے میں زبیر پھر ٹپک پڑے ''ارے کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے، باتیں پھر کرنا۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ فضیل کی تیزی گفتار، نرمی گفتار میں بدل گئی تھی۔ ممبئی کی مصروفیت اور عمر کے تقاضے نے ان پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالا ہے۔ سنا کرتے ہیں کہ بندر بوڑھا ہوجائے لیکن گلاٹیں لگانا نہیں بھولتا، زبیر تو نہیں بھولے لیکن فضیل بھولتے ہوئے نظر آئے کیونکہ وہ باتیں مان بھی رہے تھے اوران کے لہجے میں کرختگی شمہ برابر نہیں تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جب کوئی ہر بات ماننے لگے تو سمجھو کہ وہ بوڑھا ہوگیا ہے۔ خیر سے فضیل بوڑھے نہیں ہوئے تھے، جیسے ہم نہیں ہوئے ہیں۔ ہم نے عیش زیادہ کیا دھکے کم کھائے۔ کھائے بھی تو انھیں یاد کم رکھا۔ فضیل مرحوم نے دھکے بہت کھائے۔ انھیں جو کچھ ملا محض ان کی اہلیت کی وجہ سے۔ اورنگ آباد ہو کہ ممبئی ان کے قدردانوں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے بھی مردم شناسوں سے کوئی دور خالی نہیں رہا۔ فضیل صاحب نے اختلاف بہتوں سے کیا لیکن دشمن کسی کو نہیں سمجھا۔ یوں بھی وہ ماضی کو کم ہی دہراتے تھے۔ غالباً بھلانے کی انھوں نے مشق کر رکھی تھی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جن کی یادداشت بہت تیز ہوتی ہے وہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ بھلانے اور بھولنے میں جو عافیت ہے وہ یاد رکھنے میں کہاں۔ زبیر بھائی کا یہی مسئلہ تھا کہ ایک بات جب ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی وہ نکلتی نہیں تھی۔ بالآخر اس کا انجام بھی ہم نے دیکھ لیا۔ فضیل مرحوم کی یہ بڑی خوبی تھی کہ ناگوار باتوں کو وہ ذہن سے جھٹک دیتے تھے۔ کوئی یاد بھی دلاتا تو ہنس کر ٹال دیتے یا ان سنی کردیتے۔ دہلی تو مکارانِ ادب کا گہوارہ ہے۔ اچھا ہی ہوا انھوں نے الہ آباد سے نکل کر دہلی کے بجائے دور دیس بسایا ورنہ کینہ وروں اور کینہ توزوں سے یہاں بچنا محال تھا۔ ویسے جو اخلاص مند اور بے لوث ہیں، ان کی کچھ بندگی رہتی ہے اور پھر آپ انھیں بہ آسانی شمار بھی کرسکتے ہیں۔ یہ شہر آج بھی قصبات کا شہر ہے۔ یہاں انا گزیدہ نام نہاد علمائے ادب اور ارباب حل وعقد کے بول سند کا درجہ رکھتے ہیں، جو ہوتا آیا ہے۔ لوگوں کے پاس غیبتوں اور ریاکاریوں کے لیے وقت ہی وقت ہے۔ ممبئی واقعتاً عروس البلاد ہے۔ وقت کسی کے پاس نہیں۔ سب اپنے اپنے غموں اور مسئلوں میں گرفتار زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ فضیل نے ممبئی بسا کر اچھا ہی کیا۔ ان میں تعلّی نام کو نہیں تھی۔ جیسے اندر تھے ویسے ہی باہر تھے۔ ادب اور انسان کو جانچنے کی ان کی اپنی کسوٹی تھی جس پر وہ قانع رہے اور یہ ان کا حق تھا۔ سوچیے اس حق کا ہم میں سے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔

■

Prof. Ateequllah
125-C/1, Flat No:5, Basera Apts. Johri Farms
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

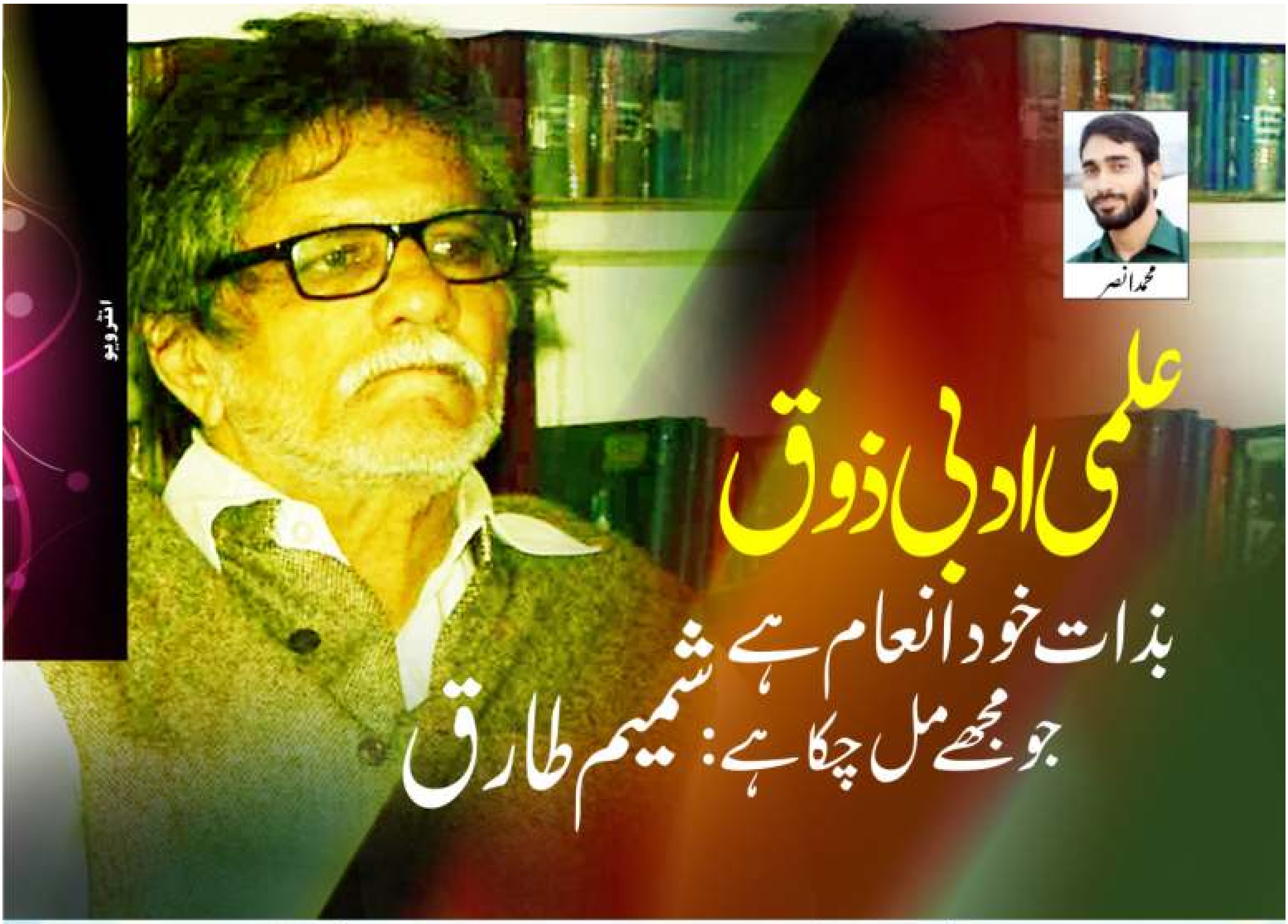

محمد انصر

علمی ادبی ذوق بذات خود انعام ہے جو مجھے مل چکا ہے: شمیم طارق

محمد انصر: آپ اپنے خاندانی پس منظر اور خود اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔

شمیم طارق: میں نے اپنے بزرگوں کی خدمت کی ہے۔ چھوٹوں سے شفقت کا معاملہ کیا ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ والدین کی زندگی میں چھ چھ ماہ اور پھر دو دو ماہ پر ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرکے ان کی قدم بوسی کے لیے جایا کرتا تھا۔ آج میں سب کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ مگر خاندان اور علاقے کے حوالے سے اپنی پہچان کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اللہ کا بندہ اور نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہوں، دنیائے انسانیت میرا کنبہ ہے۔ نوعمری سے ممبئی میں ہوں۔ میری زندگی میں حادثات بہت رہے ہیں مگر حادثات میں رہ کر بھی سرخرو ہوتا رہا ہوں۔ اگر یہ کہوں کہ میں نے اپنی دنیا خود بنائی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ جنھوں نے استحصال کو احسان بنا کر پیش کیا، منتقم حقیقی ان سے سمجھے گا، جنھوں نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر کچھ اچھا معاملہ کیا ہے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ میرے سوانحی کوائف سے قارئین کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس لیے میں اس کو بیان کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔

م ا: آپ نے لکھنے کا آغاز کب کیا اور اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں؟

شمیم طارق: کم عمری میں بھی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ گھر کا ماحول علمی تھا۔ نثر اور نظم اس عمر میں لکھنے لگا تھا جب عموماً نظم و نثر میں فرق کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ پھر ہنگامی حالات کے سبب برسوں کچھ نہیں لکھ سکا البتہ ہر حال میں مطالعہ کرتا رہا۔ مختلف موضوعات پر 19/ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ کئی کتابوں کے 6، 4 اور دو ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

م ا: عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ آپ نے جن موضوعات پر مضامین یا کتابیں لکھی ہیں ان میں تنوع بہت ہے۔ چند کتابوں کے موضوعات پر مختصر روشنی ڈالیے......

شمیم طارق: 'غالب اور ہماری تحریک آزادی' کے تین اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے یہ تسلیم کرنے کے ساتھ کہ غالب اردو ہی کے نہیں دنیا کے چند بڑے شاعروں میں ہیں اور ان کی شاعرانہ عظمت کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ پہلی جنگ آزادی کے دوران روزنامچہ لکھنے سے متعلق ان کے جو دعوے ہیں یا انگریزوں کی مدح کا انھوں نے جو جواز پیش کیا ہے وہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ غالب بلاشبہ مستقبل بیں شاعر تھے مگر وہ یہ اندازہ نہیں کر سکے کہ 1857 کے صرف 90 برس بعد یہ ملک آزاد ہو جائے گا اور انگریزوں کو بھاگنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے لیے اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ غالب کو بہادر شاہ ظفر نے مغلیہ حکومت کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا تھا مگر ان کی کسی تحریر سے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور کسمپرسی میں موت کا حال بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ایک خط میں صرف یہ اطلاع دی ہے کہ ''ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔'' اسی طرح کچھ اور حقائق بھی ہیں۔

'صوفیہ کی شعری بصیرت میں شری کرشن' میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان صوفیہ اور شعراء نے شری کرشن کو کس کس شکل میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔ ثابت یہ کیا گیا ہے کہ ایک قسم تو ان شاعروں کی ہے جنھوں نے شری کرشن کو اسی شکل میں پیش کر دیا ہے جس

شکل میں ہمارے وطن کے لوگ ان کو دیکھتے اور مانتے ہیں، دوسری قسم کے شاعروں نے ان کو عارف حق سمجھا ہے، تیسری قسم کے شعراء نے اس لفظ کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور مختلف معنی مراد لیے ہیں۔ محسن کاکوروی نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں شری کرشن اور مناسبات کرشن کا جس طرح ذکر کیا ہے وہ چوتھی قسم ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ اسلامی تصورات اور مقامی مزاج و ماحول میں ہم آہنگی کی ایسی نادر مثال شاید ہی کسی زبان میں ملے۔ اردو میں تو بالکل نہیں ملے گی۔

نعتیہ قصیدہ کا پہلا شعر ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
ابر کے دوش پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اور آخری شعر ہے

کہیں جبرئیل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالم طبعی کا حسن عالم روحانی کی ماورائیت میں ڈھل گیا ہے۔

’شرف محنت وکفالت‘ کے 6 اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کی طلب برقرار ہے۔ اس میں محنت کے شرف اور اپنی محنت کی کمائی سے دوسروں کی کفالت کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب اسلامی تعلیمات کے حوالے سے لکھی گئی ہے مگر اس کی پذیرائی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے بھی کی ہے۔ ’تقابل اور تناظر‘ تنقیدی اور تقابلی مطالعے پر مبنی مضامین مثلاً ’لسانی دہشت گردی‘، ’شبلی اور اقبال کا مشترکہ عطیہ‘، ’بھکتی تحریک اور متصوفانہ شعر و ادب‘ یا ’فارسی اور اردو کی مشترکہ فکری روایت‘ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شامل کسی مضمون میں اگر دو تخلیق کاروں کے شخصی احوال اور مزاج و طبیعت میں موازنہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے تو دوسرے مضمون میں کسی خاص رجحان، موضوع یا فکری روایت کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

میری کتابیں اور مضامین ادبی تحقیق، ادبی تنقید، لسانیاتی مطالعہ، تقابلی مطالعہ، تصوف، تاریخ، معاشیات، نفسیات سے متعلق موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے تین کتابیں شائع کی ہیں۔ تینوں الگ الگ موضوع پر ہیں۔ ’ظ شناسی‘ میں طویل مقدمے کے علاوہ ظ انصاری کی الگ الگ نوعیت کی تحریروں کا تعارف بھی ہے۔ ’حسن نعیم‘ پر مونوگراف ہے۔ ایک کتاب فرہنگ تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات کی تفہیم یا وضاحت پر مبنی ہے۔ اس میں صوفیہ کی ہی کتابوں

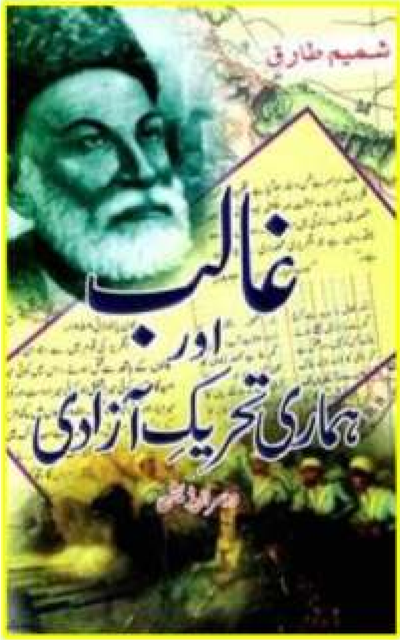

کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

م ا: اس فرہنگ سے کچھ مثالیں دیجیے......

شمیم طارق: ایک لفظ ہے ’ادب‘۔ اس کے مفہوم سے ہم واقف ہیں مگر صوفیہ ’عبودیت کی نگہداشت‘ کو ادب کہتے ہیں۔ ’نرگس‘ کا مفہوم لغت میں کچھ اور ہے صوفیہ چشم عارف سے مراد لیتے ہیں جو ’’حیرت محمودہ سے سرفراز ہو‘‘۔ اسی طرح صوفیہ ’آغوش‘ سے ’احاطۂ وجود‘ مراد لیتے ہیں۔ یہ معنی میں نے تخلیق نہیں کیے ہیں۔ صوفیہ جو کچھ لکھ چکے ہیں ان کو یا تو دہرا دیا ہے یا اخذ کیا ہے۔

م ا: آپ کی ایک کتاب آپ کی تقریر یا خطبے پر مبنی ہے......

شمیم طارق: جی ہاں...... غالب اکیڈمی، نئی دہلی نے مجھے ’غالب، بہادر شاہ ظفر اور 1857‘ کے عنوان پر خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ میں نے جو خطبہ دیا اس کو کیسٹ کی مدد سے کاغذ پر منتقل کیا گیا اور اس میں حوالے کے اقتباسات کا اضافہ کر کے شائع کر دیا گیا۔

م ا: آپ کی کئی کتابیں تصوف سے متعلق ہیں۔ تصوف سے لگاؤ کی کوئی خاص وجہ؟

شمیم طارق: مالک و خالق کی بے ریا عبادت اور بندگانِ خدا کی بے غرض خدمت میرے مزاج کا حصہ رہی ہے۔ اس مزاج کے سبب میں نے تصوف کے مطالعے کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں دعا تعویز کرتا ہوں یا کہیں کا صاحب سجادہ ہوں۔ تصوف سے میری دلچسپی میرے مزاج کا حصہ ہونے کے ساتھ ایک بہتر انسان بننے کی کوشش کا نتیجہ بھی ہے۔ اچھے لوگوں اور سچے صوفیہ کے وجود سے کوئی دور خالی نہیں رہا ہے اس کے باوجود تصوف کے نام پر دوکانداری کرنے والوں نے تصوف کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ ایسے دنیا داروں کے طرز عمل نے بھی اس موضوع کے بارے میں تجسس پیدا کیا۔ میں نے ایک عام شخص کی طرح زندگی گذاری ہے۔ ہنسی مذاق کرتا رہا ہوں البتہ لقمۂ حلال کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے سے کوئی دن خالی نہیں رہا ہے۔ لقمۂ حلال میں دوسروں کو شریک بھی کرتا ہوں۔ با فیض اور باعمل زندگی گزارنے کی فکر لاحق رہتی ہے۔ جھوٹ اور کبر وریا سے نفرت ہے اس لیے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ تصوف کی کتابوں میں جو لکھا ہے اور صوفیوں کے حلقوں میں جو کچھ رائج ہے ان میں بہت تضاد ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ بیشتر صوفیہ کے حلقوں میں بھی دوسروں سے کم دنیا داری اور تنگ نظری نہیں ہے۔ مجھے سخت ہیجان ہوتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ بزرگوں کے حالات اور ملفوظات میں بھی جھوٹ کی آمیزش کردی گئی ہے۔ وہ خاص بات جس نے تصوف کے مطالعے کی طرف راغب کیا وہ اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کے مصنفین کے مزاج کا عدم توازن بھی ہے۔ کسی نے تصوف کو دین و مذہب سے الگ کر کے دیکھا۔ کسی نے اس لفظ کو سنتے ہی ذہنی توازن کھو دیا، کسی نے شعوری طور پر تصوف اور بھکتی کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے تصوف اور بھکتی کو ’حقیقی‘ تناظر میں سمجھنے اور ان میں مماثلت اور مغائرت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

م ا: آپ کامرس کے طالب علم رہے ہیں، ادب اور صحافت کی طرف کیسے راغب ہوئے؟

شمیم طارق: ادب کا ذوق میری فطرت کا خاصہ ہے۔ صحافت سے روزی روٹی کے لیے وابستہ ہوا یا یوں کہیے کہ حالات نے وابستہ کر دیا مگر میں نے ادب کا مطالعہ نہیں چھوڑا۔ اس سے میری صحافت اور صحافتی زبان کو فائدہ پہنچا۔ شاید اس لیے کہ اچھی صحافت سچے ادب اور ادبی زبان سے وابستگی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ 1998 کے بعد سے میں کسی اخبار کے اسٹاف میں شامل نہیں ہوں اس سے پہلے روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی، کا اڈیٹر، بلٹز کا اسسٹنٹ اور پھر ڈپٹی ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔ کچھ اخبارات میں کالم بھی لکھے ہیں۔ ادھر تقریباً 25 سال سے مسلسل روزنامہ ’انقلاب‘ میں ہر جمعہ کو میرا کالم شائع ہوتا ہے۔ ایک عرصہ سے میری حیثیت کالم نگار کی ہے۔ اس کالم کے بارے میں قارئین کی جو آرا ہیں وہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جو لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں اور دیانت و شائستگی کا لحاظ کرتے ہوئے لکھتا

ہوں۔ کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھایا ہے کہ میں نے ادب اور صحافت کی زبان کے درمیان کے فاصلے کو کم کرنے اور اس روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے جس میں ادب اور صحافت کی صفات ایک ہی شخص میں جمع ہوتی رہی ہیں۔

م ا: آپ تنقید نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ تحقیق و کالم نگاری سے بھی آپ کا رشتہ ہے آپ کیسے حق ادا کر پاتے ہیں ان سب کا؟

شمیم طارق: بے شک میں تخلیق کار ہوں یعنی شاعر ہوں۔ شعر مجھ پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ بیشتر سفر کے دوران یا جب میں آرام کر رہا ہوں تو شعر ہو جاتے ہیں۔ تنقید اپنے اور دوسروں کے تخلیقی فن پاروں کا مطالعہ ہے۔ میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ جس فن پارے کا میں مطالعہ کر رہا ہوں وہ انسانی اور جمالیاتی اقدار کا حق ادا کر رہی ہے یا نہیں؟ اس کے وجود میں آنے کے پس پردہ محرکات کیا تھے اور اس کو تخلیق کرنے والا اپنے زمانے کے مزاج و ماحول سے واقف تھا یا نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھتا ہوں کہ زیر مطالعہ تخلیق میں معانی کی کتنی جہتیں اور سمتیں ہیں۔ بحیثیت قاری ہم پر شعر یا تخلیق کا حق ہے کہ وہ اپنے ہر پہلو اور پرت تک پہنچنے کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح تحقیق کا معاملہ ہے۔ تحقیق کا مطلب حقیقت کی بازیافت ہے اس کے لیے ادبی ذخیروں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تحقیق کی ضرورت تخلیق کے دوران بھی پیش آتی ہے کہ میں نے جو بات کہی ہے وہ خلاف واقعہ تو نہیں ہے؟ تخلیق کار زندگی کی جن حقیقتوں کی صورت گری کرتا ہے وہ متنوع اور متضاد ہیں اس لیے اس کو بھی تنقیدی شعور کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ تخلیق کار نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ان ہی معانی تک محدود ہیں جو متعین کیے جا چکے ہیں یا ان میں نئے امکانات بھی موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ میں تخلیق کو ایک رو اور تنقید کو ایک منصب سمجھتا ہوں۔ دونوں کے الگ الگ دائرے ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں دونوں کام کرتے رہتے ہیں۔ دونوں میں اشتراک کی بات کہی جاتی ہے تو اس لیے کہ تنقید کی زبان قابل فہم ہو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تنقید کو انشائیہ بنا دیا جائے۔ اسی طرح تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تنقیدی نگاہ کے ذریعے حشو و زائد سے پاک ہو جائے۔

م ا: آج کل 'ثقافتی مطالعات' کا ذکر کیا جاتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

شمیم طارق: زبان اور تہذیب کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زبان کا لفظ ایک خاص

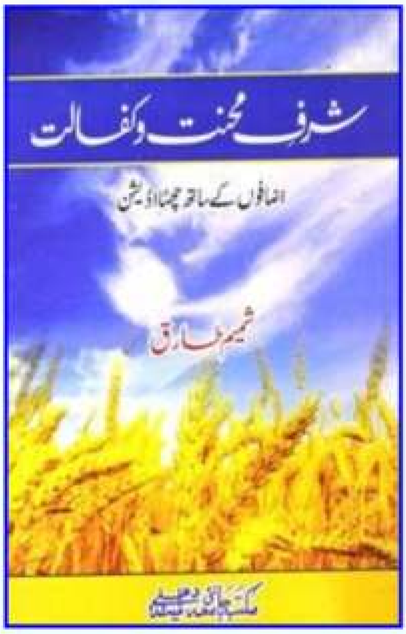

تہذیب کے ہی پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے اس لیے فرانسیسی ادب جرمن ادب سے، جرمن ادب انگریزی ادب سے اور انگریزی ادب روسی ادب سے مختلف ہے۔ یہی حال ہندوستانی ادب کا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے لفظوں کو بھی ان کے تہذیبی پس منظر کے ساتھ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو کی جڑ بھی ہندوستانی تہذیب میں پیوست ہے۔ یہ غیر ملکی لفظوں کو بھی استعمال کرتی ہے تو ہندوستانیت کے رنگ میں رنگ کر۔ مثلاً اردو میں خوشبو کا مطلب اچھی مہک ہے لیکن جہاں سے یہ لفظ آیا ہے وہاں 'خوشبودار' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے 'مکان' گھر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن جہاں سے یہ لفظ آیا وہاں 'جگہ' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی فن پارے کو اس ذہنی اور تہذیبی فضاء میں پرکھنا ضروری ہے جہاں وہ تخلیق ہوا ہے۔ یہی ثقافتی مطالعہ ہے۔ ابھی میں نے محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدہ کی مثال دی ہے۔ ہندوستانیت کو سمجھے بغیر اس کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

م ا: کیا اردو کے موجودہ ادبی منظرنامے سے آپ مطمئن ہیں؟

شمیم طارق: مطمئن تو نہیں ہوں مگر مایوس بھی نہیں ہوں۔ آج بھی ہر صنف میں باصلاحیت لکھنے والوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ بزرگ ادیب و نقادان کی تربیت بھی کر رہے ہیں۔ ایک برائی نظر آرہی ہے کہ سستی شہرت اور انعام کی رقم کے لیے کچھ لوگ بہت چھوٹی حرکتیں کر رہے ہیں۔ فرضی مراسلے لکھے جا رہے ہیں۔ کردار کشی کی جا رہی ہے۔ میں تمھیں بلاؤں تم مجھے بلاؤ کا رجحان پنپ رہا ہے۔ جن کا املا جملہ درست نہیں ہے وہ رسائل نکال رہے ہیں۔ ہماری ذمے داری یہ ہے کہ ہم اردو کے اچھے رسائل کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی بنائیں۔ یہ خراب رسائل نکالنے سے اچھا ہے۔

م ا: اچھے اور خراب رسالے کا فیصلہ کون اور کیسے کرے گا؟

شمیم طارق: فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ اس وقت اردو میں کئی ایسے رسالے نکل رہے ہیں جن کے مدیروں میں حوصلہ بھی ہے اور صلاحیت بھی۔ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ان کی کوششوں کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ باقی درجنوں رسالے کیوں نکالے جا رہے ہیں؟ یہ جاننے کے لیے کانفرنس بلانے کی نہیں اپنے دل میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ بعض رسالے تو ہر شمارے کے لیے اصحاب ثروت کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے اور ان کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے کچھ حاصل نہیں ہو پاتا اس کی کردار کشی پر اتر آتے ہیں۔ میں ہر اس ادبی رسالے کو پڑھتا ہوں جس میں سنجیدہ ادبی مسائل پر بحث ہوتی ہے مگر شائستگی کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ جن رسالوں میں اختلافات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ جن میں شکست خوردہ ذہنیت کے پروردہ لوگ دوسروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں ان کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ مقام شکر ہے کہ اس وقت بھی اردو میں کم و بیش ایک درجن ایسے علمی ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں جن کو پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان کی کمزوریاں دور ہوتی ہیں۔

م ا: کچھ اخبار و رسائل کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ نے انجمن اسلام کی کریمی لائبریری کے پرانے اخبارات اور کتابوں کو ڈیجیٹلائز کرایا ہے، اس کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں......

شمیم طارق: میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے انجمن اسلام سے وابستہ ہوا۔ 2011 میں مجھ کو کریمی لائبریری کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ علمی نوادر ضائع یا تباہ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے اپنی ترجیحات طے کیں۔ پہلا کام یہ تھا کہ کرم خوردہ صفحات میں جو بچائے جا سکتے ہیں ان کو بچاؤں۔ جو کتابیں اور صفحات بالکل برادہ ہو چکے ہیں ان کو الگ کروں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ میں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی، اس کے جوائنٹ سکریٹری اور کریمی لائبریری کے چیئرمین معین الحق چودھری اور دوسرے عہدیداران نے ہمت بڑھائی۔ شیطان بھی فارغ نہیں بیٹھتا اس لیے مختلف شکلوں میں وہ بھی کام کرتا رہا۔

مصیبتیں آتی رہیں مگر ان کا ازالہ بھی ہوتا رہا۔ مقام شکر ہے کہ تقریباً دو لاکھ صفحات ڈیجیٹائزڈ کیے جا چکے ہیں۔ ان میں ساٹھ ہزار سے زیادہ صفحات تو صرف انیسویں صدی کے اردو اخبارات کے ہیں۔ اخبارات و رسائل کے دو سو سے زیادہ ٹائٹل ہیں۔ شماروں کی تعداد تو چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی فہرست بھی بنائی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ اسی سال نومبر یا دسمبر تک ایک پروگرام کر کے ساری تفصیلات عام کر دی جائیں گی۔ اس کام میں محنت تو ہوئی ہی ہے، بہت بڑی رقم بھی خرچ ہوئی ہے، جس کے لیے انجمن اسلام کے صدر اور عہدیداران شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

م ا: کچھ اخبارات کے نام بتائیے۔

شمیم طارق: چند اخبارات کے نام یہ ہیں۔ اودھ اخبار (لکھنؤ)، منشور محمدی (بنگلور)، کوہ نور (لاہور)، کشف الحقائق (ممبئی)، معین الہند (اجمیر)، اخبار اسلام (آگرہ)، اخبار نور افشاں (لدھیانہ)، وکٹوریہ پیپر (سیالکوٹ) پیسہ اخبار، شوکت ہند (لکھنؤ) شمس الاخبار (مدراس)، سول اینڈ ملٹری نیوز (لدھیانہ)، چودھویں صدی (راولپنڈی)، بے مثال پنچ (دہلی)، رفیع الاخبار (بنارس)، امبالہ گزٹ (انبالہ)، وکیل ہند (دہلی)، معاون (سندھی) (کراچی)، انڈیا گزٹ اینڈ انڈیا پنچ (بمبئی)، ہمدرد ہند (لاہور)، سفیر (بمبئی)، جسٹس آف پیس (بمبئی)، وکٹوریہ (سیالکوٹ)، اخبار لائل خالصہ گزٹ (سیالکوٹ)، آگرہ پنچ (کوٹے)، تمنائی (لکھنؤ)، ریاض الاخبار (گورکھپور)، عندلیب ہند (بمبئی)، انیس ہند (میرٹھ)، اخبار عالم (لاہور)، اردو اخبار (مرادآباد)، پنجاب سماچار (لاہور)، کپورتھلہ (کپورتھلہ)، پراچین شدھ سنگرھ (بھاؤنگر)، دبدبۂ قیصر (بریلی)، راجپوتانہ گزٹ (اجمیر)، صادق الاخبار (بھاؤنگر)، الحامی (مدراس)، سرحدی اخبار (راولپنڈی)، جریدہ روزگار (مدراس)، خیر خواہ اسلام (بمبئی)، ال پنچ (بانکی پور، کوہاٹ)، سراج الاخبار (جہلم)، سلطان الاخبار (بمبئی)، صدائے ہند، وفادار (لاہور)، ستارۂ ہند (مرادآباد)، افضل اخبار (دہلی)، مشیر دکن (حیدرآباد)، پنجاب آرگن (وزیرآباد، پنجاب)، مقبول عالم (بمبئی)، مہر درخشاں (دہلی)، جنرل گوہر آصفی (کلکتہ)، پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (پٹنہ)، عمدۃ الاخبار (مدراس)، جریدہ روزگار (مدراس)، اخبار دار الخلافہ (فارسی)، بندیل کھنڈ پنچ (جھانسی)، بمبئی پنچ اخبار (بمبئی)، عالم افروز (بمبئی)، دارالسلطنت و اردو گائیڈ (کلکتہ)، دکن گزٹ (حیدرآباد)، ال مسلم (راولپنڈی) وکیل اسلام (بمبئی)، ہمالہ اخبار (راولپنڈی)، اخبار جہاں نما (بمبئی)، ارمغان (بمبئی)، القاہرہ (عربی)، کوکب ناصر (بمبئی)، شوکت الاسلام (بمبئی)، حدیقۃ الاخبار (بمبئی)، اخبار العالم (رائے پور)، انڈین ریفارمر (لکھنؤ)، حبل المتین اخبار (فارسی) (کلکتہ)، اخبار وفادار (لاہور)، جے پور گزٹ (جے پور)، آئینہ (لکھنؤ)، آئینۂ عالم (جھانسی)...... وغیرہ۔ یہ نامکمل فہرست ہے، کہیں کہیں نام میں فرق ہونے کا بھی امکان ہے۔

م ا: آپ کی لائبریری میں جو شمارے دستیاب ہیں، وہ کس سن کے ہیں؟

شمیم طارق: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1898 میں جب یہ لائبریری قائم ہوئی اس وقت جو صاحب تھے انھوں نے پرانے اخبارات و رسائل کو حاصل کر کے محفوظ کرنے کا کام کیا، بعد میں یہ سلسلہ رک گیا۔ لائبریری کا ہال بھی دوسرے کاموں میں استعمال ہونے لگا۔ 2010 میں لائبریری کا احیا ہوا اور 2011 میں، میں نے اس کی ذمے داری سنبھالی تو انکشاف ہوا کہ بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے۔ اگر کسی کو کوئی تصویر اچھی لگی تو وہ اس کو پھاڑ کر لے گیا۔ مضمون اچھا لگا تو اخبار ہی اٹھالے گیا۔ میں نے کوشش کی کہ جو کچھ بچایا جا سکے وہ بچایا جائے۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد جس شکل میں جو کچھ بھی بچایا جا سکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو صحافت کا ملک گیر کردار رہا ہے۔ انیسویں صدی میں اردو اخبارات ہندوستان کے ہر خطے سے نکل رہے تھے۔

م ا: یہاں کتابیں بھی تو ہوں گی......

شمیم طارق: چند اہم کتابیں جو محفوظ کر لی گئی ہیں وہ یہ ہیں: لغات اور فرہنگ میں، ہندوستانی انگلش ڈکشنری، ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن کا لغت، ارمغان دہلی، ہندوستانی مخزن المحاورات، Vocabulary of the Persian Language، لغات القرآن۔ ہندو مذہب کی مقدس کتابوں میں، گیتا گیان، پدماوت بھاکا، رامائن بالمیکی، شیو پران، مہابھارت (فارسی)، تلسی کرت رامائن، جوگ وششٹ، بھگوتی اتہاس، بھنور گیت، شری مد بھاگوت منظوم، شری مد بھاگوت بھاکا، ہنومان چالیسا۔ دواوین اور گلدستوں میں، دیوان خوشحال خاں خٹک، دیوان امام بخش صہبائی وغیرہ۔

م ا: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جتنی بڑی تعداد میں کریمی لائبریری میں ہندو مذہب کی کتابوں کا اردو فارسی ترجمہ موجود ہے وہ کہیں اور نہیں ہے۔

شمیم طارق: دوسری لائبریریوں میں کیا ہے اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے مگر انجمن اسلام کریمی لائبریری میں جو ہے وہ بہت اہم ہے۔ ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں ہندو مذہب کی کتابوں کا جو اثاثہ ہے اور انجمن اسلام نے ان کو جس طرح سنبھالنے کی کوشش کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انجمن اسلام سیکولر ادارہ ہے اور اردو سیکولر زبان ہے۔

م ا: ابھی آپ کی کیا مصروفیات ہیں اور مستقبل میں کیا کرنا چاہیں گے؟

شمیم طارق: تنقید و تحقیق اور تخلیق یعنی شاعری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اس لیے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھوں گا۔

م ا: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے طالب علم یا استاد نہیں رہے ہیں......

شمیم طارق: کیا اردو میں کچھ لکھنے کے لیے اردو کا ڈگری یافتہ ہونا ضروری ہے؟ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ڈگری یافتہ تو ہوں، چاہے دوسرے مضمون میں ہوں۔ شکست خوردہ ذہنیت کے ایک دو لوگوں نے اس قسم کا شوشہ چھوڑا تھا اور اردو کے معتبر اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے ہی ان کو چپ ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اردو کے اساتذہ، طلبا اور قارئین نے میرے ساتھ ہمیشہ محبت کا معاملہ کیا ہے۔ اردو کی ڈگری کی بنیاد پر میں کسی سے ملازمت تو مانگ نہیں رہا ہوں، پھر ڈگری کا سوال کیوں اٹھایا جائے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ڈگری جن کی صلاحیت و استعداد کا ماتم کر رہی ہے وہی ایک دو لوگ اس قسم کا شوشہ چھوڑ رہے ہیں۔

م ا: کیا آپ کو علمی ادبی کارنامہ انجام دینے کا کوئی انعام ملا؟

شمیم طارق: اچھے کام کی توفیق بذات خود انعام ہے۔ وہ مجھے مل چکا ہے۔ اچھے کام کرنے والوں کو آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے وہ آزمائش بھی میرا مقدر بن چکی ہے۔ میں مطمئن ہوں۔

م ا: آپ کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ اور وزارت ثقافت حکومت ہند کی سینئر فیلوشپ مل چکی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو نے آپ کو ٹیگور پر کتاب لکھنے کے لیے مدعو کیا تھا، یہ بھی انعام تھا۔

شمیم طارق: میرے رب کا شکر ہے۔ انعامات و اعزازات کے علاوہ حاسدین کی ریشہ دوانیوں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رب نے کافی نعمتیں عنایت کی ہیں۔

■

Mohd Ansar
Research Assistant
NCPUL, New Delhi - 25

عہد حاضر میں اساتذہ کی تربیت
ضرورت، اہمیت اور تاریخی پس منظر

محمد اطہر حسین

تدریس واکتساب کو ہر دور اور ہر زمانے میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین گہرا رشتہ ہے۔ زمانہ لاکھ ترقی کرے لیکن ایک مدرس کی جو حیثیت کل تھی وہ آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی سماج میں معلم کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے پیشے ہیں ان میں پیشہ تدریس کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ قدیم ہندوستان میں استاد کو خدا کا مقرب تصور کیا جاتا تھا۔ مغربی ممالک میں استاد کو تاریخ ساز، انسان ساز اور قوم کا معمار سمجھا جاتا تھا۔ ہندو مذہب کی کتابوں کے مطابق ''بچہ استاد کے ہاتھوں میں دوسرا جنم پاتا ہے۔'' کوٹھاری کمیشن (1966 - 1964) کی رپورٹ میں یہ بات بجا طور پر کہی گئی ہے ''ہندوستان کی تقدیر اس کے کلاس روم میں بنتی ہے۔''

مذکورہ بالا شواہد سے استاد کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے بھی فرار ممکن نہیں کہ جس پیشے کو جتنی اہمیت اور قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے، اس کی ذمے داریاں بھی اتنی ہی عظیم اور اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔

ایک معلم کے اوپر نہ صرف کمرۂ جماعت میں طلبا کو درس دینے اور معلومات فراہم کرنے کی ذمے داری ہوتی ہے بلکہ روز اول سے ہی اسے مختلف ذمے داریاں انجام دینی پڑتی ہیں۔ معلم کبھی سماج کا مصلح بنتا ہے تو کبھی قائد و رہبر، کبھی منتظم بنتا ہے تو کبھی مشیر، کبھی طلبا میں جوش وولولہ پیدا کرتا ہے تو کبھی ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ الغرض بہ یک وقت اسے گوناگوں خصوصیات کا حامل بننا پڑتا ہے۔

لہٰذا اس بدلتے ہوئے تعلیمی تناظر میں تعلیمی مقاصد کی بہترین حصولیابی کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے اس فرد میں بنیادی تبدیلی لائی جائے جو تدریسی عمل کے اطلاق کے لیے مرکزی حیثیت کا حامل ہے یعنی 'معلم' اس لیے ضروری ہے کہ معلم اپنی قابلیت و معلومات بڑھائے۔

معلم کے لیے تربیت کیوں ضروری ہے؟

اگر استاد کا موازنہ سرمایہ سے کیا جائے تو اساتذہ کی تربیت کو اس بینک سے تعبیر کیا جانا چاہیے جو سرمائے کی صارفیت میں اضافہ کرتا ہے۔ تعلیم کا اولین فرض ہے کہ وہ قومی ترقی کی راہ ہموار کرے۔ ہم اساتذہ کے بغیر تعلیم اور تعلیمی ادارے کا تصور نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ اساتذہ ہی ہیں جنھیں تعلیم اور تعلیمی اداروں کی روح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اساتذہ ہی ملک کی تقدیر بناتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے ملک کی آئندہ نسلوں کو تیار کرتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار حقیقی معنوں میں معیاری تعلیم اور معیاری اساتذہ پر ہوتا ہے۔

دور قدیم میں صرف ایک طریقہ تدریس رائج تھا۔ اس وقت نہ تو طلبا کی زیادہ ضروریات تھیں اور نہ دور حاضر کی طرح وسائل فراہم تھے۔ اس لیے اس وقت اساتذہ کی باضابطہ تربیت کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ لیکن دور حاضر میں ایک استاد کو مختلف حالات اور مختلف

مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جن پر ایک معلم اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ تربیت یافتہ نہ ہو۔ ایک غیر تربیت یافتہ معلم ایسا ہی ہے جیسے ایک غیر تربیت یافتہ ملاح کے ہاتھوں میں پتوار دے دی جائے اور ان سے یہ توقع کی جائے کہ وہ ہمیں ساحل سے ہمکنار کرے گا تو یہ ممکن نہیں۔ لہٰذا جس طرح وہ دریا کے تیز بہاؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ویسے ہی ایک غیر تربیت یافتہ معلم تعلیمی میدان میں در پیش مسائل کو حل نہیں کر سکتا اور بالآخر ملک وملت کے خسارے کا باعث بن سکتا ہے۔

درس و تدریس کے میدان میں سب سے پہلا اور ضروری امر یہ ہے کہ تعلیم کے مقاصد کو سمجھا جائے کیوں کہ کوئی بھی کام انسان بے مقصد نہیں کرتا۔ اسی طرح اسکول میں کوئی مضمون بلا مقصد نہیں پڑھایا جاتا ہے اور مقاصد سے واقف ہوئے بغیر کوئی بھی معلم اپنی تدریس کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

دوسرا ضروری امر ہے کہ طلبا کی نفسیات سے اور ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی مختلف ضروریات سے واقف ہونا۔ طلبا کے اندر محرکہ پیدا کرنا، اکتساب کے لیے آمادہ کرنا، وقتاً فوقتاً ان کو ترغیب دیتے رہنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا، نیز طلبا کی نشوونما کے مراحل، ان کے توارثی اور ماحولیاتی حالات سے آگہی حاصل کرنا، ان تمام چیزوں سے ایک معلم کا واقف ہونا ضروری ہے ورنہ تدریسی عمل ناکام ہو سکتا ہے۔

تیسری چیز جس سے ایک معلم کا واقف ہونا ضروری ہے، وہ سماج اور تعلیم کا رشتہ ہے۔ دیکھنے میں یہ ایک معمولی بات لگتی ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تعلیم ہی انسان کو سماجی شعور سے واقف کراتی ہے اور اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک صالح فرد بن کر معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر سکے اور سماج کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر سکے۔ ایک معلم کو اس سے واقفیت ضروری ہے کہ طلبا کے اندر سماجی نشوونما کس طرح کی جائے۔ افراد خاندان، دوستوں و رشتہ داروں کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے۔ سماج کے ہر طبقے سے مل جل کر ان کا احترام کرتے ہوئے کس طرح زندگی گزارنا ہے، ان تمام باتوں سے طلبا کو واقف کرانا ایک معلم کی ذمے داری ہے۔

ٹیکنالوجی جب سے وجود میں آئی ہے اس نے زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا ہے۔ آج بیشتر تعلیمی اداروں میں جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع مثلاً کمپیوٹر، پروجیکٹر، ٹیلی ویژن، ریڈیو، لیپ ٹاپ وغیرہ کا استعمال کر کے طلبا کو پڑھایا جاتا ہے۔ نیز ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ ایک معلم کے لیے ان تمام ذرائع کے استعمال سے واقفیت ضروری ہے، تا کہ وقت ضرورت ان اشیا کو مؤثر طریقے سے استعمال کر سکے اور طلبا کے اندر دلچسپی پیدا کر سکے اور طلبا کو اس کے متعلق معلومات فراہم کر سکے۔

درس و تدریس کے عمل میں منصوبہ بندی سے واقفیت انتہائی ضروری ہے کیوں کہ جس کام کو منصوبہ بندی کے ساتھ منظم طور پر کیا جائے اس میں ناکامی کے امکانات کم

درس و تدریس میں مہارت کے علاوہ ٹیچر ایجوکیشن کے حوالے سے طلبا کو صحیح رویے اور اقدار کی طرف راغب کرنے سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی بھی تربیتی پروگرام کی کم از کم ضرورت تربیت حاصل کرنے والے کو اس لائق بنانا ہے کہ وہ ایک اچھے استاد کی بنیادی مہارت اور قابلیت حاصل کر سکے جن میں مختلف صلاحیتوں کے مالک طلبا کی کلاس کو منظم رکھنا، نظریات کی منطقی اور واضح ترسیل، بہترین تدریس کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال، کلاس کے باہر حاصل کردہ تعلیمی تجربے کو منظم کرنا اور کمیونٹی کے ساتھ کام کرنے کا طور طریقہ سکھانا اور طالب علموں کو بھی ایسا کرنے میں مدد فراہم کرنا شامل ہے۔

رہتے ہیں۔ ایک معلم کو منصوبہ بندی کے تمام مراحل یعنی سالانہ منصوبہ بندی، اکائی منصوبہ بندی اور سبق کی منصوبہ بندی میں مہارت ہونی چاہیے۔ تا کہ وہ اپنے کام کو منصوبہ بند طریقے اور منظم انداز میں انجام دے سکے۔ مزید برآں ایک معلم کے اندر سبق کی تمہید باندھنے، اس کو مؤثر انداز میں پیش کرنے اور طلبا سے تفہیم و اعادہ کے تحت سوالات کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہونی چاہیے۔

درس و تدریس کے دوران ایک مرحلہ یہ بھی آتا ہے کہ طلبا نے جو اکتساب کیا اس سے طلبا کے اندر کیا تبدیلیاں ہوئیں، انھوں نے جو علوم حاصل کیے وہ کس حد تک ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ ہیں ان کی جانچ یا تعین قدر کرنا۔ تعین قدر میں سوالات کی نوعیت کیا ہوگی، کتنے سوالات ایسے ہوں گے جو وقوفی حلقے سے متعلق ہیں، کتنے سوالات ایسے دیے جائیں جو تاثراتی حلقے سے متعلق ہیں اور کتنے سوالات ایسے ہوں گے جو حرکی یا نفسی علاقے سے متعلق ہوں گے۔ ان تمام اجزا سے ایک معلم کا واقف ہونا ضروری ہے۔

درس و تدریس کے عمل میں طریقۂ تدریس بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر مضمون کی تدریس کے لیے ایک ہی طریقہ کارآمد نہیں ہو سکتا بلکہ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے طریقۂ تدریس کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً زبان کی تدریس کے لیے گرامر ٹرانسلیشن طریقے کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ریاضی، سائنس، تاریخ وغیرہ کی تدریس میں یہ طریقہ بہتر نہیں ہو سکتا ہے اور نہ اس طریقے کے ذریعے طلبا کو سائنس و ریاضی کی جانب راغب کیا جا سکتا ہے۔ ایک معلم کا مضمون کے اعتبار سے مختلف طریقۂ تدریس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ تا کہ وہ مناسب اور موزوں طریقے کا استعمال کر کے طلبا میں مضمون کے تئیں تحریک اور ان کے اندر دلچسپی پیدا کر سکے۔ واضح رہے کہ ایک بہترین معلم وہ ہوتا ہے جو اپنا طریقۂ تدریس خود ایجاد کرتا ہے۔

ایک معلم کے اندر نہ صرف یہ کہ طلبا کو معلومات فراہم کرنے اور انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، بلکہ ان کے اندر انتظامی صلاحیت بھی ہونی چاہیے تا کہ وہ کمرہ جماعت کو بہتر انداز میں منظم کر سکے اور وقت ضرورت اسکول میں ہونے والے مختلف پروگراموں کا بہترین انتظام کر سکے۔ نیز اسکول میں تعلیمی ماحول قائم کر سکے۔

اساتذہ کے تربیتی کورس میں مذکورہ بالا تمام ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے زیر تربیت معلمین کے لیے ایسا نصاب وضع کیا گیا ہے جو ان کو طلبا کی نفسیات، تعلیم کے مقاصد، سماج اور تعلیم کا رشتہ، ترسیلی ٹیکنالوجی کا تعلیم میں استعمال، اسکول کا انتظام و انصرام، تعلیمی منصوبہ بندی، مضامین کے اعتبار سے مختلف طریقۂ تدریس اور امتحانات کے مختلف مراحل و اقسام سے واقف کراتے ہیں۔

مزید برآں ان تمام مہارتوں پر عملی مشق کے لیے مائیکرو ٹیچنگ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس میں زیر تربیت معلمین اپنے اساتذہ کی نگرانی میں مختلف مہارتوں کی مشق کرتے ہیں۔

درس و تدریس میں مہارت کے علاوہ ٹیچر ایجوکیشن کے حوالے سے طلبا کو صحیح رویے اور اقدار کی طرف راغب

کرنے سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی بھی تربیتی پروگرام کی کم از کم ضرورت تربیت حاصل کرنے والے کو اس لائق بنانا ہے کہ وہ ایک اچھے استاد کی بنیادی مہارت اور قابلیت حاصل کر سکے جن میں مختلف صلاحیتوں کے مالک طلبا کی کلاس کو منظم رکھنا، نظریات کی منطقی اور واضح ترسیل، بہترین تدریس کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال، کلاس کے باہر حاصل کردہ تعلیمی تجربے کو منظم کرنا اور کمیونٹی کے ساتھ کام کرنے کا طور طریقہ سکھانا اور طالب علموں کو بھی ایسا کرنے میں مدد فراہم کرنا شامل ہے۔

اساتذہ کی تربیت: مختصر تاریخی پس منظر

ہندوستان میں ٹیچر ایجوکیشن کی کہانی اتنی ہی قدیم ہے جتنی یہاں کی ثقافت۔ اس کی ابتدا شاید وہیں سے ہوتی ہے جہاں آریوں نے چہار سطحی نظام ذات اور انسانی زندگی کے چہار سطحی مقاصد کا تصور دیا ہے۔ یہ عرصہ چار ہزار برسوں یا اس سے بھی زیادہ پر محیط ہے۔ جس میں ہندوستان نے عصری ضرورتوں کے مدنظر مختلف تعلیمی نظام کو اپنایا جس میں قدیم دور، قرون وسطی، بدھسٹ، اسلامی، انگریزی اور مابعد آزادی کا نظام تعلیم شامل ہے۔

الغرض ہمارے ملک میں اساتذہ کی تربیت کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے لیکن بدلتے دور کے تقاضوں کے تحت اساتذہ کے کردار میں بھی تبدیلی آئی۔ ٹیکنالوجی و سائنس کی ترقی نے مختلف علوم وفنون کے دروازے کھولے۔ ٹیکنالوجی نے ترقی کر کے کمرہ جماعت میں رسائی حاصل کر لی۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ضرورت پیش آئی کہ اساتذہ کو منظم انداز میں باضابطہ تربیت دی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اساتذہ کی تربیت کے لیے سب سے پہلا منظم ادارہ "نارمل سپیریئر اسکول (School Superior Normal) کے نام سے 1685 میں پیرس میں قائم کیا گیا۔ بعد میں اس کو پیرس یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا۔ اس اسکول کے قیام کا اصل مقصد School Elementary کے اساتذہ کو تربیت دینا تھا۔ اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں 1834 میں پہلا School Normal قائم کیا گیا۔ جس میں دو سالہ پروگرام کے تحت اساتذہ کو تربیت دی جاتی تھی۔ 1930 کی دہائی میں نارمل اسکول کو ٹیچرس کالج کا نام دیا گیا اور 1950 کی دہائی میں یونیورسٹیوں میں اسے فیکلٹی آف ایجوکیشن یا اسکول آف ایجوکیشن کے نام سے جانا جانے لگا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں اساتذہ کی منظم و باضابطہ تربیت کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اگرچہ اس کا رسمی آغاز بدھ کے تعلیمی دور میں ہو چکا تھا۔ مسلم دور جو کہ دور وسطی بھی کہلاتا ہے، میں مکتب و مدرسہ کا نظام رائج تھا۔ مدارس کے اساتذہ کے لیے اعلی تعلیم یافتہ ہونا و تجربہ کار ہونا ضروری تھا۔ برطانوی دور یا دور جدید میں ہندوستان کے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ ہی تبدیل ہو گیا۔ اس دور میں اساتذہ کی تربیت بالکل مختلف انداز میں ہوا کرتی تھی۔ اس وقت تربیت کا جو طریقہ رائج تھا اس کو (Monitorial System) کہا جاتا تھا۔ (History of Education in India) اس طریقے میں اساتذہ کمرۂ جماعت کے مانیٹر جو عموماً ذہین اور سمجھدار طلبہ ہوا کرتے تھے، سے بچوں کو پڑھوایا کرتے تھے۔ یا اونچی جماعت کے طلبہ نچلی جماعت کے طلبا کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح حصول علم کے ساتھ طلبا کو تدریس کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ انیسویں صدی کے آغاز میں رائج تھا۔ لیکن اس وقت اساتذہ کو فن تعلیم و تدریس کی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔

تربیت معلمین کا دوسرا مرحلہ 1974 - 1882 کے درمیان کا ہے۔ جس میں اساتذہ کی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں انگریزوں نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کو اپنے نظام کے مطابق تبدیل کر دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو تعلیم کے سلسلے میں ایک بنیاد فراہم کی۔ انگریزوں کے ہی دور میں سیرام پور میں اساتذہ کی تربیت کے لیے 1773 میں پہلا نارمل اسکول قائم کیا گیا۔ اس اسکول کا مقصد پرائمری اسکول کے اساتذہ کو تربیت دینا تھا۔

آزادی کے بعد ہندوستان کے تعلیمی میدان میں ایک نیا دور شروع ہوا ثانوی تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن 1952 کا قیام عمل میں آیا۔ اعلی تعلیم کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا 1956 میں قیام عمل میں آیا۔ نیز (1962) CBSE کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اسی طرح 1961 میں قومی کونسل برائے تحقیق و تربیت کا قیام عمل میں آیا اور اسی کی ایک شاخ کے طور پر NCTE یعنی قومی کونسل برائے تعلیم اساتذہ 1973 میں قائم کیا گیا۔ لیکن 1995 میں NCTE کو ایک مکمل ادارے کی حیثیت دی گئی۔

NCTE کا کام ان تمام اداروں کی نگرانی کرنا ہے جو اساتذہ کو تربیت اور تعلیمی مہارتوں سے آراستہ کرتی ہے۔ آج پورے ملک میں تقریباً نو ہزار (9000) ایسے کالج ہیں جو اساتذہ کی تربیت کا کام انجام دیتے ہیں۔ جہاں تک طریقہ کار کا تعلق ہے تربیتی کالجوں کو نئے تجربے اور کوششیں کرنی چاہیے تاکہ ہماری صورت حال، ضروریات اور مسائل کے مطابق طریقہ کار وضع کیے جا سکیں۔ بجائے اس کے کہ دیگر ممالک سے درآمد کی گئی درسی کتابوں کی تکنیک اور طریقہ کار کی تعلیم دی جائے۔

www.studyguideindia.com کے مطابق پورے ملک میں تقریباً 9 ہزار ایسے کالجز ہیں جو اساتذہ کی تربیت کا کام کر رہے ہیں اور ایک اخباری رپورٹ کے مطابق دس لاکھ اساتذہ کو تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا اعداد و شمار سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی کے 70 سالوں بعد ملک میں اساتذہ کی تربیت پر کتنی توجہ دی جاتی ہے اور اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اگر یہ صورت حال یوں ہی برقرار رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک ہندوستان تعلیم کے میدان میں ایک مثال قائم کرے گا۔

■

Dr. Md. Athar Hussain
Assit Prof. (Education)
MANUU, Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)

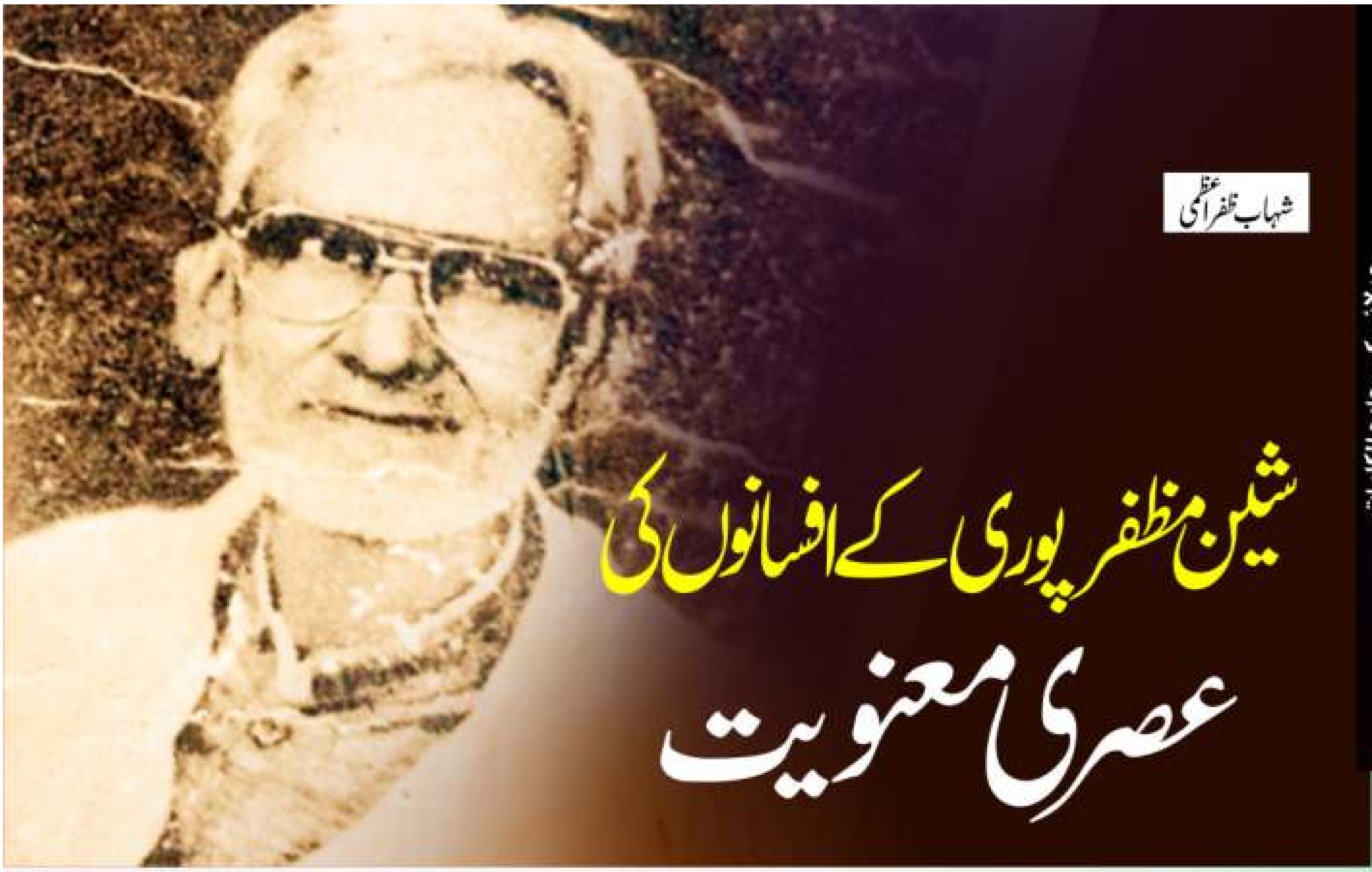

شین مظفر پوری کے افسانوں کی عصری معنویت

شہاب ظفر اعظمی

اب تقریباً متفقہ طور پر ناقدین ادب کی طرف سے یہ اعتراف کر لیا گیا ہے کہ شین مظفر پوری اردو کے ایک اہم، معتبر اور قابل ذکر افسانہ نگار کا نام ہے۔ عبدالمغنی، وہاب اشرفی اور دیگر ہم عصر ناقدین نے ان کے مختلف الجہات کارناموں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان کی تحریروں کے تعین قدر کی کوشش بھی کی ہے۔ اس اعتراف میں تاخیر کی وجوہات بھی شمار کروائی گئی ہیں، جن میں کچھ قصور مصنف کا، کچھ حالات کا اور کچھ عہد کا رہا ہے۔ میرے خیال میں شین مظفر پوری پر ان کی زندگی میں توجہ نہیں دیے جانے کے جو اسباب رہے ان میں درج ذیل اہم ہیں:

1۔ ان کی زود نویسی جس کے سبب انہیں کمرشیل رائٹر سمجھ لیا گیا۔

2۔ اس عہد کا شعر و ادب جدیدیت کے حلقۂ اثر میں رہنے کے باعث ایک خاص قسم کے تخلیقی رویہ سے گزرتا رہا اور شین مظفر پوری جیسے افسانہ نگاروں کے لیے اس حلقے میں کوئی گنجائش نہ تھی۔

3۔ ان کی تخلیقات کی اشاعت ان فلمی اور نیم ادبی رسائل میں زیادہ ہوتی رہی جنھیں ادب کے سر برآوردہ نقاد قابل اعتنا نہیں گردانتے تھے۔

4۔ ان کے ابتدائی افسانوں سے ان پر جنسی اور رومانی افسانہ نگار کا لیبل لگا دیا گیا اور بغیر غور و فکر کیے لوگ اس لیبل کو عرصۂ دراز تک ان کے فن پر چسپاں کرتے رہے۔

مذکورہ چاروں اسباب میں کچھ حد تک صداقت کا حصہ بھی ہے مگر ناقدین نے ان کی شخصیت، ضرورت اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے توجیہات پیش کی ہیں۔ میرے خیال میں کسی فنکار نے اگر 300 کہانیاں، نصف درجن ناول اور نصف درجن دیگر موضوعات پر اپنی کتابیں چھوڑی ہیں تو اس کی ہر تحریر منفرد، نمایاں اور ادب کا سنگ میل نہیں ہو سکتی۔ ادب میں فیصلے مقدار کی بنیاد پر نہیں معیار پر کیے جاتے ہیں۔ شین مظفر پوری کے افسانوں میں اگر ایک معتدبہ حصہ کمزور کہانیوں کا ہے تو ایک بڑا حصہ اچھی اور فنی طور پر کامیاب کہانیوں کا بھی ہے۔ غیر جانبدارانہ تنقید کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ وہ جہاں کمزور افسانوں کا ذکر کر کے مصنف کو معتوب ٹھہرا رہی ہے وہیں اس کے ممتاز اور معیاری افسانوں کی نشاندہی کر کے اس کے تعین قدر کا فریضہ بھی انجام دے۔ کیا پریم چند سے عبدالصمد تک لکھنے والوں کی تمام کہانیاں معیاری اور فنی طور پر منفرد ہیں؟ نہیں۔ اس کے باوجود ان کی ادبی عظمت مسلم ہے۔ اس لیے کہ تعین قدر کا فریضہ مصنف کی اچھی تخلیقات کو ہی سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ شین مظفر پوری کے یہاں بھی ایسی کہانیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں موضوعات کا تنوع، سماجی مسائل کی عکاسی، فنی ہنرمندی اور اسلوب کی سحرکاری بہ آسانی محسوس کی جا سکتی ہے۔

شین مظفر پوری کی کہانیوں کے فنی محاسن یعنی پلاٹ، کردار، اسلوب، نقطۂ نظر اور زبان و بیان پر پروفیسر عبدالمغنی سے آج تک تفصیل سے لکھا جاتا رہا ہے، میں یہاں اُن باتوں کو دہرا کر آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی گفتگو شین مظفر پوری کے افسانوں میں موجود اُن مسائل تک محدود رکھوں گا جو کل بھی سماج میں موجود تھے اور آج بھی سماج ان سے جوجھ رہا ہے۔ بڑے ادب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ہر زمانے کے لیے ہوتا ہے یعنی اس کے افکار و نظریات ہر عہد پر منطبق ہوتے ہیں۔ شین مظفر پوری نے جن مسائل کو اپنی کہانیوں میں برتا ہے ان میں سے زیادہ تر مسائل آج بھی موجود ہیں، اس لیے ان کی عصری معنویت کل کی طرح آج بھی برقرار ہے۔ شین مظفر پوری نے خود کو سماج کا ایک ذمے دار فرد اور نمائندہ مان کر اپنے زمانے کے سماج اور اس سماج کے اہم مسائل کا فنکارانہ تجزیہ اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کرتے وقت وجدانی محرکات کے ساتھ ساتھ شعوری عوامل سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے تقریباً اُن تمام مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع و محور بنایا جو ان کے گرد و پیش پھیلے ہوئے تھے اور حیرت انگیز طور پر ان مسائل میں سے بیشتر آج بھی ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ مثلاً حلالہ، طلاق، عقد بیوگاں، بال ودھوا کے مسائل، جہیز، کثرت ازدواج، طبقاتی تفریق، ذات پات کی تفریق، ملاوٹ، کالا بازاری، چھوا چھوت، قومی یک جہتی کی کمی، فرقہ وارانہ منافرت اور اونچ نیچ کا بھید بھاؤ جیسے مسائل

کل کی طرح آج بھی موجود ہیں، اس لیے ان موضوعات پر شین مظفر پوری کے افسانے آج بھی قاری کو دعوت فکر وعمل دیتے نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر دلت طبقہ اور اس کے مسائل آج بھی سماج کا اہم موضوع ہیں۔ اس طبقے کی ترقی کے لیے آزادی کے بعد سے مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ مگر آج اکیسویں صدی میں بھی دلت نہ صرف سماجی عدم مساوات اور مغائرت ومنافرت کا شکار ہیں بلکہ خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ شین مظفر پوری نے اپنے افسانے ''کسی سے کہنا نہیں'' میں اس طبقے کے ساتھ اعلیٰ طبقات کے رویے کو بڑی فنکاری سے پیش کیا تھا۔ ایک اسٹیمر کے مسافروں میں اونچی ذات کے لوگوں کے علاوہ دُسادھ یعنی دلت طبقے کی ایک عورت بھی ہے۔ برہمن ذات اور دُسادھ ذات کی عورت اپنے شیر خوار بچوں کو لے کر عرشے پر سوئی ہوئی ہیں۔ برہمن بچہ نیند میں کروٹ لیتے ہوئے دُسادھن کے پاس پہنچ کر اس کی کھلی ہوئی چھاتیوں سے چمٹ کر دودھ پینے لگتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار کا یہ جملہ کہ

''شاید ساری دنیاؤں کی ماؤں کے دودھ کا مزہ ایک ہی ہوتا ہے اور اس کا رنگ تو ایک ہی ہوتا ہے''

ماں کی عظمت کی گواہی دیتا ہے۔ برہمن مرد کی نظر جیسے ہی بچے پر پڑتی ہے وہ فوراً اپنی بیوی کو جگا کر صورت حال بتاتا ہے۔ وہ لپک کر دسادھن کی چھاتی سے بچے کو جیسے نوچ لیتی ہے۔ دسادھن بھی اپنے بچے کو گود میں لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ اسٹیمر کنارے پر لگنے والا ہوتا ہے۔ اسی وقت برہمن عورت دس روپے کا نوٹ دسادھن کی چولی میں چپکے سے سرکا دیتی ہے اور بنتی کرتی ہے کہ وہ اس واقعہ کو کسی سے نہ بتائے۔ یہی کام برہمن اسٹیمر سے اتر کر کرتا ہے اور دسادھن کو پانچ کا نوٹ پکڑا دیتا ہے۔ تب وہ میلی کچیلی، ناکافی کپڑوں والی دسادھن عورت اپنی اہانت محسوس کرتی ہے اور دونوں نوٹوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے گنگا کی شانت اور مقدس لہروں کے سپرد کردیتی ہے۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر گنگا کی ریت میں جذب ہوجاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج اکیسویں صدی میں بھی دسادھن کی آنکھوں کے وہ آنسو خشک ہوئے ہیں؟ نہیں آج بھی سماج میں دسادھن کی وہی حیثیت ہے۔ اس لیے یہ افسانہ اکیسویں صدی کے موجودہ سماج کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی ایک سچائی یہ بھی ہے کہ ہندوؤں ہی نہیں مسلمانوں میں بھی ذات پات کی تفریق موجود ہے۔ اسلام نے اگرچہ اپنی جانب سے کسی تفریق کی تعلیم نہیں دی مگر زمینی حقیقت یہی ہے کہ ہندستانی معاشرے میں اشرافیہ اور نچلے طبقے کے درمیان خلیج ہے اور اس کا اظہار بالخصوص شادی بیاہ کے مواقع پر ہوتا ہے جب ہڈی سے ہڈی ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شین مظفر پوری زمینی سچائیوں سے باخبر تھے اس لیے جہاں دلت استحصال پر انھوں نے اپنا احتجاج درج کیا وہیں مسلمانوں میں موجود اس برائی کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے۔ افسانہ 'عذاب' ملاحظہ کیجیے جو ہڈی سے ہڈی ملانے کے انتظار میں بیٹیوں کی شادی کی عمر گزار دینے کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس میں داروغہ نوشیرواں خاں عرف نوشیر خاں، اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی نازی کی شادی کو صرف خاندانی لڑکا نہ ملنے کی وجہ سے ٹالتے رہتے ہیں۔ مصاحبین نے متعدد رشتے بتائے مگر سب جگہ کوئی نہ کوئی کھوٹ ملتی گئی۔ ایک مصاحب نے پروفیسر امجد حسین کے لڑکے کی تعریف کی اور بات بڑھانے کی اجازت مانگی تو داروغہ نوشیر خاں نے مسکرا کر کہا

''اس پر تو غور کیا جاسکتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہاں گودا ہی گودا ہے، ہڈی قلمی ہے۔

قلمی کیا ہوتی ہے؟ مصاحب نے حیرت سے پوچھا۔

میرا مطلب ہے کہ ہڈی پیوندی ہے... بھئی آپ جانتے ہیں کہ شیر کتنا ہی بھوکا ہو مگر وہ گھاس نہیں کھا سکتا۔ اور بے چارے مصاحب، خاں صاحب کا منہ تاکتے رہ گئے۔''

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وقت گزرتا چلا جاتا ہے اور نازی کی ارمان اور امنگوں بھری جوانی کی راتیں کاٹے نہیں کٹتیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ گھر کا خاندانی نوکر بھیکو

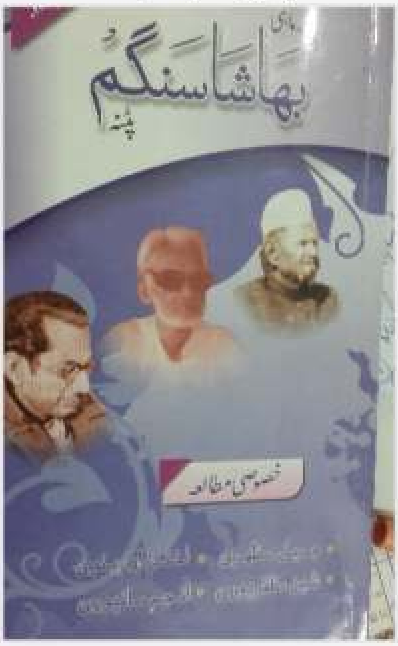

موقع کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ بات تب کھلتی ہے جب نوشیر خاں کو ایک خاندانی لڑکا مل جاتا ہے اور وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ گھر داماد بن کر رہے گا۔ جس دن یہ بات طے پاتی ہے، اسی رات فجر کے وقت نازی کی ماں نے نازی کو کچھ عجیب حالت میں دیکھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا اور کریدنے پر پتہ چلتا ہے کہ نازی حاملہ ہے۔ اس کا سبب بھیکو ہے جو پہلے ہی غائب ہوچکا ہے۔ نازی کی ماں نے بہت چاہا کہ یہ خبر نوشیر خاں تک نہیں پہنچے لیکن فجر کی نماز کو وضو کے لیے کمرے سے نکلے نوشیر خاں تک بات پہنچ جاتی ہے اور ان کی حرکتِ قلب بند ہوجاتی ہے۔ افسانہ نگار کے لفظوں میں:

''داروغہ نوشیر خاں پر عذاب کا آخری لمحہ بھی گزر چکا تھا''

کیا یہ افسانہ آج بھی ہمارے سماج کا المیہ بیان نہیں کررہا ہے؟

ملاوٹ اور کالابازاری بھی آج کا ایک بڑا مسئلہ ہے جس پر ہم حکومت کے ذریعہ اکثر وبیشتر مثبت اقدام کی بات سنتے رہتے ہیں۔ مگر اناج سے دوا تک ہر چیز میں نقلی اور ملاوٹی اشیا پائی جاتی رہتی ہیں۔ شین مظفر پوری نے سماج کے اس سلگتے مسئلے کو بھی اپنے افسانہ 'ثبوت' کا موضوع بنایا ہے۔ ملک میں غذائی قلت سے پیدا ہونے والے بحران کے زمانے میں لالہ مرلی دھرن ایک طرف تو حکومت کا ہاتھ بٹاتے اور عوام کی ہمدردی بٹورتے نظر آتے ہیں لیکن پہلے وہ گیہوں میں باجرا پیسا کرتے تھے اب تو چونا، اینٹ اور مٹی پینے لگتے ہیں۔ ان کا بیٹا مہندر بھی باپ کے راستے پر چل کر دوا کے کاروبار میں ملاوٹ کے دھندے سے دولت کا انبار لگا دیتا ہے۔ لیکن اسی ملاوٹی کاروبار کے منفی اثرات سے ان کے بیٹے مہندر اور روپا کی موت ہوجاتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی موت زہریلی غذا اور نقلی دوا سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کا کوئی پختہ ثبوت نہیں مل پاتا کہ جس تقریب میں یہ دونوں شریک ہوئے تھے اور پوریاں کھائی تھیں، اس کے لیے مرلی دھرن فلاور ملز نے ہی آٹا سپلائی کیا تھا۔ یہاں 'جیسی کرنی ویسی بھرنی' کا مقولہ درست ثابت ہوتا ہے اور ہمارے سماجی نظام کو کمزور کرنے والے ایک اہم مسئلے کی طرف قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔

آج ہمارے سماج کا ایک بڑا مسئلہ مذہبی منافرت اور قومی یک جہتی کا کمزور ہوتا تصور بھی ہے۔ سیاست اور اس کی ریشہ دوانیوں نے انسانوں کے ذہن میں زہر بھرنا شروع کردیا ہے۔ شین مظفر پوری کا افسانہ 'ودیا نگر کی مسجد' قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور

انسان دوستی کے تصور پر نہایت اثر انگیز افسانہ ہے۔ یہ مسجد نچلے طبقے کے مزدور پیشہ اور مفلوک الحال باشندوں کے علاقے میں واقع ہے۔ مسجد خس پوش ہے اور خستہ حال بھی۔ ایک بوڑھے میاں جی اس مسجد کے موذن بھی ہیں، امام بھی اور نمازی بھی۔ یہاں بابو رام کنور جیسا سچا ہیرا بھی چمکتا ہے جسے مذہبی رواداری میں اپنی مثال آپ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ خود ایک مندر کی تعمیر چندے سے کررہے ہیں لیکن مسجد کے اخراجات کی ذمہ داری اپنے سر لیے ہوئے ہیں۔ مسجد میں جلنے والی لالٹین کے لیے تیل بھی انھیں کے گھر سے آتا ہے۔ اور فجر کی اذان پر نہ صرف وہ بیدار ہوتے ہیں بلکہ خالق باری کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک خوشحال مسلمان مبارک علی ہیں جنھیں اپنے مذہب سے چڑ ہے۔ وہ غیر مسلم دوستوں اور شناساؤں کے درمیان نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے تئیں توہین آمیز کلمات کے استعمال سے نہیں جھجکتے، بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے عام رویے سے موذن، امام اور نمازی میاں جی کس قدر نامطمئن اور بیزار ہیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب قریب المرگ میاں جی رام کنور کو ہی مسجد کی ذمہ داری اور نگرانی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ میاں جی بابو رام کنور سے کہتے ہیں کہ یہ کام کسی اچھے آدمی کو سونپ کر مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کردیجیے۔ چنانچہ بابو رام کنور کہتے ہیں آپ ہی بتا دیجیے وہ اچھا آدمی کون ہے؟ تو میاں جی کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے 'بابو رام کنور'۔ مذہبی رواداری اور باہمی محبت کا یہ منظر نامہ آج ہمارے درمیان سے تیزی سے غائب ہورہا ہے۔ شین مظفر پوری کی کہانی ہم سے اس منظر نامے کو باقی رکھنے کا تقاضا کررہی ہے۔ دراصل ہندستانی عوام نے آزادی سے قبل جو خواب دیکھے تھے آزادی کے بعد اس کی تعبیریں حسرتناک اور اندوہ آگیں برآمد ہوئیں۔ بقول فیض

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

عوام کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ ان کی تعبیر بہت بھیانک نکلی۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج بھی سماجی تفریق قائم ہے۔ آج بھی امیر امیر اور غریب، غریب۔ ان دونوں کے درمیان خلیج حائل ہے۔ مہاجنوں کے ہاتھوں آج بھی مزدوروں کا خون ہورہا ہے، ہندو مسلم دنگے ہورہے ہیں، چور بازاری ہورہی ہے اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ ذخیرہ اندوزی کا دھندہ زوروں پر ہے۔ خواب اور حقیقت کے تصادم کا جو ردعمل سامنے آیا وہ شین مظفر پوری کے

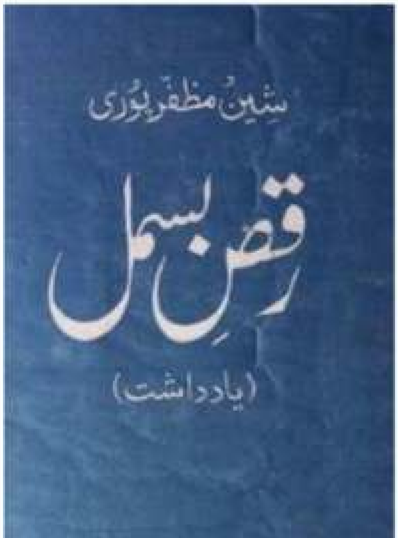

افسانہ 'کڑوے گھونٹ' کے اس اقتباس میں دیکھیے:

''اور آج پورے ڈیڑھ سال کے بعد میں اپنے گاؤں واپس آیا ہوں۔ میں ایک سال تک آگ اور خون کی ندی میں تیرتا رہا ہوں۔ پہلے ملک غلام تھا، اب آزاد ہوگیا ہے۔ پہلے گیت اور قہقہوں کا اجارہ انگریز کے پاس تھا اب وہ ٹھیکہ بڑے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ انھوں نے تمام گیت اور قہقہوں کو اپنے محلوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اب تو ہر طرف موت کے راگ سنائی دیتے ہیں۔ جب ملک کے اونچے ایوانوں پر آزادی کا پرچم لہرایا گیا تھا، اس وقت بھی گیت اور قہقہے ناپید ہوگئے تھے۔ چیخیں اور کراہیں فضا میں تیرتی پھرتی رہی تھیں۔ فرنگی جادوگر نے نہ جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا دانت کاٹی روٹی کھانے والے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔''

اس اقتباس میں آپ شین مظفر پوری کی حقیقت نگاری اور تجربات کی سچائی کی داد دے سکتے ہیں۔ انھوں نے جن تلخ حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے وہ آج بھی متوسط طبقہ کی زندگی کی محرومیوں، الجھنوں اور نفرت آمیز معاشرہ میں زندگی بسر کرنے کی تکلیفوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ شین مظفر پوری کے افسانے مختلف زندہ موضوعات پر بکھرے پڑے ہیں۔ ان موضوعات کا تنوع دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اپنے سماج، اپنے عہد اور اس عہد کے مسائل پر ان کی نہایت گہری نظر تھی۔ شاید ہی کوئی سماجی مسئلہ ہو جو ان کی نظروں سے اوجھل رہا ہو۔ شادی کے لیے تصویر دیکھ کر لڑکوں کو پسند ناپسند کرنے کا مسئلہ ہو یا ذات پات اور اونچ نیچ کے بھید بھاؤ کا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مسئلہ ہو یا فرقہ وارانہ فساد کا۔ چھوا چھوت کا مسئلہ ہو یا بے جوڑ شادی کا، انہوں نے معاشرے کے تمام زندہ مسائل کو اپنی فکر کا حصہ بنایا اور اس پر خوبصورت کہانیاں تخلیق کیں۔ جہیز کے مسئلہ پر افسانہ 'جہیز'، کثرت ازدواج سے متعلق کہانی 'سیکنڈ ہینڈ وائف' اور 'نئی الف لیلہ'، کثرت اولاد سے پیدا ہونے والے معاشی بحران پر 'بھگوان کی اِچھا'، اونچی سوسائٹی کی کمزوریوں پر 'لاشوں کا ہنی مون' اور اخلاقی بانجھپن و جنسی عیاشی پر 'اچھی بیٹی اور برا آدمی' جیسے افسانوں میں ہمارا معاشرہ اور اس کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے تقریباً ان تمام مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو آج بھی ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں اور سنجیدہ شہری کو اس کی ذمے داریوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ شین مظفر پوری نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

''میں اس بات کا قائل ہوں کہ انسان انفرادی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسانی زندگی کے لیے سماج لازمی چیز ہے۔ سماج کے تصور کے بغیر انسانی زندگی کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے انسان صرف اپنے بارے میں سوچ کر یا اپنے ذاتی مسائل کو اپنے فن اور اپنی تخلیق کا محور بنا کر اپنے فرائض کو پورا نہیں کرسکتا۔''

(زبان و ادب، پٹنہ نومبر، دسمبر 1996، ص 53)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شین مظفر پوری کو بحیثیت ادیب سماج کے تئیں اپنی ذمے داریوں کا پورا پورا احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے سماج کے اُن مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا جن سے اُس عہد کا متوسط طبقہ دوچار تھا۔

بہترین ادب وہی ہوتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو۔ شین مظفر پوری کے افسانے اس لحاظ سے بڑے افسانے کہے جاسکتے ہیں کہ وہ عہد جس سے شین متصادم تھے اس کی ستم کوشیاں اب بھی جاری ہیں اور ان میں پیش کردہ مسائل سے آج بھی ہمارا معاشرہ دوچار ہے۔ شین مظفر پوری کی کہانیاں اُس عہد کے ساتھ ساتھ ہمارے آج کے مسائل کی بھرپور نمائندگی کررہی ہیں۔ یعنی ان کی کہانیوں کی ہم عصر معنویت انہیں زندہ کہانیاں بنا رہی ہے۔ اس لیے یہ کہانیاں جب تک زندہ رہیں گی شین مظفر پوری کو بھلا کون مار سکتا ہے؟

■

Dr.Shahab Zafar Azmi
Department of Urdu, Patna University
Patna- 800005 (Bihar)
Mob.:9431152912
shahabzafar.azmi@gmail.com

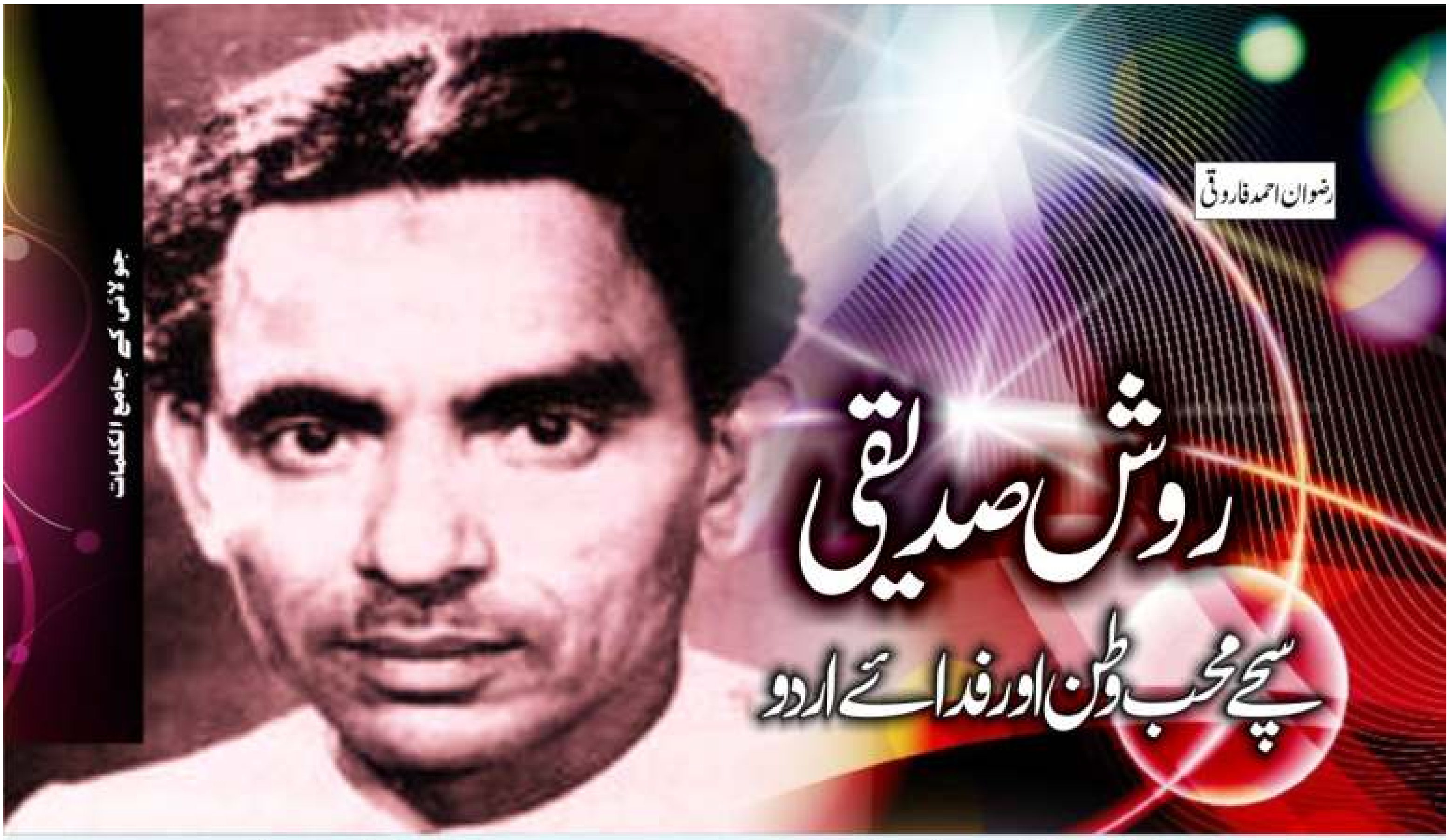

رضوان احمد فاروقی

روشن صدیقی

سچے محب وطن اور فدائے اردو

ہمیں اُن فنکاروں کی خصوصی قدر کرنی چاہیے جنھوں نے نامساعدت کے باوجود وطن عزیز سے ہجرت کی نہ ہی خوشگوار مستقبل کی تلاش میں ترقی یافتہ ممالک کو وطن ثانی بنایا بلکہ ہر حال میں ہندوستان میں رہے۔ یہیں وجود پایا اور یہیں کی خاک میں مل گئے۔ ایسے ناموں میں روشن صدیقی کا نام سرفہرست ہے جو جوش و نیاز کی طرح پاکستان نہیں گئے۔

روشن صدیقی نثر و نظم میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ فرنگی محل سے انھیں روحانی تعلق تھا۔ آپ کے والد گرامی سلسلہ قادریہ رزاقیہ میں شمس العلما مولانا عبدالحمید (مرحوم) کے مرید تھے۔ روشن فطری طور پر شاعر تھے۔ 7 برس کی عمر کھیل کود کی ہوتی ہے مگر روشن نے اس کچی عمر میں شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ والد مولوی طفیل احمد شاہد فارسی کے عالم اور اچھے شاعر تھے۔ روشن کا وطن مولود جوالا پور ضلع سہارنپور (یوپی) ہے۔ جو اپنے مناظر قدرت اور مشہور دانش گاہ گوروکل (کانگڑی) کے لیے خاصا معروف ہے۔ روشن صدیقی کو اس دانش گاہ سے خصوصی قرب اور لگاؤ رہا۔ شاید یہی سبب ہے کہ انھیں ہندی میں مہارت کے ساتھ سنسکرت سے دلچسپی رہی۔

روشن صدیقی نے شروع میں غزلیں کہیں 1916 سے 1924 تک وہ ایک طرح سے غزل کے شاعر رہے مگر پھر رجحان بدلا۔ نظم 'انتظار' کی تخلیق کے بعد انھوں نے مسلسل نظمیں کہیں اور خوب کہیں۔ پھر ان نظموں کی ایسی دھوم مچی کہ 1935 تک ان سے ہر مشاعرہ میں ہر جگہ نظموں کی فرمائش ہوتی رہی۔

مشہور ادیب علی جواد زیدی تحریر فرماتے ہیں: روشن کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا پرجوش اور والہانہ تھا۔ انقلابی نظمیں پڑھتے وقت وہ مٹھی باندھ کر داہنا ہاتھ باغیانہ انداز سے بار بار بلند کرتے تھے۔ آخری عمر میں بغاوت پر قلندری غالب آنے لگی تھی لیکن ہاتھ اب بھی فضا میں بار بار بلند ہوتا تھا۔ طرز خواندگی میں قدیم طرز کا ہلکا ترنم بھی ملا ہوتا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ رومان سے انقلاب تک تمام مراحل طے کر لیا کرتے تھے۔ خلوص، تپاک، حفظ مراتب، آداب مجلس کا خیال۔ یہ سب ان کی طرحداری اور وضعداری کے سنگ میل تھے۔

انور صدیقی بڑے پتے کی بات لکھتے ہیں: ارتقائی اعتبار سے ان کی شاعری تین ادبی اثرات کے دور میں پروان چڑھی۔ ان کی شاعری کی ابتدا، ایسے دور میں ہوئی جب کہ حفیظ، اختر اور ساغر کے رومانی گیت فضا میں گونج رہے تھے اور اقبال کی شاعری عام ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس رومانیت کے خلاف ردعمل کے طور پر ترقی پسند شاعری نے اپنا پرچم بلند کیا۔ ان کی شاعری کے آخری دور میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری نے تین ادبی نسلوں کے درمیان اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ پہلے دور یا پہلی ادبی نسل کے اثرات نے ان کے تشکیل پذیر ذہن پر کئی گہرے نقوش ثبت کیے۔ ترقی پسندی نے ان کے لہجے کو تھوڑا متاثر کیا اور ان کے موضوعات شعری میں اضافہ ہوا۔ جدیدیت ان کے لیے ادبی نزاع سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ اپنے شعری اسالیب اور لہجے کی حد تک وہ ادبی اثرات ضرور قبول کرتے رہے مگر بنیادی طور پر ان کا انداز فکر یا ان کی حیثیت رومانی رہی۔

راقم الحروف کی رائے میں المیہ یہ بھی رہا کہ ترقی پسندوں نے انھیں صرف رومانی شاعر تصور کر کے نظر انداز کیا اور رومانی شاعری کو سر پہ اٹھائے ہوئے لوگوں نے ان کی فکری وسعت اور انقلابی انداز کے سبب انھیں کم رومانی سمجھا۔ لہٰذا دونوں طبقات ان کی شاعری کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ روشن کے متعلق عام خیال ہے کہ ان کی شاعری میں تضاد نہ تھا۔ جب نیاز اور جوش جیسے ادیب و شاعر محض خوشحالی اور ترقیات کی خواہش میں پاکستان چلے گئے تب بھی روشن اپنی روش پر قائم رہے اور وطن عزیز کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ان کی رومانی شاعری میں بھی بعض فنکاروں کو طہارت فکر اور تصوف کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

مفتی رضا انصاری فرنگی محلی لکھتے ہیں: روشن ہندی اور سنسکرت اچھی جانتے تھے۔ وہ بھی اس زمانے میں جبکہ مسلمانوں میں ہندی اور سنسکرت جاننے والے ایک آدھ بمشکل نظر آتے تھے۔ وہ ہندی رسائل اور ہفتہ وار اخبار بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ وہ غزل گو شاعر سمجھے جاتے تھے مگر انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، جن میں مذہبی رنگ

نمایاں ہے۔ وہ تہجد گزار شاعر تھے۔ نعتیہ مشاعروں میں بھی انھوں نے اچھی اور معیاری نظمیں پڑھیں اور مدح صحابہؓ کے مشاعروں میں بھی! لکھنؤ کے نعتیہ مشاعرے میں جو نظم پڑھی تھی اس میں حضرت علیؓ کی شان میں ان کا مصرعہ تھا۔

روشن حیدر پہ چمکے وہ علم کس کے تھے

روش مطالعہ کے شوقین تھے۔ ادبی کتب کے علاوہ تصوف سے خاص لگا تھا۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ماضی کی یادوں کو کریدتے ہیں، دریچوں میں جھانکتے ہیں تو پردۂ سیمیں پر ابھرنے والے نقوش کی طرح پورا منظر نامہ ان کے سامنے آجاتا ہے اور وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔ تقریباً دو دہائی تک مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ ہم کب، کیسے، کہاں اور کن حالات میں ایک دوسرے سے ملے۔ اس کو تسلسل سے بیان کرنا اس عمر میں کار دشوار ہے مگر اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ قصباتی مشاعروں سے لے کر دہلی کے شنکر وشاد، انڈو- پاک مشاعروں تک ہندوستان کے طول وعرض میں صدہا بار ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خلوت وجلوت میں ساتھ رہا۔ اولیائے کرام کے مزارات پر ساتھ ساتھ حاضری دی۔ مشاعروں کے اسفار میں ہمسفر رہا۔ مگر زندگی کا کوئی غیر محتاط لمحہ بھی ایسا نہ رہا کہ جب روش صاحب کے مزاج کی مشرقیت الگ ہوئی ہو... یہ ممکن ہے کہ ان سے بہتر شعر کہنے والے پیدا ہو جائیں مگر دور حاضر کے ہاتھوں میں ''آب حیات'' کا وہ جام نہیں ہے جو اُن پرانے بادہ کشوں کی تہذیبی روایات کو بقائے دوام عطا کر سکے...

مجموعی طور پر روش کی نظموں اور غزلوں پر فکر وفن، جنون وہوش اور دل ودماغ کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے مگر یہ چاندنی نہ تو مارچ اور اپریل کی صاف وشفاف چاندنی ہے نہ ہی جولائی اور اگست کی بھیگی ہوئی چاندنی، بلکہ دسمبر اور جنوری کی کہر آلود چاندنی ہے۔ جس میں تخیل کے خدوخال بظاہر تو دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں مگر ذرا سے تامل اور تفکر کے بعد ان کے نقوش اجاگر ہوجاتے ہیں۔ اس لیے وہ حضرات جو غور وفکر کے عادی نہیں وہ پہلی نظر میں روش کے اکتسابات پر ابہام کا الزام لگاتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے عروس معنی کو الفاظ کا جو پیرہن عطا کیا ہے وہ نا کلان کا نہیں ہے۔ جس سے جسم کے دل آویز خطوط از خود واضح ہو جائیں بلکہ وہ سلما اور ستاروں سے سجا ہوا ململ کا وہ ڈوپٹہ ہے، جس کے اندر چھپا ہوا حسین چہرہ اسی وقت نظر آ سکتا ہے جب کہ اس پر گہری نگاہ ڈالی جائے اور غور وخوض کو لازم جانا جائے۔

دراصل روش صدیقی کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ان کا تغزل اور روانی ہے۔ ان کا طرز بیان خاص اور دلکش ہے۔ ایک رومانی نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرت دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانی احساس جھکی جاتی ہے
حیرت عالم امکاں کو خبر ہے شاید

ڈاکٹر عبدالوحید مذکورہ بالا بند سے متعلق تحریر فرماتے ہیں: اس ایک بند سے ہی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے رنگ سخن میں تغزل کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں کم ہی لوگوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اسلوب میں بلا کی دل نشینی ہے اور دل نشینی میں نرم، لطیف اور مترنم الفاظ وتشبیہات کی موجودگی اور بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ رنگ تغزل ملاحظہ ہو

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
ہائے اس بے خودی کو کیا کہیے
ہے وہی رنگ حسن بے پروا
عشق کی سادگی کو کیا کہیے
کھینچ لے جائیں جو ترے در تک
ایسی دیوانگی کو کیا کہیے
ان پہ قربان ہستی کونین
ایک میری نظر کو کیا کہیے

1956 میں روش کا مجموعۂ غزلیات 'محراب غزل' کے نام سے شائع ہوگیا تھا جبکہ بقول ''مالک رام ان کے پاس کئی جلدوں کا کلام تھا''..... کاش وہ کلام بھی ان کی حیات میں شائع ہوجاتا۔ حیف کہ یہ کام بھی بعد والوں نے نہ کیا۔ صرف ان کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے 176 صفحات کا 'روش نمبر' نکالا۔ یہی نمبر روش کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں بعد والوں کے لیے معاون ہے۔ اس اہم نمبر کے مرتب عبداللطیف اعظمی ہیں۔

روش صدیقی کا اصل نام شاہد عزیز تھا۔ ان کی تاریخ ولادت 10 جولائی 1909 ہے اور وفات 23 جنوری 1971 کی وہ شب تاریک کہ جس شب شاہجہاں پور کے ایک مشاعرے کے دوران شدید قلبی دورہ میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ پلک جھپکتے ہی دنیا ایک سچے محب وطن اور فدائے اردو سے محروم ہوگئی.. مضمون کا اختتام اُن غزلوں پر جنہیں پڑھتے پڑھتے مشاعروں کا ہر دل عزیز شاعر دنیا سے رخصت ہوا

زندگی کو ہوس زلف صنم ہے تو سہی
فرصت عمر ابد بھی مجھے کم ہے تو سہی
کہیں آگے نہ گئے تیرے خرابات نشیں
یوں تو اک سلسلۂ دیر و حرم ہے تو سہی
معنی شمع حرم کچھ بھی ہوں واعظ لیکن
صورت شعلۂ رخسار صنم ہے تو سہی
کون مجبور نظر ہے یہ کھلے یا نہ کھلے
مری آنکھوں میں ترا نقش قدم ہے تو سہی
ترے کوچے میں یہ اک گوشۂ ارباب جنوں
حاصل مدرسۂ لوح وقلم ہے تو سہی
یہ جو طوفان حوادث میں بھی شاداں ہے روش
کچھ اشارہ ترا اے چشم کرم ہے تو سہی

(2)

بو الہوس! تجھ کو کون سمجھائے
زندگی درد ناتمامی ہے
ہم ملامت زدہ کہاں جائیں
شہر میں دور نیک نامی ہے
جلوۂ رہ گزر نگاہ طلب
زندگی محو تیز گامی ہے
آج ملبوس کج کلاہی میں
آبرو باختہ غلامی ہے
کاش تجھ کو ملے نگاہ بلند
کیوں اسیر بلند بامی ہے
اے روش کون اس صنم سے کہے
خلق مشتاق ہم کلامی ہے

■

Rizwan Ahmad Farooqui
Danish Mahal, Aminabad
Lucknow - 226018 (UP)

پریم چند کے افسانوں میں قومی یکجہتی

امتیاز احمد خواجہ

پریم چند اردو افسانے کی دنیا میں ایک ایسے مقام کے مالک ہیں کہ جن کے بغیر اردو افسانے کی روایت سے واقفیت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ نہ صرف اردو افسانہ کے بانیوں میں ہیں بلکہ انھوں نے اردو افسانے کو ایک ایسے مقام تک پہنچایا جو ادبی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے کمال فن کا اصل راز یہی تھا کہ انھوں نے اپنے عہد کی روح، اپنی قوم کے دھڑکتے ہوئے دل، ہندوستانی عوام کی آرزوؤں اور ان کے ایثار و عمل کو تخلیقی حسن کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمولیا۔ پریم چند سے پہلے مغربی افسانوں کے کچھ تراجم شائع ہوئے تھے اور کچھ طبع زاد افسانے جیسے نصیر اور خدیجہ، بدنصیب کا لال (راشد الخیری)، نابینا بیوی (سلطان حیدر جوش) احمد (سجاد حیدر یلدرم) وغیرہ لکھے گئے تھے لیکن جس ادیب نے سنجیدگی کے ساتھ اس صنف کو اپنے خیالات اور تخلیقی صلاحیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے رواج دیا وہ پریم چند ہی ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب افسانے پر تخیلی رجحان زیادہ قوی تھا۔ چنانچہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں حقیقت نگاری کی بہ نسبت تخیل آفرینی کے رجحان نے زیادہ شدت اختیار کرلی تھی۔ یہ سب افسانہ نگار ایک تخیلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور محبت کے افلاطونی نظریے کی عکاسی اور غیر ارضی تصور کی نقاب کشائی میں مبتلا تھے۔ اس کے برعکس پریم چند نے ارضی پہلوؤں اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں پہلی بار کردار نگاری کے حقیقی نقوش ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں میں آپسی رقابتیں شروع ہوچکی تھیں۔ مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا، بنگال کو مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں تقسیم کیا جاچکا تھا۔ یعنی ضرورت اس بات کی تھی کہ ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک کیا جائے اور آزادی کے نعرے اکٹھے بلند کیے جائیں۔ پریم چند کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ قوم کو یکجا اور مضبوط کرنے کے لیے رومانی اور عشقیہ کہانیوں کے بجائے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے کہ جن سے جوش وجذبے اور ولولے کے ساتھ ساتھ آپس میں محبت اور بھائی چارہ پیدا ہوجائے اور ہندو مسلم متحد ہوکر ملک کے جبری قبضہ اور ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے، مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔'' (بحوالہ اردو افسانے کی روایت ص 51)

پریم چند اگرچہ ابتدا میں خالص رومانیت کی طرف مائل تھے لیکن قوم وملت اور وطن کی محبت نے انھیں اس رجحان سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کیا اور انھوں نے ایسے افسانوں کی شروعات کی جن میں قوم وملت کی یکجہتی، آپسی بھائی چارے اور محبت کے ساتھ ساتھ اپنے وطن پر جان قربان کرنے کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور نتیجتاً 1908 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہوا۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے آزادی وطن کی قدر و قیمت بتا کر ہندوستانی عوام کو مذکورہ جذبے کی جانب راغب کیا ہے۔ افسانے کا ہیرو دل فگار ہیروئن ملکہ دلفریب سے بے پناہ عشق کرتا ہے اور اسے شادی کا پیغام پہنچاتا ہے۔ ملکہ یہ شرط رکھتی ہے کہ پہلے وہ اسے دنیا کا سب سے انمول رتن لاکر دے۔ دل فگار انمول رتن کی تلاش میں نکلتا ہے اور چھان بین کرکے 'آنکھ سے ٹپکے ہوئے محبت کے آنسو، اور پھرستی کی راکھ لاکر دیتا ہے جو نامنظور کیے جاتے ہیں۔ آخر میں وہ ہندوستان کے ایک میدان جنگ سے ایک دم توڑتے ہوئے سپاہی کے خون کا آخری قطرہ ہیروئن کی خدمت میں نذر کرتا ہے جسے وہ سب سے انمول رتن کے طور پر قبول کرتی ہے۔ 'سوز وطن' کے دیگر افسانے 'شیخ مخمور'، 'یہی میرا وطن ہے'، 'عشق دنیا اور حب وطن' بھی حب وطن کے درس اور جذبے پر لکھے گئے ہیں۔ پریم چند جانتے تھے کہ یہی وہ موضوع ہے جو ہندوستان کے لوگوں میں آپسی رقابتیں دور کرسکتا ہے اور ان کے دلوں اور ذہنوں کو متحد کرکے ظالم حکمرانوں کے خلاف میدان جنگ میں کھڑا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے پر پابندی لگادی گئی یعنی ہم کہہ سکتے ہیں جب انگریزوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش کی اس وقت پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کی اس روح کو پیش کرنے کی کوشش کی جو مختلف مذاہب اور گرہوں میں ایک ہے۔

افسانہ 'دو بیل' بظاہر دو بیلوں ہیرے اور موتی کی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے ذریعے پریم چند نے مختلف طبقوں اور مذاہب کے لوگوں کو اتفاق واتحاد اور قومی یکجہتی کی تعلیم دی ہے۔ اس کہانی سے پریم چند کے تصور قومی یکجہتی پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ ایک بیل ہیرا ہے اور دوسرا موتی۔ ایک دفعہ ان کا مالک جھوری ان کو اپنے سسرال والوں کے ہاں کچھ دنوں کے لیے بھیج دیتا ہے اور وہ دونوں بھاگ کر واپس چلے آتے ہیں۔ راستے میں انھیں ایک سانڈ سے مقابلہ ہوتا ہے اور وہ دونوں اس پر ایک ساتھ حملہ کردیتے ہیں:

''دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا موتی نے پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے ڈھکیلنا شروع کردیا۔ سانڈ چاہتا تھا ایک ایک کرکے دونوں کو گرالے۔ پر یہ بھی استاد تھے۔ اسے یہ موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ سانڈ جھلا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیے۔ بیچارہ زخمی ہوکر بھاگا اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہوکر گر

پڑا۔'' (بحوالہ پریم چند کے نمائندہ افسانے۔قمر رئیس ص 151)

اس افسانے میں پریم چند نے ہیرا اور موتی کو دو الگ الگ طبقوں اور فرقوں کے نمائندوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ سانڈ اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو مختلف مظلوم طبقوں کو اپنے ظلم کا نشانہ الگ الگ طریقے سے بناتا ہے لیکن اگر مظلوم طبقہ متحد ہوکر ظالم طبقے کے خلاف آواز اٹھائے تو اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اتفاق واتحاد سے ان تمام پابندیوں اور جکڑ بندیوں کو توڑا جاسکتا ہے جو مظلوم قوم پر لگائی جاتی ہیں۔ یہی اس افسانے میں پریم چند نے علامتی انداز میں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔

آیئے اب دیہی معاشرے کی ان برائیوں کی طرف جن کو دور کرنا قومی یکجہتی کے لیے لازم وملزوم تھا۔ پریم چند اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اس کے معاشرے میں جاگیردار، ساہوکار اور مذہبی ٹھیکیدار ایسے طبقے ہیں جو سماجی نابرابری اور استحصال کے باعث ہیں۔ جو کسانوں اور دیگر چھوٹے طبقوں پر استحصال کرکے ان کا خون چوس چوس کر پیتے ہیں۔ جاگیردار کسانوں سے جبریہ لگان وصول کرتا ساہوکار سود پر غریب لوگوں کو روپے فراہم کرتا لیکن سود کی پالیسیوں سے ان کو اس طرح چنگل میں پھنسا لیتا کہ وہ عمر بھر اس سے خلاصی نہ پاتے۔ مذہبی ٹھیکیدار مذہبی رسوم ورواج سے غریب لوگوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے۔ پریم چند کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ معاشرے میں جب تک یہ خرابیاں اور خامیاں موجود ہیں تب تک قوم میں یکجہتی اور اتحاد قائم کرنا ممکن نہیں۔ اسی لیے پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے ان برائیوں کی سخت مخالفت کی۔ ان ہی موضوعات کو پریم چند نے اپنے افسانوں میں جگہ دی تاکہ لوگوں میں ان برائیوں کے تئیں نفرت کا جذبہ پیدا ہو اور ان کے خاتمے کے لیے سماج کے سارے طبقے اکٹھے ہوکر ان کو جڑ سے اکھاڑیں۔

افسانہ 'پوس کی رات' میں پریم چند نے جاگیردارانہ نظام میں جکڑے ہوئے کسان کی بدحالی کی عکاسی کی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ہلکو ہے جو شدید سردی میں کھیتوں کی رکھوالی ایک پھٹے پرانے کمبل میں کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسے کسی بھی حال میں زمین دار کا لگان وصول کرنا ہے۔ چاہے اس کے کھیت سے کچھ فصل نکلے یا نہ نکلے۔ اسے کسی بھی حال میں زمین دار کی تجوری میں اس کا حصہ ڈالنا ہے۔ اس کی بیوی منی بہوا سے کمبل خریدنے کے لیے اصرار کرتی ہے لیکن ہلکو جانتا ہے کہ زمیندار شہنا کسی بھی حال میں لگان معاف کرنے والا نہیں ہے تو وہ کمبل کی جمع شدہ رقم دینے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے:

''ہلکو تھوڑی دیر تک چپ رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا۔ پوس سر پر آگیا ہے بغیر کمبل کے رات کو وہ کسی طرح کھیت پر نہیں سوسکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں۔ وہ گھڑکیاں دے گا، گالیاں سنائے گا، بلا سے جاڑے میں مریں گے، یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا، اپنی بیوی کے پاس گیا او رخوشامدانہ لہجے میں بولا 'لا دے دے۔ گردن تو کسی طرح سے بچے، کمبل کے لیے کوئی تدبیر سوچوں گا۔'' (پریم چند کے نمائندہ افسانے ص 110)

اس کے بعد ہلکو کے کھیت کو جب جانور رات کو چر جاتے ہیں پوری فصل تباہ ہوجاتی ہے لیکن لگان کا بوجھ اس کے سر سے کم نہیں ہوتا بلکہ اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کسان مجبور تھا کہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر لگان ادا کرے چاہے وہ کتنے ہی قرض کے بوجھ تلے دب جائے اور بدحال ہوجائے۔ اس افسانے میں یہی المیہ پریم چند نے بیان کیا ہے۔

جاگیردارانہ نظام کا اثر نچلے طبقے کی نفسیات پر کیا پڑا؟ اس موضوع کو افسانہ 'کفن' میں پریم چند نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جھونپڑے کے اندر بدھیا دردزہ میں مبتلا ہوکر پچھاڑیں کھا رہی ہے اور باپ بیٹا گھیسو اور مادھو آلو بھون بھون کر اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ بدھیا کی موت کے بعد جب وہ کفن لانے کے لیے جاتے ہیں تو دونوں بجائے کفن لانے کے بازار کے ایک شراب خانے میں داخل ہوکر شراب پینے میں مست ہوجاتے ہیں اور ان میں جیسے محبت کا جذبہ اور انسانیت کا جذبہ رہا ہی نہیں ہے۔ ایسا کیوں؟ دراصل بات یہ ہے کہ مادھو اور گھیسو اس سماج میں رہ رہے ہیں جہاں جاگیردار نچلے طبقے کے لوگوں سے مزدوری تو بہت کراتے ہیں لیکن اجرت نہیں کے برابر دیتے ہیں۔ اس لیے وہاں ان لوگوں کی بھی حالت اچھی نہیں جو رات دن محنت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ بیکاری میں ہی اپنا بھلا سمجھتے ہیں۔ ان کو کام سے نفرت ہوجاتی ہے اور صرف بھوک کی تلافی اور پیٹ بھرنے میں ہی وہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ صاحب اقتدار لوگوں نے ان کا استحصال اس طرح کیا ہے کہ ان کی روح نچوڑ کر انھیں عام انسانی حس سے محروم کردیا ہے۔

افسانہ 'سوا سیر گیہوں' میں پریم چند نے ایک پنڈت ساہوکار کے تلے دبے ہوئے غریب کسان شنکر کی المناک کہانی بیان کی ہے۔ شنکر ایک دفعہ ساہوکار سے سوا سیر گیہوں ادھار لے لیتا ہے اور سات سال تک کبھی اس سے تقاضا نہیں کرتا۔ سات سال کے بعد جب شنکر سے سات من گیہوں کا تقاضا کیا جاتا ہے تو وہ چونک پڑتا ہے۔ اس گیہوں کی قیمت 60 روپے بنتی ہے جسے وہ چکانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے لیکن سود پر سود چڑھنے کی وجہ سے اسے چکانے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوتا ہے جو کفن کے مادھو اور گھیسو کا ہوتا ہے:

''اس کی ہمت پست ہوگئی۔ محنت سے نفرت ہوگئی... اب گانجہ اور چرس کا چسکا بھی لگا... پہلے لرزہ آجانے پر بھی وہ کام کرنے ضرور جاتا تھا۔ اب کام پر نہ جانے کا بہانہ تلاش کیا کرتا تھا۔''

(کلیات پریم چند 11، مدن گوپال ص 86-385، قومی کونسل 2001)

پریم چند جانتے تھے کہ چھوت چھات، ذات پات، فرقہ واریت سے نفرت پیدا کرکے ایمانداری اور خلوص ہی وہ راستہ ہے جو ملک کو ترقی کے ڈگر پر کھڑا کرسکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے جن میں رشوت خوری اور دوسرے جرائم سے نفرت کا بھی درس ملتا ہے۔ 'نمک کا داروغہ' میں پنڈت بنسی دھر ایک ایماندار داروغہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ پنڈت الوپی دین اسے رشوت دے کر بے ایمانی کے جال میں پھنسانا چاہتا ہے لیکن بنسی دھر اپنے راستے سے کسی بھی قیمت پر نہیں ہٹتا۔ اسے اگرچہ معطلی کا پروانہ بھی آپہنچتا ہے لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ آخر الوپی دین اس کی ایمانداری سے متاثر ہوکر اسے اپنی ملکیت کا مختار بنادیتا ہے۔

افسانہ 'زیور کا ڈبہ' میں پرکاش چند اپنی بیوی کی خاطر ٹھاکر کے گھر سے 'زیور کا ڈبہ' چوری کرتا ہے لیکن اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسے راتوں کو بے چینی ہوجاتی ہے اور ملازمت ملنے کے بعد وہ ٹھاکر کے سب گھر والوں کو ایک رات اپنے گھر دعوت پر بلا لیتا ہے اور خود رات کو ہی زیور کا ڈبہ ان کے گھر واپس چھوڑ آتا ہے۔ اسے خوشی کے آنسو آجاتے ہیں اور وہ ایک بھاری بوجھ سے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند اپنے افسانوں سے ہمیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کے معاشرے میں گھیسو، مادھو، شنکر اور دکھی جیسے مظلوم لوگ ایک طرف اور دوسری طرف پنڈت ساہوکار اور نجات افسانہ کے پنڈت جی جیسے ظالم لوگ ہیں تب تک قومی یکجہتی ممکن نہیں۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے لوگ پنڈت بنسی دھر اور پرکاش چند جیسے ایماندار لوگوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چھوت چھات، جاگیردارانہ نظام، فرقہ واریت اور دوسری سماجی برائیوں کو ختم کرکے قومی یکجہتی پیدا کریں اور ملک کو ترقی کی بلندیوں تک لے جائیں۔

■

Imteyaz Ahmad Khwaja
Research Scholar, Dept of Urdu
MANUU, Hyderabad -500032 (Telangana)

پروفیسر محمد حسن کی پریم چند شناسی

نور عالم خان

محمد حسن اردو کی ان چند عہد ساز شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہے۔ جنھوں نے بہت سے نقادوں کی طرح پریم چند کے تعلق سے ان کی تخلیقات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور پریم چند کی تحریروں کو جانچ اور پرکھ کر اپنے اعتبار سے ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ محمد حسن ایک ترقی پسند نقاد ہیں ان کی تنقید نگاری کا آغاز آزادی سے پہلے ہو چکا تھا انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں کچھ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ 'ادبی تنقید' شعرِ نو، اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر، عرض ہنر، جدید اردو ادب، شناسا چہرے، معاصر ادب کے پیش رو، ادبی سماجیات، مشرقی تنقید، مطالعہ سودا، جلال لکھنوی، ہندی ادب کی تاریخ، اور اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ اس کے علاوہ ضحاک، مورپنکھی، محل سرا، فٹ پاتھ کے شہزادے، سچ کا زہر، پیشہ اور پرچھائیں، کہرے کا چاند، موم کے بت، ان کے بہتر ڈرامے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے ان کی صلاحیت اور ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے بھی ادبی نقادوں کی طرح پریم چند شناسوں میں اپنا نام درج کر دیا ہے۔ محمد حسن نے جدید اردو ادب خاص کر پریم چند کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ بدلتی ہوئی فکروں کے اعتراف کے ساتھ ان کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا۔

محمد حسن نے پریم چند کا تعارف بہت بہتر انداز میں کرایا ہے اور ان کے بہت سے افسانوں اور ناولوں کے تجزیے بھی پیش کیے ہیں اور ان کے کرداروں کے تعلق سے نمایاں بحث کی ہے۔ محمد حسن کہتے ہیں کہ پریم چند کو اپنے کرداروں پر پورا بھروسہ تھا اور جن کرداروں سے جو بات کہلوانا چاہتے اس سے کہلوا بھی دیتے تھے۔ پریم چند کے یہاں تیز اور فعال کردار بھی ہیں اور سست کردار بھی۔ ان کرداروں میں فعال اور سست کردار کا ہونا ضروری بھی ہے اس لیے کہ جب کوئی اپنے موجودہ سماج کی عکاسی کرتا ہے تو اس میں سکھدا، سلیم، امرکانت جیسے فعال کردار بھی ہوتے ہیں اور گھیسو مادھو جیسے سست اور کاہل کردار بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے پریم چند نے ناول یا افسانہ لکھتے وقت جہاں جس چیز کی ضرورت سمجھی فوراً اس کو استعمال میں لے آئے۔ محمد حسن نے اپنی تنقیدی بصیرت کے ذریعے پریم چند اور اقبال وغیرہ کی مماثلت بھی پیش کی ہے۔ جہاں جس چیز کی ضرورت سمجھی فوراً اس کو استعمال میں لے آئے۔ انھیں دونوں میں مقصدیت نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ علامہ اقبال عوام، سماج کو بیدار کرنے کا کام کرتے ہیں اور پریم چند بھی سماج و معاشرے کے جذبات کو اپنے قلم سے بیان کر کے ایک پسماندہ طبقے کو ہمواری اور مساوات کا سبق دینا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں یہ دونوں بڑے قلم کار مغرب کی صنعت زدہ تہذیب میں روحِ انسان کو گم ہوتے دیکھ رہے تھے اس لیے یہ دونوں حضرات کبیدہ خاطر ہوئے اور انسانی زندگی کو مغربی اثرات سے دور رکھنے کی کوشش کی دونوں کے یہاں اصلاحی پہلو موجود ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور پریم چند نے اپنی موثر نثر کے ذریعے سماج میں ایک صور پھونکا تاکہ عوام اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکیں۔ محمد حسن نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے، جس کے ذریعے اقبال اور پریم چند کی تحریکات کا پتہ چلتا ہے وہ کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''اقبال رومی کے ذریعے اور پریم چند کچھ دنوں آریہ سماجی اثر اور کچھ دن بعد گاندھی جی کے اثر کے ذریعے دونوں آرزو کے قائل اور ربطِ ملت کے حامی ہیں اور دونوں اشتراکی نظام کو تقریباً یکساں طور پر لبیک کہتے ہیں۔'' (محمد حسن 'پریم چند زمانہ، ذہن اور آرٹ' رسالہ آج کل، دہلی، جلد 39، شمارہ 1، اگست 1980، ص: 5)

پریم چند پر محمد حسن کا ایک مضمون ہے جو 'پریم چند کا ورثہ' کے نام سے ہے اس میں محمد حسن نے پریم چند جیسے ایک عظیم فنکار کی شخصیت پر بڑے والہانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور پریم چند سے قبل سے لے کر پریم چند کی آخری سانس تک کی خدمات کو پیش کیا ہے۔ محمد حسن نے پریم چند کے حالات کا بھی جائزہ لے کر اور پریم چند کے بعد کا بھی تجزیہ کر کے نئے ادیبوں اور فنکاروں کو نئے اور بہتر مشوروں سے نوازا ہے۔ محمد حسن کہتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب لوگ صرف خیالی دنیا کے کرداروں سے اپنی حیات کو مزین کرتے تھے لیکن یہ خیالی چیز صرف خیالی رہی اور ان خیالی چیزوں سے سروکار رکھ کر نہ تو کوئی کسی کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ تو ان میں زندگی کے حقائق بیان کرنے کی قوت ہے لیکن جب افقِ اردو پر پریم چند نمودار ہوئے تو انھوں نے ان طلسماتی اور خیالی کرداروں کو الوداع کہہ کر ایک نئی روش قائم کی اور اردو کو ایک حقیقت نگاری کی طرف للکارا اور خود پریم چند نے بھی اپنے قلم کے ذریعے سماجی اصلاح کا کام لیا لیکن جب ملک پر انگریزی فوج کا تسلط ہو گیا اور انھوں نے غریبوں اور مزدوروں پر ظلم ڈھانا شروع کیا تو پریم چند نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے افسانوں، ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے سماج کے درد کو اپنی تحریروں میں کسی نہ کسی کردار کے حوالے سے

بیان کیا اور لوگوں کو بلند حوصلے پر آمادہ کرتے رہے۔ پریم چند نے خاص طور پر پسماندہ اور نچلے طبقے کی کسمپرسی کو اپنے افسانے میں پیش کیا ہے اور اگر دیکھا جائے تو حقیقت نگاری کو اپنی کہانیوں وغیرہ کے ذریعے بنیادی حیثیت پریم چند نے ہی عطا کی۔ حسن اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''پریم چند سے پہلے کے افسانوی ادب کا خیال آتے ہی طلسم ہوش ربا کے عمرو عیار اور ان کی زنبیل ذہن میں آتی ہے۔ اس کے بعد چہار درویش ہیں جو نگر نگر گھومتے ہیں پھر سرور کے جانِ عالم کا ذکر آتا ہے جو طوطے کو رفاقت میں لے کر حسین شہزادیوں کی چاہ میں دربدر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ شہزادوں اور درویشوں سے قدم بڑھا کر زمانے نے متوسط طبقے کا وہ کردار پیدا کیا تھا جو پرانے تمدن کا پروردہ ہے لیکن نئی تہذیب سے ناک، بھوں نہیں چڑھاتا کہیں وہ ابن الوقت ہے تو کہیں کلیم، کہیں میاں آزاد ہے تو کہیں امراؤ جان ادا پریم چند کے کردار ہمارے طبقاتی نظام کے سب سے نچلے طبقے سے آتے ہیں وہ میر داستان کا تاج کسانوں کے سر پر رکھتے ہیں، اس عام انسان کے سر پر رکھتے ہیں جس کی کہانیاں ہمارے ادب کے لیے ابھی تک اجنبی تھیں۔''

(ڈاکٹر محمد حسن، 'پریم چند کا ورثہ' مشمولہ 'ادبی تنقید'، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، 1954، ص:143)

اس اقتباس کے حوالے سے محمد حسن کہتے ہیں کہ عوام کا مفہوم جو آج عام طور پر سمجھا جاتا ہے یہ افسانوی ادب میں ہم کو پریم چند کے یہاں پہلے پہل ملتا ہے۔ حالانکہ مذکورہ بالا اقتباس میں بھی بہت سے اعلیٰ کردار بیان ہوئے ہیں کوئی شاہ کے گھرانے کا ہے تو کوئی شہزادہ ہے تو کوئی بہت رئیس ہے جس کا تعلق محل اور درباروں سے ہے لیکن پریم چند نے ان سب شہزادوں اور رئیسوں کو محل اور دربار سے نکال کر ایک دیہات میں بھیجا اور حالات کا تجزیہ کر کے ان کی اپنی اہمیت واضح کی ہے۔ جو آج ہمارے سامنے نچلے طبقے سے آتے ہیں۔ اور پھر ان کو پریم چند جدو جہد سکھا کر ایک نمایاں مقام حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں جہاں ہر طرح کے لوگوں سے ان کرداروں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کشمکش میں پریم چند ایک بہتر نظام بنا کر نچلے طبقے کے لوگوں کو مساوات کا درس دینا چاہتے ہیں جن میں امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں کسان اور مزدور بھی ہیں سرمایہ دار اور ساہوکار بھی ہیں ان کے علاوہ ذات برادری کا معاملہ بھی واضح ہوتا ہے۔ ہر ذات اور برادری کے لوگ ہوتے ہیں جہاں چھوا چھوت کا رواج بھی ہے اور نچلے لوگوں سے ملنے میں کسرِ شان بھی ہے۔ اس طرح کے نظام کا خاتمہ کر کے ایک سوشل نظام کے پریم چند متمنی تھے۔ اس لیے کہ جب پریم چند نے آنکھیں کھولیں تو ان ساری چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان حالات کا مشاہدہ بھی بڑے بہتر طریقے سے کیا اس لیے پریم چند کا حساس دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے سماج کی گندگی کو اپنے قلم کے ذریعے پاک کرنے کی کوشش کی۔ کچھ اس طرح کی تحریکات گاندھی جی نے قائم کر رکھی تھیں اس لیے جس کا اثر صاف طور پر پریم چند کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ پریم چند ایک متوسط ذہن کے مالک تھے جو مغربی آدرش اور تعلیمات سے واقف تھے اور اسی وجہ سے پریم چند قومی آزادی، نیشنلزم اور گاندھی جی کی تحریکوں سے زیادہ متاثر ہوئے اس لیے جب سامراجی حکومتیں ہندوستان کی تہذیبی جڑیں اکھاڑنے میں کوشاں تھیں اور کافی حد تک اس کی تہذیبی وراثت کو نقصان بھی پہنچا چکی تھیں تب ایسے حالات میں ان تحریکوں سے متاثر ہونا اور ان تحریکوں میں شامل ہو کر ملک کی حفاظت کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اور پریم چند کے ضمیر میں ایک زندہ دل انسان کا خون تھا اس لیے انھوں نے اس تحریک میں بڑھ کر حصہ لیا جو کہ ایک دیہاتی تھے۔ پریم چند کے دیہاتی سلسلے کے تعلق سے محمد حسن کہتے ہیں:

''دیہاتی زندگی کے جس پس منظر میں پریم چند کی ذہنی نشو و نما ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ قدیم تہذیبی روایات ان کے مزاج میں قوی تر ہوں ایسے حالات میں جب ہندوستان میں قومی آزادی، مساوات اور سامراج دشمنی کے نعرے بلند ہو چکے تھے۔ کسانوں کی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں اور گاندھی جی کی تعلیمات اہنسا اور ترکِ موالات کی شکل میں ذہنوں کو متاثر کر رہی تھیں۔ پریم چند کا ان سے متاثر ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔'' (ایضاً، ص 144)

اس اقتباس کے ذریعے پریم چند کے متعلق یہ باتیں معلوم ہوئیں کہ ان کے ذہین پر نہ صرف مختلف تحریکوں کے اثرات مرتب ہوئے بلکہ ان سے پریم چند کے تخیل میں اضافہ بھی ہوا ہے اور انھوں نے گاندھی کی تحریک سے متاثر ہو کر ملک کے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ ایک چیز اور ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی نچلے متوسط طبقے کے فرد کے لیے دو راستے کھلے ہوئے تھے یا تو وہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کی طرف قدم بڑھائے یا اپنی ہمدردیاں ان دبے کچلے مگر آگے بڑھتے ہوئے انسانوں سے وابستہ کر دے جن کے بیچ میں وہ سانس لے رہا ہے۔ گرچہ پریم چند نے مغرب سے استفادہ بھی کیا لیکن ان کے اندر مغربیت نے جگہ نہیں بنائی بلکہ پورا کا پورا ایشیائی رنگ پریم چند کے یہاں نظر آتا ہے۔ فکری اعتبار سے جس زاویے تک پریم چند (جس انسان دوستی تک) پہنچے ان میں رومانی انداز کارفرما تھا اور رومانیت سے مراد عشق و محبت نہیں ہے بلکہ رومانیت پریم چند کے یہاں وہ چیز ہے جو عقل سے زیادہ جذباتیت پر منحصر ہو۔ اپنے اس مقالے میں محمد حسن نے پریم چند کی حقیقت نگاری اور ورثے پر اظہار خیال کیا اور پوری زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ساتھ نئے ادیبوں کو بھی اس چیز پر آمادہ کیا ہے کہ پریم چند نے ادیبوں کے لیے ایک بہت بڑا ورثہ چھوڑا ہے جس سے استفادہ کر کے ہمارے ادیب افسانوں اور ناولوں میں بھی ایک نئی فکر پیدا کر سکتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

''آج پریم چند کے ورثے کا اہم ترین جز یہی ہے کہ زندگی سے ہمارے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کا واسطہ زیادہ گہرا زیادہ قریبی اور زیادہ دیرپا ہو وہ عوام سے ذہنی طور پر ہی محبت کرنا نہ سیکھیں بلکہ ان میں جا کر ان کے شانہ بہ شانہ دکھ سکھ بھوگیں ان کی زندگی کا مطالعہ کتب خانوں کے میناروں یا کتابوں کے دریچوں سے نہیں بلکہ ان کے کھیتوں اور کھلیانوں میں ان کے گھروں اور آنگنوں میں جا کر کریں۔ تبھی ان کے کردار زیادہ حقیقی ہوں گے اور صرف ان کے اپنے خیالات کے بھدے پرچارک بننے کے بجائے زندگی کے مظہر بنیں گے۔ اور تبھی ہمارا ادب صرف کچے نعروں اور میکانکی یکسانیت کا ادب بننے کے بجائے تنوع، رنگا رنگی اور حقیقی حسن سے آشنا ہوگا۔'' (ایضاً، ص 151)

اس اقتباس میں محمد حسن کہنا چاہتے ہیں کہ دیہات کی گلیوں اور کوچوں میں جا کر پھریں لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ ادب کو نئی وسعت اور فن کو فکری بالیدگی سے روشناس کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارا فنکار پریم چند کے ورثے کی روشنی میں نئی منزلیں طے کرے۔

محمد حسن نے پریم چند کے کرداروں، ان کی حقیقت نگاری، سیاسی موڑ، طبقاتی نظام کی تبدیلی وغیرہ کے تعلق سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ پریم چند کے ذہنی ارتقا اور آرٹ پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس کے ذریعے پریم چند کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

■

Noor Alam Khah, Balrampuri
Research Scholar, Dept. of Urdu
University of Hyderabad
Mob: 7893596958
Email: nooralamhcu@gmail.com

شاہد ساز

گوہر جان گوہر

ایک مغنیہ، ایک شاعرہ

گوہر جان گوہر کے نام سے کون واقف نہیں۔ وہ انیسویں صدی کی مشہور گلوکارہ اور شاعرہ تھیں اور جن کی شہرت و مقبولیت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔

گوہر کا اصل نام Agelina Yeoward تھا۔ ماں کا نام Adeline Victoria اور باپ کا نام Robert Welliam Yeowart تھا۔ گوہر کی پیدائش 1873 میں اعظم گڑھ میں ہوئی۔ گوہر کی ماں کی شادی 1872 میں رابرٹ ولیم سے ہوئی تھی لیکن 1879 میں طلاق ہوگئی تھی۔ اس وقت گوہر کی عمر 6 برس کی تھی۔ گوہر کی ماں نے گوہر کے ساتھ 1881 میں بنارس میں سکونت اختیار کرلی اور یہیں مذہب اسلام قبول کیا۔ اس طرح وہ Angelina Yeoward سے گوہر جان بن گئی اور ماں نے اپنا نام ملکہ جان رکھا۔ ملکہ جان اپنی تصنیف 'مخزن الفت ملکہ' 1886 کے باعث دائمی شہرت کی مالک بن گئی۔

گوہر اپنی ماں کی طرح بہت حسین اور خوبصورت تھیں۔ وکرم سمپتھ نے گوہر کا خاکہ یوں کھینچا ہے:

"Meanwhile little Gauhar was growing up to be a pretty girl with a broad face, curly hair and distinct Anglo-Indian features."

(My Name is Gauhar Jaan, Pg.: 28)

گوہر جان ایک طوائف تھیں لیکن وہ اس زمانے کی طوائف کی طرح نہ تھیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں آزادی سے پہلے طوائف کو موسیقی اور جنسی تلذذ کو ایک ساتھ دیکھا جاتا تھا بلکہ گوہر جان کا تعلق صرف موسیقی سے تھا۔ اس ضمن میں عزیز الدین چشتی نے گوہر جان کی شخصیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے:

''جس طبقہ سے میرا تعلق تھا، اس میں کسی 'طوائف' سے ملنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن 1929 میں ایک دوست نے مجبور کردیا۔ اپنے مکان پر اسے مدعو کیا اور زبردستی مجھے اس سے ملا دیا۔

میرا خیال تھا کہ ایک سن رسیدہ عورت کو دیکھوں گا مگر مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھی نہ تھی۔ شباب کی تازگی اور حسن کی رعنائی ہنوز اس پر جلوہ گر تھی۔

قارئین تصور کریں۔ ایک مشہور طوائف اگر کسی سے اس حال میں ملے کہ تسبیح اس کے ہاتھ میں ہو اور خشیت الٰہی کے آثار اس کے بے ریا بشرے سے عیاں ہوں تو اس شخص کا استعجاب کس قدر عظیم الشان ہوگا؟ گوہر جان کو میں نے اسی حال میں دیکھا۔ وظیفہ میں غرق تھیں۔ ان کے ایک رفیق سے معلوم ہوا کہ نماز کبھی قضا نہیں ہوتی۔ تلاوت سے کبھی سیری نہیں ہوتی۔ زہد و تقویٰ شعار بن گیا ہے۔ اللہ سے لو لگی ہے اور ہمہ وقت آخرت کی فکر دامن گیر ہے!

ہمارے دوست، جن کے مکان پر دعوت تھی، گوہر جان کو تیس برس سے اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ یہ خاتون کبھی بھی 'طوائف' نہ تھی۔ اس کی خودداری، شرافت نفس، فیاضی، تقویٰ و طہارت کے انھوں نے ایسے ایسے واقعات بیان کیے کہ حیرت ہوگئی! گوہر جان سے گفتگو اور اس کی حلاوت شاید عمر بھر نہ بھولے گی۔ فصاحت و بلاغت کا ایک دریا موجزن ہوگیا تھا۔ از حد شائستہ باتیں، نپے تلے لفظ، قند سے زیادہ شیریں بول، کہاوتیں، ضرب المثلیں، اشعار، حسن و عشق پر محققانہ تبصرے، دنیا کی بے ثباتی کے نقشے، نعیم اخروی کی آرزوئیں۔ غرضیکہ کوئی موضوع نہ تھا جس پر اس نے تقریر نہ کی ہو۔ وہ باتیں کررہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ خاتون ہندوستان کی سب سے بڑی مغنیہ ہی نہیں بلکہ فاضل ترین عورتوں میں سے ایک ہے۔''

(مرحومہ گوہر جان، پیام، 23 مارچ، 1931، ص:10)

گوہر جان کی ماں ملکہ جان شاعری اور موسیقی کے رموز و نکات سے واقف تھی۔ وہ بنارس کی مشہور طوائف بڑی ملکہ جان کے نام سے مشہور تھی۔ گوہر نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد پنڈت مشرا سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی، بنارس کے مشہور گھرانے میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

1883 میں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ والی دکن کی ایما پر ملکہ جان اور گوہر جان نے کلکتہ میں قیام کیا اور اس وقت سے کلکتہ کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔ گوہر جان کا کلکتہ آنا اس کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا کیونکہ گوہر جان کے گانے کی شہرت و مقبولیت کلکتے سے نکل کر دوسرے ممالک تک پہنچ گئی تھی۔ گوہر جان نے واجد علی شاہ کے دربار میں ایک مجرہ پیش کیا تھا۔ اس مجرے کے متعلق عبدالحلیم شرر رقم طراز ہیں:

''آج سے 40 سال پیشتر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی منصرم والی گوہر نے کلکتے میں جا کے نمود حاصل کی تھی۔ میں نے ایک محفل میں اس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ

حاضرینِ محفل (جن میں مٹیا برج کے تمام باکمال ڈھاڑی اور معزز لوگ موجود تھے) اوّل سے آخر تک محوِ حیرت و سکوت تھے اور کوئی بچہ بھی نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو۔''

(گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم، 2011، ص: 48-247)

گوہر گانے کی وجہ سے دائمی شہرت کی مالک بن گئی۔ گوہر کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے مدراسی، برمی، تیلگو، بنگالی، پیشاوری، عربی، ترکی، فارسی، پنجابی اور ہندوستانی زبانوں میں اپنی گائیکی سے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ فصیح الدین بلخی، گوہر کی موسیقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوان ہونے پر گوہر نے گانے میں وہ شہرت حاصل کی کہ جب اول اول ہندوستانی گانوں کے ریکارڈس بنائے گئے تو گراموفون کمپنی نے گوہر سے خاص طور پر درخواست کر کے اس کے گانے کے ریکارڈس تیار کیے جو اس کے زمانے میں بے حد مقبول و مشہور تھے۔ فی الواقع اس کی آواز نہایت خوشگوار تھی۔ بڑی بڑی محفلوں میں گاتی تھی تو دور دور تک اس کا گانا صاف سنائی دیتا تھا۔''

(تذکرۂ نسوانِ ہند، فصیح الدین بلخی، 1956، ص 12)

عزیز چشتی نے ایک محفل میں گوہر جان کا گانا سنا تھا۔ گوہر جان کے گانے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''کس کے قلم میں طاقت ہے کہ ان نغموں کی حلاوت ضبطِ تحریر میں لا سکے؟ گراموفون میں ان کے جو گانے ہم نے سنے تھے، وہ ہم فوراً بھول گئے۔ گمان ہوتا تھا کہ مرزا میر داؤد مترنم ہو گئے ہیں۔ رات کا سناٹا، اثر میں ڈوبی ہوئی مناجات اور گوہر جان کی موسیقی! قلب و روح کے سوا حاضرین کا کوئی حواس بھی گویا زندہ باقی نہ تھا۔ غضب کی محویت طاری ہو گئی تھی۔ ہم سب عالم خود فراموشی میں پڑے تھے اور گوہر جان اپنے الحان سے ہماری روحوں کو رقص میں مصروف کیے ہوئے تھیں۔

مناجات گائی جا چکی مگر گوہر جان کے مطرب اعصاب مشتعل ہو چکے تھے۔ اب انھیں کون روک سکتا تھا۔ مجلس میں کئی عرب موجود تھے۔ ایک ترک بھی تھا۔ گوہر جان نے سب کو لٹانا شروع کر دیا۔ عربی گانا گایا مگر کس طرح گایا ہم مشہور عرب مغنیوں کے گانے سن چکے ہیں۔ گمان ہوتا تھا کوئی عرب استاذ گا رہی ہے مگر عرب استاذ کو بھی گوہر جان کی آواز کہاں نصیب؟ پھر ترکی گانا ہوا۔ ترک دوست بے اختیار اُٹھ کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا، پھر فارسی گانا ہوا۔ پھر پشتو گانا ہوا۔ پشتو جیسی کرخت بولی شاید ہی دنیا میں کوئی ہو مگر ہماری مغنیہ کی زبان سے اس کے لفظ ایسے پاک اور شیریں ہو کر نکلتے تھے گویا کوثر میں دھو دیے گئے ہیں۔ متعدد زبانوں کے گیت گائے گئے مگر کیا مجال کہ اصلی لہجے میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ گاتے وقت چہرے اور منھ میں کوئی ادنیٰ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ دونوں اپنی اصلی حالت پر رہتے تھے۔ ہونٹوں میں ذرا بھی کجی پیدا نہ ہوتی تھی۔ یہ وصف ہم نے کسی دوسرے مغنی یا مغنیہ میں نہیں دیکھا۔

یہ واقعہ مرحومہ کی وفات سے غالباً چھ مہینے پہلے کا ہے۔''

(ہفتہ وار 'مصور'، پیام، ایڈیٹر: ملا جان محمد، 23 مارچ 1931)

گوہر جان کلکتہ میں بڑی ٹھاٹ باٹ سے رہا کرتی تھی۔ یہاں کے شرفا، امرا اور عمائدین شہر سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ انھیں بڑی بڑی محفلوں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے کلکتہ میں 'فینسی فیئر' کے نام سے ایک میلہ منعقد کیا تھا جس میں انگریزوں کے گورنروں اور رئیسوں کی شرکت ہوتی تھی۔ گوہر جان بھی اس میلے میں بہت ہی زرق برق لباس زیب تن کر کے جاتی تھی جس کے متعلق فصیح الدین بلخی رقم طراز ہیں:

''گوہر بھی زرق برق لباس فاخرہ پہنے اور قیمتی زیورات سے آراستہ ہو کر ایک اعلیٰ درجے کی فٹن پر سامنے سے گزری اور ہاتھ اُٹھا کر گورنر کو سلام کیا۔ لاٹ صاحب نے اس کو کوئی بڑی ریاست کی رانی سمجھ کر سلام کا جواب دیا اور فوراً پولیس کمشنر سے پوچھا کہ یہ کہاں کی رانی ہے؟ کمشنر نے کہا کہ یہ کلکتہ کی مشہور طوائف ہے۔ لاٹ صاحب دل میں پشیماں ہوئے اور دوسرے سال سے میلے میں عورتوں کے آنے کی ممانعت ہو گئی۔ گوہر کے ہواخواہوں نے علی الرغم انھیں دنوں میں دوسرا میلہ قائم کیا جس کا نام موہن میلہ تھا۔ یہ میلہ بھی بہت کامیاب رہا۔''

(تذکرۂ نسوانِ ہند، فصیح الدین بلخی، 1956، ص 13)

گوہر جان کے تعلقات داغ دہلوی اور اکبر الہ آبادی سے گہرے تھے۔ داغ نے 'زبان داغ' میں گوہر کا ذکر کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے گوہر کے لئے ایک شعر کہا تھا جو زبان زد ہو گیا ہے:

مطمئن کون زمانے میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

گوہر جان اگست 1928 کو مہاراجہ میسور کے دربار سے وابستہ ہو گئی۔ اور اس زمانے میں انھیں ماہانہ 500 روپیہ ملتا تھا۔ 17 جنوری 1930 کو گوہر جان نے میسور میں انتقال کیا اور وہیں سپردِ خاک ہوئیں۔

گوہر جان نہ صرف خوش آہنگ گلوکارہ تھیں بلکہ ایک شاعرہ بھی تھیں۔ ان کی رس بھری آواز اور موسیقیت سے متاثر ہو کر لوگوں نے 'بلبلِ ہند' کا لقب دے ڈالا۔ وہ اپنی ماں ملکہ جان سے مشورۂ سخن کرتی تھیں لیکن مالک رام نے تلامذۂ غالب میں گوہر جان کو غالب کی شاگردہ بتایا ہے، جو درست نہیں ہے کیونکہ غالب کی وفات 1869 میں ہوئی اور گوہر جان کی پیدائش 1873 میں ہوئی تھی، پھر وہ غالب کی شاگردہ کیسے ہو سکتی ہیں؟ مختلف تذکروں میں گوہر جان کے ایک دو شعر ہی ملتے ہیں۔ اس لیے ان تذکروں سے جتنے متفرق شعر دستیاب ہو سکے ہیں، انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

دل میں بے چینی سر بستر راحت ہوگی
اس قدر وصل کی مشتاق طبیعت ہوگی
لاکھ ارمان بھرے حشر میں ہوں گے پامال
چھوٹے سے سن میں بھی رفتار قیامت ہوگی
دو بھی بوسے جو مجھے نام خدا پر دو گے
اس سے کچھ کم تو نہیں حسن کی دولت ہوگی
چٹکیاں لے کے جو پہنچی کبھی وہ زلف سیاہ
درد دل اُٹھنے کی ضامن شب فرقت ہوگی
قیصر ہند لقب بخشے گی گوہر امید؟
ہم کو تفویض جو ملکہ کی وزارت ہوگی

مناجات

یاخدا محو ثنا گبر و مسلماں ہیں ترے
کون عالم میں ہے جس پر نہیں احساں ہیں ترے
جن و انسان و ملک بحر و بر و ارض و سما
تو وہ سلطاں ہے کہ سب تابع فرماں ہیں ترے
صبح دم گلشن ایجاد میں مرغان چمن
ہیں چہکتے نہیں دراصل ثنا خواں ہیں ترے
پھنس گیا آ کے تباہی میں ہے بس اپنا جہاز
اپنی رحمت سے بچا لے سبھی قرباں ہیں ترے
کوئی ہندو ہو مسلماں ہو نصاریٰ کہ یہود
سب کے سب اپنی زبانوں میں ثنا خواں ہیں ترے
کشتی گوہر خستہ کو بھنور سے تو نکال
اے خدا قلب و جگر میرے یہ قرباں ہیں ترے

شاید کہ یاد بھولنے والے نے پھر کیا
ہچکی اسی سبب سے ہے گوہر لگی ہوئی

Md. Shahid
24B, Abdul Halim Lane
Kolkata - 700016
Mob.: 9831365009 (WB)

محمد اسد اللہ

خورشید آرا بیگم کی ادبی و سماجی خدمات

وہ شخصیات یقیناً قابلِ احترام ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے زبان و ادب کی خدمت کی اور خدمتِ خلق کے بھرپور مواقع بھی انھیں میسر آئے۔ خورشید آرا بیگم بھی ایک ایسی ہی نیک دل خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ادب اور سماج کو فیضیاب کیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کارنامہ انھوں نے اس دور میں انجام دیا جب معاشرتی حد بندیوں میں رہ کر صنفِ نازک کا ان کاموں کو کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

خورشید آرا بیگم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے اردو اور فارسی میں یکساں مہارت حاصل کی تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر برجستگی کے ساتھ طبع آزمائی کی اور اپنے عہد کے بعض اہم مسائل کو فنکاری کے ساتھ شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے طبقۂ نسواں کی تعلیمی ترقی کی خاطر متعدد سماجی اداروں سے رابطہ پیدا کر کے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

خورشید آرا، مرحوم قاضی قیام الدین کی دختر اور ناگپور کے مشہور رہنما نواب صدیق علی خاں مرحوم کی بیگم تھیں۔ نواب صدیق علی خاں ممبر آف سینٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی، آنریری فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، ناگپور کے علاوہ 'بے تیغ سپاہی' کے مصنف بھی تھے۔ خورشید آرا بیگم کا ایک تعارف یہ بھی ہے کہ وہ مہاراشٹر کی ایک مشہور ادبی شخصیت بغدادی بیگم کی چھوٹی بہن تھیں۔ خورشید آرا بیگم 1907 میں ودربھ (مہاراشٹر) کے ایک شہر امراوتی میں پیدا ہوئیں۔

خورشید آرا بیگم کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد قاضی قیام الدین کا اہم کردار رہا۔ اس زمانے میں جب لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور خورشید آرا بیگم کا پورا خاندان ان کی تعلیم کے خلاف تھا، ان کے والد نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ خورشید آرا نے آنرز ان اردو، فارسی اور انگریزی میں بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات بھی پاس کیے۔ چار پانچ سال کی عمر ہی سے ان کے والد نے انھیں اردو اور فارسی کی تعلیم دینا شروع کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فارسی اس طرح بولنے لگیں جیسے وہ ان کی مادری زبان ہو۔ فارسی کے اہم شعراء کے مطالعے نے انھیں فارسی شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ کسی پرمسرت موقع پر فارسی میں شعر کہا اور نظم مکمل ہونے پر اخبار مدینہ میں اشاعت کے لیے بھجوائی۔ والد صاحب نے اخبار میں وہ نظم دیکھی تو بلا کر پوچھا: کیا یہ نظم تمھاری ہے؟ خورشید آرا بیگم لکھتی ہیں: میں نے سر جھکا کر کہا: جی ہاں۔

کسی فارسی شاعر کے اشعار چرا کر اس کی ترتیب تو نہیں کی؟ والد صاحب نے پوچھا۔

'بالکل نہیں'۔

اس کے بعد والد صاحب نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، نظم کی تعریف کی اور فارسی میں شعر کہنے کے لیے حوصلہ افزائی کی۔

فارسی میں شعر گوئی کا سلسلہ چلتا رہا۔ 1926 میں ایک فارسی نظم رسالہ عصمت میں اشاعت کے لیے بھجوائی تو اس کے مدیر رازق الخیری نے انھیں یہ کہہ کر اردو شاعری کی طرف راغب کیا: ''اب عام طور پر لوگ فارسی نہیں جانتے اور آپ کے قلم میں قدرتِ تحریر بدرجہ اتم موجود ہے۔'' اس کے بعد خورشید آرا بیگم اردو میں طبع آزمائی کرنے لگیں۔ 'موجیں' خورشید آرا بیگم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'شعاعِ خورشید' ۱۹۶۷ کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 'آخری کرنیں' اور 'جگر لخت لخت' منظرِ عام پر آئے۔

خورشید آرا بیگم کا بہت سا فارسی کلام ضائع ہو گیا۔ ان کے شعری مجموعے 'آخری کرنیں' میں اردو کے علاوہ فارسی کلام بھی موجود ہے۔ ہر دو زبانوں میں موصوفہ نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی نظم 'لا الہ الا اللہ' میں مناظرِ فطرت کے حوالے سے ربِ کائنات کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے۔

جمالِ شام و سحر لا الہ الا اللہ
جلالِ شمس و قمر لا الہ الا اللہ
دھنک کا رنگ گلوں کا تبسمِ شاداب
یہ کوہ و باغ و شجر لا الہ الا اللہ
صبا کے جھونکے، سمندر کی مضطرب موجیں
صدا ہیں وقفِ سفر لا الہ الا اللہ

فارسی کلام کا کچھ حصہ آخری کرنیں میں موجود ہے۔ اس کی ابتدا میں یہ نعت شامل ہے۔

نکتۂ پرکارِ عالم نقش بندِ زندگی
وجہِ خلقِ دو جہاں محبوبِ ربِ اکبر است
عرش و فردوسِ بریں جولاں گہِ براقِ تو
تو خاکِ پایت کحلِ چشمِ آسمان خضر است

ایک اور فارسی نظم 'نعت بہ رساں' میں عشقِ رسول کی اضطراری کیفیت کا شعری اظہار ملتا ہے۔

صبا تحیت با ختمِ مرسلاں بہ رساں
سلامِ عجز بہ آں عرش آستاں بہ رساں
نیازِ قلبِ وفا کیش، خستہ جاں بہ رساں
سجودِ ناصیہ عشق ارمغاں بہ رساں
صدائے دردِ تمنائے بے زباں بہ رساں

بگو کہ ہست شب و روز مضطرب خورشید
سکوں ربودہ تمنائے دید ارض سعید
بگو کہ شوقِ حضوری قرارِ قلب رمید
بگو کہ ذوقِ زیارت ردائے صبر درید
مرا بہ زمرۂ مسعود زائراں بہ رساں

خورشید آرا بیگم نے اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوکر کئی نظمیں اور قطعات سپردِ قلم کیے تھے۔ فارسی زبان میں ان کا وہ قصیدہ جو انھوں نے شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کی شان میں کہا تھا نہایت مقبول ہوا اور ایرانی ریڈیو سے نشر ہوا۔

ان کے اردو کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا عشق کے مزاج سے دل باخبر نہ تھے
آگاہ جورِ حسن سے اہلِ نظر نہ تھے
ہر موڑ پر کھڑے ہیں پریشان و فکر مند
گم کردہ راہ ایسے کبھی راہ بر نہ تھے
بہار آئی مگر خالی پڑے ہیں باغ و میخانے
کہاں رندانِ میکش چل دیے، چلائے پیمانے
اگر چہ رات دن بدلے، نہ بدلے دل مگر اب تو
طریقے ایسے بدلے ہوگئے اپنے بھی بیگانے

خورشید آرا بیگم کی شاعری متنوع مضامین، شعری محاسن اور غنائی کیفیت لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ ان کی نظم 'مقامِ دوست' کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

فضائے نیلگوں میں آسماں کی
تبسم پاشیوں میں کہکشاں کی
تموج میں شفق کی سرخیوں کے
ترانوں میں ہوا کی شوخیوں کے
افق کے پار چھپی روشنی میں
زمیں پر رقص پیرا چاندنی میں
تخیل آفریں رنگِ چمن میں
طلائی شمس کی زریں کرن میں
تڑپتی بجلیوں کے سوزِ غم میں
بھٹکتے بادلوں کے سردِ غم میں
کسی معصوم کے دردِ دروں میں
کسی مایوس کی مجبوریوں میں
کسی ناکام کی مہجوریوں میں
مقامِ دوست اے خورشید پایا

بقول احسن امروہوی 'ان کا کلام ریاضتِ فن اور لطافتِ سخن کا دلکش نمونہ ہے جس میں شاعرہ کا دینی جذبہ اور قومی شعور ہر شعر میں نمایاں ہے خورشید آرا بیگم نے مختصر نظموں میں اپنے عہد کے واقعات پر بھی اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

'مریخ پر آثارِ حیات نہ پانے کے بعد'، 'مادرِ ملت' اور 'کروئیں' کے علاوہ فکر و نظر، شرارے اور شہنائی جیسی نظموں میں لطیف احساسات کا اظہار ملتا ہے۔

خورشید آرا بیگم نے 1935 سے 1947 تک سینٹرل کالج فار ویمنس، ناگپور میں بحیثیت پروفیسر اردو اور فارسی کی تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اسی کے ساتھ تخلیقی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ان میں قومی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس زمانے کی سماجی تحریکات نے اسے جلا بخشی۔ آل انڈیا ایجوکیشن کانفرنس کی خواتین کی شاخ کی کارکردگی اور ملکہ پور (برار) میں منعقدہ برار زنانہ کانفرنس اجلاس ان کے لیے ایک زبردست محرک ثابت ہوا۔ موخر الذکر اجلاس میں وہ خود تو شریک نہ ہو سکیں البتہ اپنی بڑی ہمشیرہ بغدادی بیگم کے ذریعے اپنی ایک فارسی نظم بھجوائی جسے حاضرین کے علاوہ صدر صاحبہ بیگم حبیب الرحمن شیروانی نے خاص طور پر پسند فرمایا۔ اسی زمانے میں خورشید آرا بیگم نے اپنے شہر میں بڑی تگ و دو کے بعد انجمن مسلم خواتین کی بنیاد ڈالی اور پھر اسی کے تحت لڑکیوں کا اردو میڈیم اسکول بھی قائم کیا۔ مسلم لڑکیوں کے لیے اس علاقے میں یہ اردو میڈیم کا پہلا اسکول تھا۔ اس انجمن نے خواتین میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ ان کی سماجی خدمات کے سلسلے کا ایک اہم واقعہ، ضلع بلڈانہ میں واقع چاندور بسوہ میں ان کا قیام ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک فرقہ وارانہ فساد کے دوران اس گاؤں کے تمام بالغ مرد گرفتار کر لیے گئے تھے اس وقت خورشید آرا بیگم اپنے شوہر نواب صدیق علی خاں کے ہمراہ وہاں تشریف لائیں۔ گاؤں میں خوف کا عالم تھا۔ اسی لیے انھوں نے قریب کے کھیت میں ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا جہاں گاؤں کی تمام عورتوں کو جمع کیا گیا۔ خورشید آرا بیگم نے ان لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ ان کی دل جوئی کی، ہمت اور ڈھارس بندھائی اور کئی دنوں تک وہیں قیام فرمایا۔ ان ہی کی ایما پر وہاں ایک اردو لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنی جانب سے اس لائبریری کو کئی کتابیں بطور عطیہ دیں۔ آج بھی بقیہ کتابوں میں یہ تحریر موجود ہے۔ 'عطیہ منجانب خورشید آرا بیگم ناگپور'۔

1935 میں ناگپور میں زنانہ محفلِ میلاد کی صدارت کے لیے خورشید آرا بیگم کو امراؤتی سے بلوایا گیا۔ اس جلسے میں آپ نے خواتین کی ایک انجمن کا سنگِ بنیاد رکھا۔ شادی کے بعد خورشید آرا بیگم مستقل طور پر ناگپور ہی میں مقیم رہیں لہٰذا اسی ادارے کے ذریعے ایک گرلز اسکول کھولا جس میں سرکاری نصاب کے علاوہ دینی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ 1947 کے بعد یہ ادارہ حکومت کی تحویل میں چلا گیا۔ سنٹرل کالج فار ناگپور میں 1935 سے 1947 تک خورشید آرا بیگم نے فارسی اور اردو کی تدریس کے فرائض بخوبی انجام دیے۔ ابتدا میں انھوں نے بلا معاوضہ کام کیا اور آخر میں برائے نام تنخواہ لی۔ 1947 میں ان کے شوہر نواب صدیق علی خان سفارت کے فرائض سے فارغ ہوکر مستقل طور پر پاکستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ خورشید آرا بیگم نے اپنی بہن بلقیس درانی کی مدد سے خورشید گرلز کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں ڈگری کالج بن گیا۔ اسے 1972 میں حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور پھر یہ کالج پی اے سی ایچ سوسائٹی سے کراچی سے ڈرگ کالونی میں منتقل کر دیا گیا۔

خورشید آرا بیگم نے پاکستان آتے ہی 1947 میں مہاجرین کی دیکھ بھال کی۔ 1949 میں آل پاکستان ویمنس ایسوسی ایشن APWA کا قیام عمل میں آیا تو خورشید آرا بیگم اس کی رکن بنیں اور عہدے دار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ 1958 میں نواب صاحب بحیثیت سفیر سوڈان پہنچے تو خورشید آرا بیگم وہاں کی پابندیوں کے پیشِ نظر روایتی طریقے سے کام نہیں کر پائیں۔ تاہم وہاں کی خواتین کے ذریعے دواخانوں میں مریضوں کی مزاج پرسی اور پھل وغیرہ بھجوانے کا کام کروایا۔ اس کام میں دیگر سفیروں کی بیویوں نے ان کا ساتھ دیا۔ خورشید آرا بیگم نے مختلف اداروں کے ذریعے سمینار منعقد کروانے کے علاوہ خواتین کے لیے تعلیم اور فراہمی روزگار کے سلسلے میں بھی کوششیں کیں۔ موصوفہ نے ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے اردو پروگراموں میں بھی شرکت فرمائی 1956 میں نواب صاحب کو سیلون میں ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تو خورشید آرا بیگم نے وہاں APWA کی شاخ قائم کی اور اس کے ذریعے خواتین کے لیے اسکول قائم کیا جس میں کڑھائی اور کتائی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ 6 جون 1983 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

خورشید آرا بیگم قومی خدمت کے جذبے سے اس قدر معمور تھیں کہ وہ جہاں بھی گئیں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ادارے قائم کیے یا وہاں موجود تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہوکر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

■

Dr. Muhammad Asadullah
30- Gulistan colony
Near Pande Amrai Lawns
Nagpur - 440013 (MS)

ابرار رحمانی

قاضی سلیم

ضمیر کی آواز کا شاعر

قاضی سلیم 27 رنومبر 1927 کو پیدا ہوئے تھے اس طرح انھوں نے 78 سال کی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ انھوں نے علی گڑھ سے بی اے اور عثمانیہ سے ایل ایل بی کیا تھا۔ انھوں نے بیک وقت ادب، سیاست اور سماج سبھی شعبوں میں دلچسپی لی اور ان سبھی میدانوں میں انھوں نے اپنا نقش قائم کیا۔

قاضی سلیم پیشے سے وکیل تھے اور تقریباً پندرہ برس سے بیماری کے سبب گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں 1980 میں اورنگ آباد حلقے سے لوک سبھا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ دس سال تک مہاراشٹر کی قانون ساز مجلس کے رکن بھی رہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے کہ ادیب کا تعلق براہ راست سرگرم عملی سیاست سے بھی رہا ہو۔ مولانا آزاد اور حسرت موہانی کی مثال شاذ ہی کہی جائے گی لیکن قاضی سلیم کا اختصاص یہ ہے کہ وہ عوام کے ذریعے منتخب پارلیمینٹرین تھے اور انھوں نے اپنے حلقہ اورنگ آباد کی بھرپور اور پرزور نمائندگی کی۔ وہ جب بھی دہلی اپنے ساؤتھ ایونیو کے ایم پی کوارٹر میں آتے تو وہاں بھی ملنے والوں میں ادیبوں اور شاعروں کا ہی تانتا لگا رہتا اور کبھی غیر رسمی شعری محفل بھی جم جاتی۔

1968 میں قاضی سلیم کا پہلا مجموعہ 'نجات سے پہلے' شائع ہوا۔ تعجب ہے کہ قاضی سلیم کے اس مجموعے پر تبصرہ آجکل میں پورے چار سال بعد شائع ہوا۔ رشید حسن خاں نے اپنے اس تبصرے میں لکھا تھا:

''اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں ابہام اس قدر ہے جیسے گہری کہر آلود صبح ہوتی ہے۔ کہیں کہیں مفہوم کی چمک دکھائی دے جاتی ہے اور پھر اندھیرا اور سناٹا۔ جو لوگ اس انداز کی شاعری میں حسن و پسندیدگی کو دیکھ سکتے ہیں، ان کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔

اس مجموعے میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں، جن میں آہنگ اور وضاحت اظہار دونوں عناصر پائے جاتے ہیں، لیکن یہ 1950-55 تک کی یادگار ہیں، جیسے عروس البلاد اور دھرتی تیرا مجھ سا روپ۔ ان میں معنویت کی سطح بلند ہے اور اظہار کا حسن نمایاں ہے۔ لیکن مجموعے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جلد ہی اس پرانے پن سے پیچھا چھڑا لیا اور 1960 کے بعد کی بیشتر نظمیں پرانے پن کے ہر الزام سے محفوظ ہیں۔ 1965 سے 1970 تک کی جو نظمیں ہیں وہ 1955 کی نظموں سے مکمل طور پر مختلف ہیں اور اس خلفشار کی بہت اچھی طرح نمائندگی کرتی ہیں جو جدت کے نام پر اردو شاعری میں رونما ہو رہا ہے۔

بہرصورت اس طرح کے مجموعوں کی بھی ایک اہمیت ہے۔ اس عہد کی شاعری پر مفصل بحث کرنے والوں کے لیے مختلف قسم کی مثالیں فراہم کرنے کے یہ کام آسکیں گے۔ یہ خوبی بھی کچھ کم نہیں۔''

اس کے بعد ان کی ایک مثنوی 'باغبان' و 'کف گل فروش' شائع ہوئی جو ان کی کلیات 'رستگاری' میں شامل ہے۔ یہ تخلیق دراصل مثنوی کے فارم میں اپنے زمانے کی ہجو ہے۔ ادبی پیرائے میں سماج 'سیاست اور تمام معاصر مسائل پر قاضی سلیم نے اپنی برہمی اور تلخی کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس مثنوی میں طنز و استہزا کی لے کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی ہے۔ گو کہ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور سے شاعری کر رہے تھے اور اپنے معاصرین میں انھوں نے اپنی شناخت بھی بنالی تھی۔ لیکن انھیں باضابطہ طور پر مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت سے شمس الرحمٰن فاروقی نے 'نئے نام' کے تحت پیش کیا۔ 'نئے نام' میں ان کی تین نظمیں 'وائرس' 'وقت' اور 'بے نظر میری آنکھیں' شامل ہیں۔ 'نئے نام' اردو ادب میں رجحانات کی سطح پر ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا کہ نئے نام کے بعد سے جدیدیت کا رجحان تیزی سے عام ہوا۔ گرچہ اردو شاعری کے اس مختصر سے مجموعے پر بہت گفتگو ہوئی۔ حمایت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ حامیوں نے اسے جدید شاعری کا اصل نمائندہ قرار دیا تو مخالفین نے اسے چیستاں اور ترسیل و ابلاغ کا المیہ قرار دیا۔ لیکن قاضی سلیم کی شاعری بوجوہ ان سب الزامات کے باوصف اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے نام کے شاعروں میں قاضی سلیم کی شاعری نے سب سے زیادہ متوجہ کیا تو غلط نہ ہوگا۔

میرا جی چاہتا ہے میں یہاں ان کی مذکورہ تین میں سے دو نظمیں نقل کروں تا کہ ان کے شعری بساط کی ایک جھلک نظر کے سامنے آسکے۔ قاضی سلیم کی 'وائرس' ملاحظہ کریں......

ابھی ابھی تو لب ملے تھے کتنے پیار سے/ زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آگیا/ مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا/ ذرا سی دیر کے لیے پلک جھپک گئی/ تو راکھ کس طرح جھڑی

سنا ہے دور دیس سے/ کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آگئے/ جن کے تاب کار سحر کے لیے/ امرت اور زہر ایک ہیں/ اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں/ کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں

ہم ہوا کی موج موج سے/ درد کھینچتے ہیں چھوڑتے
ہیں سانس کی طرح
لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی/ رگوں میں جیسے
بددعائیں تیرتی ہیں پھانس کی طرح

مسیح وقت تم بتاؤ کیا ہوا/ دیو علم کے چراغ کا/
کیوں بھلا بپھر گیا/ دھواں دھواں بکھر گیا

سنو کہ چیختا ہے/ ''کام......کوئی کام''

کچھ نہیں/ جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک
لو/ اس نئے عذاب کو/ یا کروڑوں سال کے لیے/ خدا کی
آخری شکست تک/ سمندروں کی ریت چھانتے رہو

قاضی سلیم کی دوسری نظم 'وقت' کے عنوان سے، اس انتخاب میں شامل ہے، کچھ اس طرح ہے:

ایک' / پھر دوسری' / پھر تیسری'
اور اب تو پیہم/ گھڑ گھڑاہٹ کی مسلسل چوٹیں'
میرے اعصاب پہ پڑنے لگیں/ تب ریل کی رفتار بڑھی
بھاگتے پیڑ/ چٹانیں/ کھمبے
پاس سے گزرے تو آواز ملا کر چیخے
شور ہی شور ہے/ یہ شور مگر
اپنا اظہار ہے اثبات ہے ہر شے کے لیے
آسماں سرخ ہے/ اب بھی وہ ستارہ تنہا
نگراں ہے مرے ہر کرب کا/ یہ کہتا ہے
''عمر اک چیخ کی میعاد ہے/ تم بھی چیخو.....
اتنی شدت سے کہ مدت تک/ وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے''

آہنی پہیوں نے، فولادی زباں میں اپنی/ بات
دہرائی، یہ آواز تھی جانی بوجھی
ایسے مانوس تھے الفاظ جنھیں عمر تمام/ سنتے رہتے
ہیں مگر سیکھ نہیں پاتے ہیں
آج بھی دیر تلک سنتا رہا/ تاچے
ساعتیں/ شام اور سحر/ منزلیں کٹتی رہیں......وقت چلا
دھیرے دھیرے میری رگ رگ میں لہو کی گردش
دور و نزدیک بے درو کشاکش سے ملی/ گھڑ گھڑاہٹ
سے ہم آہنگ ہوئی
اب ہوں میں جزو اسی کا شاید/ آہنی پہیہ ہوں' اک
ایسا تسلسل ہوں/ کہ جس کے کوئی معنی ہی نہیں

پچھلی ضربات سے ہر ضرب نئی/ ایسے مل جاتی ہے
جیسے اس میں/ کسی احساس کا فریاد کا وقفہ بھی نہیں۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے یا پھر اسے قاضی سلیم کا منصوبہ بند پروگرام کہنا چاہیے کہ 1967 میں 'نئے نام' شائع ہوا جس میں ان کی ادبی انگڑائی کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور 1968 میں ان کا پورا مجموعہ 'نجات سے پہلے' شائع ہوا اور اسی کے ساتھ وہ عصری ادبی منظر نامے میں اپنا اہم مقام بنانے میں کامیاب رہے۔ یہ وہ دور تھا جب نظمیہ شاعری میں افتخار جالب، باقر مہدی، بشر نواز، بلراج کومل، بمل کرشن اشک، حمید الماس، راج نرائن راز، زبیر رضوی، شاذ تمکنت، سلطان اختر، شہاب جعفری، شہریار، عادل منصوری، کمار پاشی، محمد علوی، محمود ایاز، مخمور سعیدی، مصحف اقبال توصیفی، وحید اختر اور وہاب دانش جیسے اہم نام شامل تھے، اور جنھوں نے غزل گوئی پر نظم نگاری کو ترجیح دی لیکن ان میں سے بیشتر چیستانی اور لایعنیت کا بھی شکار ہوئے۔ 1968 کا ہی سال ہے جب قاضی سلیم نے ایک جلسے میں ایک ادبی منشور پیش کر دیا جس میں انھوں نے ایک طرح سے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں سے ہی بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ قاضی سلیم کو اپنا یہ ادبی منشور اس قدر عزیز رہا کہ جب 2003 میں یعنی پورے 35 سال بعد نورالحسنین کے اشتراک سے ایک سہ ماہی رسالہ 'دل رس' کا اورنگ آباد سے اجرا کیا تو اس رسالے میں پھر سے ایک بار اس منشور کو پیش کر دیا کہ ان کی نظر میں یہ ہر دور کے لیے قابل قبول ہے۔ راقم نے دل رس کے افتتاحی شمارے پر تبصرے کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اردو رسالوں کی یوں تو کمی نہیں' بلکہ کہیں تو اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ ایسے میں جب کبھی کوئی اچھا رسالہ نظروں سے گزرتا ہے تو فطری طور پر جی خوش ہوتا ہے۔ سرزمین دکن (وجد میموریل ٹرسٹ، نزد بھڑکل گیٹ' اورنگ آباد۔ 431001) سے جاری ہونے والا رسالہ 'دل رس' ایک ایسا ہی رسالہ ہے، جس سے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ یہ تشنگان ادب کو ایک طویل عرصے تک سیراب کرتا رہے گا کیوں کہ اس کے حلقۂ ادارت میں محترم قاضی سلیم اور برادرم نورالحسنین کے علاوہ ڈاکٹر مظہر محی الدین، محمد خواجہ معین الدین اور شاہ حسین نہری جیسے صاحبان علم و فن شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مجلس مشاورت میں اٹھارہ اصحاب کے نام بھی اس رسالے کی زینت بڑھا رہے ہیں جن میں بشر نواز اور م۔ ناگ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب یہ دونوں ہی راہی ملک عدم ہوئے۔

رسالے میں ایک خاص چیز اس کا افتتاحیہ ہے۔ جس کی وجہ سے رسالہ 'دل رس' کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ قاضی سلیم نے اپنے افتتاحیہ میں 1968 کے ایک جلسے میں جدید شاعری پر پیش کیے گئے اس چھ نکاتی منشور کو پھر سے پیش کیا ہے جسے قاضی صاحب نے ہر عہد کی اچھی شاعری کے لیے میزان سے تعبیر کیا ہے:

1۔ ذات اور شعور کی ساری پناہ گاہیں پاش پاش ہو کر بکھر گئی ہیں۔ اس جہنمی صورت حال سے نکلنے کے لیے پنڈورا کے صندوق میں ایک ہی امید بچی ہے اور وہ ہے آرٹسٹ کا ضمیر، اس لیے ہم تمام فلسفوں اور نظریوں میں آزاد ضمیر کے آگے جوابدہ ہیں۔

2۔ ہم زندگی کے دوسرے شعبوں کے متوازی، فن کے علاحدہ وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ اس میکانکی جبریت کے عہد میں ہم آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت پر گواہی دیتے ہیں۔

3۔ ہم مبہم تعمیمات (Vague Generalisation) کی بجائے اپنے ذاتی ردعمل کے مختصر اظہار کو فن کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہماری شاعری بھی ہماری صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہوگی۔

4۔ ہم گھسے پٹے درسی معیارات، سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفاظیوں کی بجائے اظہار و بیان کے ہر نئے امکان کو لبیک کہتے ہیں۔ اس لیے لفظ، استعارے، علامتیں یہ سب زبان کی توسیع کا وسیلہ ہوں گے۔

5۔ ہم ترسیل و ابلاغ کو فن کا ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ یہ چیلنج تخلیق کار اور قاری دونوں کے لیے ہوگا۔

6۔ ہم روایات کا احترام کرتے ہیں، چاہے وہ ہماری روایات

ہوں یا کسی اور زبان سے حسن و آہنگ کی صورت میں زمان و مکان کو پھلانگتی' ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

مندرجہ بالا منشور کے نکات پر بحث کی پوری گنجائش ہے اور ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس منشور میں قاضی سلیم نے آرٹسٹ کا ضمیر اور ضمیر کے آگے جواب دہی کی بات کی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایک فن کار کا اپنے ضمیر کے تئیں جوابدہ ہونا ہی اس کے سچے اور کھرا ہونے کی دلیل ہے۔ یہی وہ حد فاصل ہے جو فن کار اور غیر فن کار (یا نام نہاد اداکار) میں فرق کرتا ہے۔ یہی وہ ضمیر اور ضمیر کے آگے جواب دہی کا احساس ہے جو اس کے فن کو پائیدار، زندہ اور پائندہ بنا دیتا ہے۔ ادیبوں کے بھیس میں غیر ادیب کے فن پارے اسی وجہ سے بہت جلد بھلا دیے جاتے ہیں یا وہ خود طاق نسیاں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہاں قاضی سلیم کی مشہور و معروف نظم 'بے ضمیری' نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

زمیں گھومی/ ہوا بدلی/ چلو موسم بدلتا ہے
/سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
وہ دیکھو چیونٹیوں کے پر نکل آئے/ فضائے بیکراں میں
موت کی وادی میں
اڑتی پھر رہی ہیں آج کتنی بے نیازی سے
کہ جیسے مطمئن ہیں مکڑیوں کی سرفرازی سے
سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
تمھاری دور کی آواز کیسے گونج بن کر/ پلٹ آئی ہے
شاید بستیوں کے سبھی بارود گھر سیلے ہوئے ہیں
کوئی ہتھیار صحیح سالم نہیں ہے
نکیلے دانت' کانٹے' ڈنک' ناخن
حفاظت کے سبھی سامان جیسے چھن چکے ہیں
اندھیرے کی پناہ گاہوں میں
سحر سامری سے/ آج سب مبہوت ہیں
ہاتھ پاؤں ذہن سب مفلوج ہیں
سونے کا بچھڑا بولتا ہے
تبھی تو ظالموں سے درد کا رشتہ جڑا کر
خدا کی گود میں آرام سے سوتے ہیں جب سب پیمبر
یہ کس کا درد سہتے ہیں/ یہ کس کا پاس رکھتے ہیں
خود اپنی موت کی نظارگی کا زخم دے کر
درندوں کی نگاہوں سے
الوہی روشنی کی آس رکھتے ہیں
سلیم اب تم پہاڑوں سے اتر آؤ
تمہارے راز تم ہی جانتے ہو
یہ سب کچھ جھوٹ ہے' اک ڈھونگ ہے
ہم میں کوئی/ ایوب ہے' بدھ ہے' نہ عیسیٰ ہے
بس اتنا ہے/ تمہارا اپنا شیطان مر چکا ہے

اس نظم میں زمیں کا گھومنا، ہوا کا بدلنا، موسم بدلنا، پہاڑوں سے اتر آنا، چیونٹیوں کے پر نکل آنا، مکڑیوں کی سرفرازی، بارود گھر کا سیلنا، نکیلے دانت، کانٹے، ڈنک، ناخن وغیرہ علامات و استعارات سے شاعر نے کام لیتے ہوئے زمانے کی بے ضمیری پر بھرپور وار کیا ہے۔ اسی طرح ایوب، بدھ اور عیسیٰ کا صرف نام لے کر خوب صورت تلمیحات استعمال کیا ہے۔ اپنے خوب صورت ڈکشن، اسلوب اور پیرایہ اظہار کے سبب یہ نظم اس وقت کافی مقبول ہوئی تھی۔ گیان پیٹھ نے 1985 میں ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے انتخاب 'بھارتیہ کویتا ئیں' میں نظم بے ضمیری کو بطور خاص شامل کیا ہے۔

قاضی سلیم نے اس میکانکی جبریت کے عہد میں آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت پر زور دیا ہے۔ قاضی سلیم ترقی پسند تحریک کے دور میں بھی فعال تھے اور لکھتے پڑھتے رہتے تھے اور جب جدیدیت کا غلغلہ ہوا تو یہاں بھی وہ صف اول میں نظر آئے۔ ان کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو کشید کیا اور اپنے فن پارے کو اسی کشید کیے ہوئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی چنانچہ وہ نہ صرف آرٹ کی جمالیاتی اور سماجی ضرورت اپنے معاصرین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان کی شاعری بھی خود اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی نظم 'دوسری کربلا' اس پس منظر میں خاص اہمیت رکھتی ہے:

کوکھ صحرا کی کتنی ہری ہے
کیکٹس کے ابھرتے ہوئے ہاتھ/... ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں/ کانٹوں بھری انگلیوں سے
پھوٹتے— انگنت ہاتھ/—— ہاتھوں میں
کانٹوں بھری انگلیاں/ کیا تم نے دیکھے ہیں
وہ پیڑ جو بے زمیں ہیں/ اپنے ہی جسم میں دوڑتی
بے محابہ جڑیں/ پتھروں کی رگیں/ جانتی ہیں
روئیدگی کے خزانے/ شہیدوں کے خون میں
چھپے بارود خانے
اے خدا/ ہجرتوں کی گھڑی ہے
سرزمیں تیرے وعدے کی/— شاید قریب آ چکی ہے
کوئی جی کر دکھائے/ موت پر فتح پانے کے ارمان میں
یہ تو تیرا کرم ہے/ دیت کا دودھ اترا ہے
بگولوں کے پستان میں/ کینہ پرور ہواؤں کی سازش کو
—سب جانتے ہیں/ شاید اسی واسطے
آج اتنا لہو جسم میں جوڑ رکھا ہے
— جو چیرو تو اس زندگی کا/— ٹپ ٹپ گرے
کاٹتے جاؤ/ کانٹوں بھری انگلیوں سے
جسم سالم ابھر آئیں گے/ جسم سے پھوٹتے
انگنت ہاتھ/ ہاتھوں میں/ کانٹوں بھری انگلیاں

قاضی سلیم علامات اور استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں لیکن مبہم تعمیمات کے قائل نہیں۔ حالانکہ یہ ان کے دور کا غالب رجحان رہا۔ مبہم تعمیمات کے دور میں بھی اپنے ذاتی ردعمل کو ہی انھوں نے فن کی بنیاد قرار دیا۔ انھوں نے اسے ایک انتہائی خوب صورت تشبیہ کے ذریعے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہماری شاعری بھی ہماری صورتوں کی طرح مختلف اور منفرد ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایک طرح سے ترقی پسندی کی یکسانیت بورنگ اور اکتا دینے والے اور جدیدیت کے معمہ اور لایعنیت دونوں پر تنقید کی ہے۔

قاضی سلیم ہمیشہ اظہار و بیان کے ہر نئے امکان کے قائل رہے۔ چناں چہ انھوں نے گھسے پٹے درسی معیار اور سکہ بند انداز بیان اور زیبائشی لفاظیوں سے نہ صرف خود اجتناب کیا بلکہ اس کی تلقین بھی کی ہے۔ انھوں نے لفظ استعارے اور علامتوں کو محض زبان کی توسیع کا وسیلہ گردانا ہے۔

قاضی سلیم جس زمانے میں اپنی تخلیقیت کے عروج پر تھے اور اختر الایمان وغیرہ کے بعد ان کی شاعری کا شہرہ تھا، اس زمانے میں بھی انھوں نے اپنی تخلیق کو چیستاں نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر شاعر و ادیب چیستانی کے فیشن یا زعم میں ترسیل و ابلاغ کی ناکامی کا شکار ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں فیشن کے ساتھ رہتے ہوئے بھی فن کی ترسیل اور ابلاغ کے اس عصری چیلنج کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس سے نمٹنے کی بھرپور کوشش بھی ہے اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی رہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ان تمام مسائل سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی روایات کا پاس اور لحاظ رکھا بلکہ دوسری زبانوں کی روایات کو بھی عزیز جانا اور اس کے حسن آہنگ کو اپنایا جو بلاشبہ کبھی ترجموں کی صورت میں تو کبھی تبادلہ خیالات اور آدان پردان کے توسط سے ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ قاضی سلیم نے آزاد ضمیر کی یہ باتیں 1968 میں کہی تھیں لیکن آج 50 سال بعد بھی حسب حال لگتی ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جو قاضی سلیم کی معنویت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے۔

■

Dr. Abrar Rahmani
Tazeen Apt. Gali No-22,
Zakir Nagar, Jamia Nagar
New Delhi-25

مسعود جامی

اردو افسانے کے رجحانات

'اردو افسانے میں اولیت کا سہرا' جیسے موضوعات سے زیادہ اہم بات ہے کہ افسانے کی ابتدا کن حالات میں ہوئی اور اسے کن تحریکات و رجحانات نے متوجہ کیا۔ اس ضمن میں یہ بات مان لینی چاہیے کہ افسانہ جس عہد میں اردو میں آیا وہ رومانی تحریک اور حقیقت پسندی کے مابین کشمکش کا دور تھا۔ چند ایسے قلمکار تھے جو رومانی طرز کے افسانے لکھ رہے تھے اور داستانی فضا کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو حقیقت پسندی کی طرف مائل تھا۔ ساتھ ہی وہ حب الوطنی کے جذبے سے بھی سرشار تھا جس کی واضح مثال پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' ہے۔ افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں اپنی انفرادیت ثابت کرتے ہوئے انھوں نے شہری مسائل کو چھوڑ کر دیہی مسائل کو بیان کیا اور انھی اجزا کو 1936 میں ترقی پسندوں نے اختیار کیا اور پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے والوں نے اسی بنیاد پر اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اسی زمانے میں 'انگارے' کی شہرت خاص و عام میں ہوئی۔ اگر آج مجموعے میں شامل ان افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ ان افسانوں میں ایسی کوئی بات نہیں جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے لیے یہ نئی بات تھی۔ ان افسانوں میں سنجیدگی و متانت کے بجائے سماجی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زور آور تھا۔ 1936 کے قریب چند نئے اثرات و عوامل نے اردو افسانے کو نئے تناظر اور نئی وسعت سے روشناس کرایا۔ یوں تو حقیقت نگاری کی ابتدا پریم چند کر چکے تھے اور خود ان کے اعتراف کے مطابق انھوں نے ٹالسٹائی سے سادگی اور حقائق کی عکاسی سیکھی تھی اور انگارے کے مصنفین کا مقصد بھی یہی تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں پر چوٹ کی تھی۔ لیکن سماجی موضوعات پر ان کا رویہ جارحانہ اور سنسنی خیز تھا۔ ان کی بے اعتدالی خصوصاً جن موضوعات کے بیان میں اور ان کی باغیانہ بے باکی عام طور سے قابل قبول ثابت نہیں ہوئی لیکن اس سے حقیقت نگاری کی رفتار تیز ہوگئی۔

1936 کے لگ بھگ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی ہر چند کہ اس تحریک کی شکل شروع میں واضح نہیں تھی لیکن بعد میں اس کے نقوش واضح ہوتے چلے گئے۔ ترقی پسند تحریک، ادب کو زندگی اور عصر کے رواں منظرنامے کے مرکزی دھارے سے ملانے کی شائستہ اور حرکی قوت کا نام ہے جس نے غلامانہ سوچوں کی قدیم بوسیدہ اور شکستہ دیواروں کو مسمار کرکے ادب کو روشن فکر سے آشنا کیا۔ آزادی سے قبل اردو افسانے میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی ان کی فہرست طویل ہے۔ بیدی، غلام عباس، منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، عزیز احمد، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، کوثر چاند پوری، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے قبل اردو افسانے میں حقیقت نگاری کے کوئی واضح نقوش نہیں تھے۔ اور یہ بات بھی واضح رہے کہ مندرجہ بالا افسانہ نگار کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے ترقی پسندی سے الگ اپنی راہ بنائی۔ ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کے اصول کو وضع کیا۔ حقیقت پسندی سرسید کی عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر عینی و ماورائی نقطۂ نظر سے ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی۔ ترقی پسند ادب بڑی حد تک مقصدی ادب ہے لیکن مقصدی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں پروپیگنڈے کے عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں۔ حقیقت پسند تحریک کے قیام کے ساتھ ہی اس کے خلاف ایک ردعمل بھی سامنے آنے لگا۔ وہ افسانہ نگار جو ترقی پسندوں کے تصورات سے متفق نہ تھے روایت کے حوالے سے ہی لکھتے ہے۔ کچھ افسانہ نگاروں نے مغربی اثرات کے تحت نئی تکنیک، اسالیب اور فکری نیابت کا چلن اختیار کیا۔ اسی زمانے میں چند ایسے قلمکار بھی تھے جو جنس کے موضوع پر افسانے لکھ رہے تھے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں عسکری، ممتاز، عزیز احمد شامل ہیں۔ یہ افسانہ نگار Biological Naturlism سے متاثر ہیں۔ احمد ندیم اور غلام عباس نے سماجی موضوعات پر پنجاب کی علاقائی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ابوالفضل صدیقی نے جاگیردارانہ نظام اور شکار پر چند اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔

آزادی کے بعد تقسیم ہند اور فسادات کے جذباتی عناصر کے اثرات پر گفتگو کرنے کے لیے اولین سطح پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ اثرات خود کیا تھے۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ہزاروں سال سے متحد ایک خطہ ارضی کا مذہبی بنیاد پر دو حصوں میں منقسم ہوجانا تاریخ کا ایک انوکھا باب تھا۔ اس سانحہ کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا اور اسی پس منظر میں بہت سے افسانے تحریر کیے جانے لگے اور ادب کے موضوع میں فسادات، ہجرت کا کرب وغیرہ جیسے موضوعات بھی قلم بند کیے گئے۔ یوں تو تمام اصناف میں تقسیم ہند اور فسادات کی تاریخ محفوظ ہے لیکن افسانے نے جس طرح واقعات کو اکٹھا کیا ہے اس کی کوئی اور مثال دستیاب نہیں۔ یہ

افسانے کا ایسا دور تھا جب حقیقت پسندی عروج پر تھی۔ ترقی پسند تحریک نے جس قدر و معیار کے افسانہ نگار پیدا کیے وہ چہل پہل کسی دوسری صنف میں دکھائی نہیں دیتا۔ منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی ایسے ہی نام ہیں جو اسلوب میں ایسی قدرت رکھتے تھے کہ نہ صرف واقعات کو ان کی گہرائی میں جا کر دیکھ سکتے تھے بلکہ انتہائی جذبات و احساسات کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی اتر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کا کوئی بھی قابل ذکر افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے تقسیم ہند اور فسادات کو موضوع نہ بنایا ہو۔ تقسیم کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، قرۃالعین حیدر، قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی وغیرہ اہم ہیں۔

اس ضمن میں منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، قرۃ العین حیدر حیدر کا 'جلاوطن'، قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا'، احمد ندیم قاسمی کا 'پرمیشر سنگھ'، انتظار حسین کا 'بن لکھی رزمیہ' ناقابل فراموش افسانے ہیں۔ فسادات کے بعد، ہجرت کا کرب، افسانے کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ فسادات اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنے ہی خوف ناک کیوں نہ ہوں، ان کی نوعیت عارضی ہوتی ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ہجرت کے اثرات دوررس ہوتے ہیں اور یہ نسل در نسل صدیوں تک اپنے اثرات دکھاتے ہیں۔ Nostalgia یعنی شدید یاد ماضی کے افسانے جتنے انتظار حسین نے قلم بند کیے کسی دوسرے نے نہیں۔ قیوما کی دکان، خرید و حلوا بیسن کا، اجودھیا، محل والے اور سانجھ بھئی چودیس قابل ذکر افسانے ہیں۔ اس زمانے میں انتظار حسین کے افسانوں میں کہیں کہیں قطعی اور دوٹوک اسلوب بھی دکھائی دے گا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانہ نے بہت ترقی کی اور لازوال افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد ادب کا موضوع بدلا تو جدیدیت نے دھیرے دھیرے اپنا کام کرنا شروع کیا اور 1960 کے بعد اردو افسانے میں علامت اور تجرید جیسے اصطلاحات سنائی دینے لگے۔

جدیدیت، فرد کی داخلی جلاوطنی اور بے پناہی کی ترجمانی و تنقید ہے جس کے نتیجے میں فرد تنہائی، الجھن، بے گانگی، اجنبیت، بے معنویت، مہملیت اور بے زاری کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ان رجحانات کے اعتبار سے جدیدیت، فلسفۂ وجودیت کی توسیع ہے۔ وجودیت کی فلسفیانہ تحریک کا آغاز یورپ سے ہوا۔ اردو میں یہ اصطلاح انگریزی کے توسط سے آئی۔ اردو ادب میں اس اصطلاح کا استعمال ایک خاص عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فرسودہ اور گھسے پٹے مضامین کی بھرمار ہونے لگی تب ادیبوں کا ذہن نیا کچھ کرنے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ اسی اثنا تقسیم کا کرب انگیز سانحہ رونما ہوا۔ موضوعات میں خود بہ خود تبدیلی ہونے لگی۔ کھیت کھلیان سماجی نابرابری اور بورژوا طبقے کے ظلم و ستم کی جگہ ہجرت، فساد اور کیمپوں کی روداد سنائی دینے لگی۔ ادیب و شاعر ترقی پسند خول میں اکتاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگے۔ جنگ، امن، انقلاب اور معاہدہ جیسے الفاظ ذہنوں پر بوجھ بننے لگے۔ ایسے میں نئی نسل کے ذہن میں روایت سے انحراف کے جراثیم کلبلانے لگے اور ادبی رجحان کی تلاش شروع ہوئی جس میں فرد کی فردیت کو اولیت حاصل ہو۔ نئی نسل کی اس خواہش کے عین مطابق جدیدیت کا رجحان سامنے آیا۔ جدیدیت نے ابتدا میں خاموش رہ کر اور بعد میں پوری قوت کا استعمال کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک اور اس کے موضوعات کی مخالفت شروع کی۔ جدیدیت ایک ایسا رجحان ہے جس کی کچھ زیادہ ہی مخالفت ہوئی۔ بعض ناقدین نے اسے منفی رجحان قرار دیا تو بعضوں نے سرے سے ہی مسترد کر دیا۔ اردو کی تمام اصناف میں صنفِ نظم اور صنفِ افسانہ پر یہ رجحان سب سے زیادہ اثر انداز ہوا۔ دونوں ہی اصناف بیانیے کی صورت ہیں۔ اگر صرف افسانوں کی بات کریں تو ناقدین نے صرف مواد کو بنیاد بنا کر اعتراضات کیے کیونکہ اس کے مواد بعید از فہم تھے۔ جدیدیت کے تحت لکھے گئے افسانوں میں بلراج مین را کے ہاں 'کمپوزیشن سیریز کے افسانے'، سریندر پرکاش کے ہاں 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'، 'رونے کی آواز'، 'سرنگ'، 'برف پر مکالمہ'، انتظار حسین کے ہاں 'آخری آدمی'، 'زرد کتا'، 'کایا کلپ'، جوگندر پال کے ہاں 'رسائی'، 'بازیافت'، انور سجاد کے 'کونپل' اور 'گائے'، خالدہ اصغر کے 'سواری' اور 'ایک بوند لہو کی'، غیاث احمد گدی کا 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی'، بلراج کومل کا 'کنواں'، دیویندر اسر کا 'کالی بلی'، کمار پاشی کا 'ڈاچی والیا'، انور عظیم کا 'کھوپڑی' اور قمر احسن کا 'اسپ کشت مات' وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔

ستر کی دہائی میں اردو افسانہ رومانیت، حقیقت نگاری، ترقی پسندی اور جدیدیت کا سفر کرتے ہوئے مابعد جدیدیت Post Modernism کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ ایک طویل عرصے میں اس صنف میں بہت نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ موضوع کی سطح پر بھی اور ہیئت کی سطح پر بھی۔ جدیدیت کے دور میں حد ہی ہوگئی جب اردو افسانہ معمہ بن گیا۔ اسی لیے جدیدیوں کے خلاف یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے افسانے کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا جدیدیت سے متاثر فن کاروں نے پہلے کہانی سے کہانی کو نکالا، پھر کردار کو نکالا، اس کے بعد منظر نگاری کو بدلا، آغاز کو نکالا، نقطۂ عروج کو نکالا، پھر ہوتے ہوتے قاری کو نکالا۔ کہانی میں ان چیزوں کے نکل جانے کے بعد کہانی میں صرف افسانہ نگار رہ گیا۔ ستر کی دہائی کے باشعور فن کاروں نے جب محسوس کیا کہ ایسے افسانوں کا کوئی مستقبل نہیں جو ابہام، اشکال اور تجرید پر مبنی ہو۔ لہٰذا ایسے فن کار جو جدیدیت کے تحت افسانے لکھ رہے تھے ایسے فن پاروں سے انحراف کیا جو لایعنی تھے، جن کے قاری ناپید تھے اور جو ذاتی علامات اختراع کر کے لکھ رہے تھے۔ ایسے فن کاروں کی فہرست کافی طویل ہے جن میں شفق، شموئل احمد، شوکت حیات، مظہر الزماں خاں، سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی، حسین الحق، طارق چھتاری اور خاکسار کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مابعد جدیدیت، جدیدیت کی ضد نہیں البتہ الگ ضرور ہے اور اس کے بنیادی عناصر منحرف بھی ہیں۔ مابعد جدیدیت ان بنیادوں کو کالعدم کرتی ہے جن پر جدیدیت کا انحصار ہے۔ یعنی بیگانگی، شکست ذات، حد سے بڑھی ہوئی داخلیت، لایعنیت اور غیر ضروری ہیئت پرستی جو ابہام، اشکال اور رعایت لفظی سے آگے نہیں بڑھتی۔

نئی صدی کی افسانوی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو چند نئے اور کثیر تعداد میں پرانے افسانہ نگار نظر آتے ہیں جنھوں نے تشدد و جبر کے حوالے سے عمدہ کہانیاں رقم کی ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں کئی نام اہمیت کے حامل ہیں اور جنھوں نے نئے زمانے کی چیرہ دستیوں کو نہایت خوبی سے برتا ہے ان میں شاہد اختر کا 'کتے'، احمد رشید کا 'بھوت'، صغیر رحمانی کا افسانہ 'داڑھی'، محمد حامد سراج کا 'گلوبل ولیج'، شبیر احمد کا 'چوتھا فنکار'، احمد صغیر کا 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'، طاہرہ اقبال کا 'ماں ڈائن' اور خاکسار کے افسانے 'مارتھا' اور 'منیا' وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ نئی افسانوی صورت حال نئے موضوعات کا احاطہ وسیع پیمانے پر کر رہی ہے اور نئے لکھنے والوں میں حالات حاضرہ سے آنکھیں ملانے کی صلاحیت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔

■

Dr. Masood Jami
I/C Jamia Enclave, Jamia Nagar, Kadru
Ranchi-834002 (Jharkhand)

مراسلہ نگاری اور ذرائع ابلاغ

بدر محمدی

زندگی کی بقا فطرت زندگی سے ہے اور انسانی زندگی کی اہم فطرت آبادی کے درمیان زندگی گذارنا ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم باہمی رابطہ بنائے رکھنا ضروری ہے ورنہ کاروبار زندگی منجمد ہو جائے۔ ایک دوسرے کی خبر گیری تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ ضروریات زندگی کے لیے لوگ پھیل رہے ہیں تو آپسی رابطے کے سبب دنیا سمٹ رہی ہے۔ یہ رابطہ ان دنوں مختلف ذرائع سے ممکن ہے، جنھیں ذرائع ابلاغ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ پر انسان کی روزمرہ کی زندگی کا انحصار سا ہو گیا ہے کیونکہ یہ عوام کو باخبر، بیدار اور بہرہ ور کرتے ہیں۔ خبروں سے آگاہی کے علاوہ مختلف شعبۂ حیات کی معلومات بھی ان سے فراہم ہوتی ہیں۔ چنانچہ بود و باش، طور طریقے اور خیالات کو ایک دوسرے سے روشناس کرا کے باہمی اتحاد، انسیت اور اخوت کے جذبے کو ذرائع ابلاغ نے فروغ دیا ہے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھنے کا ہمیں موقع ملا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک رہنے لگے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اب ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

فرد کی ذاتی خبر رسانی میں ان دنوں ٹیلی مواصلات کی بالا دستی ہے۔ ان کے ذریعے آن کی آن میں خبر پہنچ جاتی ہے۔ تاہم خطوط نویسی کی اہمیت اپنی جگہ آج بھی مسلم ہے۔ مراسلہ جتنا پر معنی اور پہلودار ہے ٹیلی مواصلات قطعی نہیں۔ خط کو آدھی ملاقات یونہی نہیں کہا گیا ہے۔ زبان و بیان کی خوبیاں مراسلے کو مکالمہ بنا دیتی ہیں۔ ''کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے'' صرف خط نویسی سے ہی ممکن ہے۔ فون میں دوران گفتگو دماغ کا دخل ہوتا ہے جبکہ مراسلے میں دم تحریر دل کی پاسداری ہوتی ہے۔ وہ لمحاتی اور یہ دائمی چیز ہے۔ ٹیلی وسیلہ کارگذار شے ہے جبکہ مراسلہ یادگار ورثہ۔ ڈاک و تار کا شعبہ بظاہر ٹھہرا سا لگتا ہے۔ لیکن واقعتاً آج کی تاریخ میں یہ زیادہ رواں دواں ہے۔ فیکس، ای میل، فیس بک، واٹس ایپ اور ٹیوٹر نے اسے مزید تیز گامی عطا کی ہے۔ مراسلہ نگاری کی اہمیت و افادیت بدستور قائم و دائم ہے۔ فیس بک اور واٹس ایپ کی اطلاعات، کمینٹ، سوال و جواب، تبادلۂ خیالات یہ سب مراسلے بازی کا حصہ ہیں۔ مذکورہ سوشل میڈیا ایک دوسرے کو جوڑنے کا کام کر رہے ہیں۔

مراسلے نے سرکاری غیر سرکاری کاموں میں اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔ تقرری ہو یا استعفا، شکایت ہو یا مطالبہ، مراسلے کے توسط سے ہی یہ چیزیں منظر عام پر آتی ہیں۔ دفاتر کے اعلانیہ خط کے ذریعے ہی مشتہر کیے جاتے ہیں۔ مراسلہ نگاری فقط نصاب تعلیم کا حصہ نہیں بلکہ اس کی ضرورت متعدد شعبہ ہائے زندگی میں ہے، حتیٰ کہ خود ذرائع ابلاغ مراسلوں کے محتاج ہیں۔ انھیں خاص و عام کے مراسلوں کا بڑے شد و مد سے انتظار رہتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ مراسلے کے توسط سے تخلیقات کی فراہمی ہوتی ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی کارکردگی پر عوام کی گرانقدر رائے حاصل کی جاتی ہے۔ مراسلہ ذریعۂ ابلاغ کا آئینہ ہے جس میں اس کی شکل وصورت نظر آتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی مقبولیت کا اندازہ عوام کی پسند و ناپسند سے ہوتا ہے۔ یہ پسند و ناپسند مراسلے کے توسط سے ہی دستیاب ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اثرات کس قدر عوام پر اثر انداز ہوئے یہ تبصرہ سے ہی پتہ چلتا ہے۔

اپنے الجھے سلجھے بالوں کو ہر شخص آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ ان کی آرائش و زیبائش کی جا سکے یہی کام عوام کے مراسلے سے ہوتا ہے۔ اس سے مضمون نگار حوصلہ پاتا ہے اور رہنمائی بھی حاصل کرتا ہے۔ اہل کاروں کو اپنی کارگذاری مزید بہتر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ زبان خلق نقارۂ خدا کے مترادف ہے۔ لہٰذا ذریعۂ ابلاغ کی خدمات کا محنتانہ تب وصول ہوتا ہے جب عوام میں اس کے رد و قبول کا پتہ چلتا ہے۔ مراسلہ حمایت میں بھی لکھا جاتا ہے اور مخالفت میں بھی۔ ذرائع ابلاغ کو اپنی خوبی و خامی کا اندازہ خود نہیں لگتا۔ لہٰذا وہ عوام الناس کے تبصروں پر مبنی مراسلہ نما آئینہ سے اس کے احتساب کی سعی کرتے ہیں۔ اخبارات و رسائل نے اس کے لیے کالم مخصوص کر رکھا ہے۔ جبکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ہفتہ وار پروگرام ہوا کرتا ہے اور پتہ بتا کر خط لکھنے کی درخواست کی جاتی ہے کہ پروگرام کیسا لگا؟ بار بار اصرار کیا جاتا ہے گذارش کی جاتی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔ یعنی اظہار خیال کی کھلی دعوت دی جاتی ہے۔ اظہار خیال کی کھلی دعوت کس طرح دی جاتی ہے اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

''صحت مند تبصرہ کسی بھی رسالے کو جلا بخشنے اور اسے مزید بہتر بنانے میں مددگار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر شمارے کے بعد ہمیں باذوق قارئین کے تبصروں اور تجزیوں کا انتظار رہتا ہے۔ اس لیے اپنے تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کرتے رہیں۔ یہ قارئین کی ادبی ذمہ داری بھی ہے اور ان کی محنت اور خلوص کا نذرانہ بھی۔''

(اداریہ 'ایوان اردو' ستمبر 2016)

''ہماری کوشش یہی رہتی ہے کہ نئے نئے موضوعات پر عمدہ مضامین شائع کیے جائیں۔ ہمیں اس میں کتنی کامیابی ملی ہے یہ آپ کے تاثرات سے اندازہ ہوگا...... اس تعلق سے آپ کے گرانقدر مشوروں کا ہمیں انتظار رہے گا۔''

(اداریہ 'فکر و تحقیق' اکتوبر تا دسمبر 2016)

''قارئین کے خطوط ہمارے لیے میزان کا کام کرتے ہیں ہم اپنی کاوشوں کو اس میزان پر تولتے رہتے ہیں، ساتھ ہی ہم اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

(اداریہ 'زبان و ادب' پٹنہ جنوری 2017)

''میں اپنے احباب سے بصد ہو کر اس بات کی درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے فون، ایس ایم ایس اور ای میل کی بجائے خط لکھیں اور اپنی محبت کا ثبوت ارزاں کریں۔''

(اداریہ 'سرسبز' جنوری تا مارچ 2017)

''ہمیں قطعی کوئی دعویٰ نہیں کہ ہم نے کوئی بہت اہم کام انجام دیا ہے۔ زیر نظر شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم نے اس شمارے میں روایت سے ذراہٹ کے کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شمارہ حاضر ہے اسے پڑھنے کے بعد آپ کی جو بھی رائے ہو بلا جھجک ہمیں اس سے ضرور مطلع

کریں۔'' (اداریہ آج کل ڈائمنڈ جوبلی نمبر جولائی 2017)

قاری یا سامع کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ گونا گوں مضامین پڑھ کر یا پروگرام سے محظوظ ہو کر اس پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں انھیں وہ قلم بند کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح مشاعرے میں سامع کی واہ واہ بے ساختہ نکل پڑتی ہے ذرائع ابلاغ کی پیش کش پر عوام کو لب کھولنے کی چاہت ہوتی ہے۔ اس سے قاری یا سامع میں رائے زنی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ خود کو فعال ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ مراسلے کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ مراسلے سے ذریعۂ ابلاغ کی رہنمائی ہی نہیں تشہیر بھی ہوتی ہے۔ اچھی پیش کش کی تعریف اور پھسلے پن کی شکایت یعنی کارکردگی کی کمی بیشی پر اظہار خیال کر کے عوام اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ کیونکہ ایک اچھے شہری کی یہی صفت ہے۔ یہ درست ہے کہ دفتر تک پہنچنے والے سارے مراسلے منظر عام پر نہیں آتے لیکن دل کی بھڑاس تو نکلتی ہے۔ اور کتنے ایسے ہیں کہ ان کے دل میں بات آتی تو ہے مگر وہ صفحۂ قرطاس تک نہیں پہنچ پاتی۔ لیکن ہر فرد پر اثر مرتب ضرور ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی مراسلے لکھے جاتے ہیں جو غیر ضروری ہوتے ہیں۔ ایسی تحریر کا مقصد محض مبصرین میں شامل ہونا رہتا ہے۔ کچھ لوگ تنقید سے زیادہ تنقیص پر زور دیتے ہیں تو کچھ لوگ ضرورت سے زیادہ تعریف پر۔ دونوں طریقے نا مناسب ہیں۔ مراسلے کو حقیقت کا آئینہ دار اور غیر جانبدار ہونا چاہیے نہ کہ طرفدار یا مخالف۔

ذرائع ابلاغ اور مراسلہ نگاری میں گہرا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محرک ہیں۔ یہ رشتہ دراصل ذرائع ابلاغ اور عوام کا رشتہ ہے۔ مراسلہ نگاری ذرائع ابلاغ کی زندگی سے عبارت ہے۔ ان کی شریانوں میں اس سے خون دوڑانے کا کام لیا جاتا ہے۔ ویسے ذرائع ابلاغ کا عوام سے تو رشتہ ہوتا ہی ہے مگر مراسلہ نگاری سے مزید رابطے کا پتہ چلتا ہے۔ کسی رسالے کے اگلے شمارے کا انتظار یہ دیکھنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے کہ گذشتہ شمارے میں شائع شدہ تحریر پر ردعمل کیا ہے گویا مراسلہ خوش یا مایوس بھی کرتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کا مقصد و منشاء اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان سے مقامی فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ انھیں ابھرنے اور فروغ پانے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن سارے لوگ تو فنکار ہوتے نہیں۔ لہٰذا فنکارانہ صلاحیت کی یہ کمی مراسلہ نگاری سے پوری ہو جاتی ہے۔ جو مضمون نہیں لکھ سکتے مراسلہ ہی تحریر کر کے تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم بہت سارے مراسلوں میں دیکھتے ہیں کہ ان میں تخلیقی اور فنکارانہ رنگ ہوتا ہے، مضمون کا سانکس پایا جاتا ہے۔ اور پھر خط لکھتے لکھتے وہ جناب مضمون بھی لکھنے لگتے ہیں۔ بہت سے صاحب مضمون بھی مراسلہ لکھ کر اپنے تاثرات ارسال کرتے ہیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ افراد کو شرکت کا موقع ملتا ہے۔

مراسلے معیاری اور غیر معیاری بھی ہوتے ہیں۔ ایک ہی فرد کے مراسلے کا معیار مختلف رسائل میں الگ الگ ہوتا ہے۔ مراسلے کی تنقیدی حیثیت بھی ہے۔ یہ ناقدانہ رائے پیش کرتا ہے۔ اس سے تنقیدی رجحان کو فروغ ملتا ہے۔ اسے نقد و تبصرہ سے موسوم کیا جانا بے جا نہیں۔ اس عمل کو علمی خراج کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مراسلے کی صورت میں جو رائے منظر عام پر آتی ہے وہ قاری کی رائے ہوتی ہے۔ ادیب بھی مراسلہ قاری ہی کی حیثیت سے لکھتا ہے۔ مراسلہ شائقین ادب کے ردعمل کی اطلاع بلا معاوضہ قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اسے تصحیح نامہ یا مطلق تعریف کا حصہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ کھرے کھوٹے کی پہچان کراتا ہے۔ دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے۔ اپنی کارکردگی کی خود ستائی یا اپنی خامیوں کا محاسبہ خود ممکن نہیں لہٰذا مراسلوں کے ذریعے یہ کام عوام کے توسط سے کرایا جاتا ہے۔ عوام کی رائے سے مضمون اور صاحب مضمون کا مقام متعین کیا جاتا ہے اور وابستگان ذرائع ابلاغ اس سے صاف صاف بچ جاتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر دامن جھاڑ لیتے ہیں کہ مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے۔

ذریعۂ ابلاغ کو ارسال کیا گیا مراسلہ عوام سے عوام کا رشتہ استوار کرتا ہے۔ میری مراد قلمی دوستی سے نہیں بلکہ اس لامتناہی سلسلے سے ہے جو مراسلہ نگاری سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کے متعدد روزناموں میں ایسے معرکے دیکھے گئے ہیں کہ مراسلہ کا دوطرفہ جواب در جواب کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مدیر مخل ہو کر اسے روک دیتے ہیں ورنہ یہ قلمی جنگ دیر تک اور دور تک چلتی رہے۔ واضح ہو کہ یہ معرکہ آرائی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتی۔ اخبارات و رسائل خطوط فراہمی کے اور بھی طریقے اپناتے ہیں۔ مثلاً کوئی موضوع منتخب کر کے اس پر رائے عامہ طلب کی جاتی ہے۔ اور ان گرانقدر آرا کو مشتہر کیا جاتا ہے۔ حوصلہ بخش کلمات اور افادیت آمیز تاثرات سے راہیں سہل ہو جاتی ہیں۔ قاری کی رائے کی روشنی میں رسالے کو مزید بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح کا کام ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ہوتا رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ محکمۂ ڈاک کی خدمات انجام دے کر عوام کے مابین پیغام رسانی کا کام بھی کیا کرتے ہیں۔ چند سال قبل عراق پر امریکی حملے کے دوران اس طرح کا پروگرام بی بی سی ریڈیو پر چلایا گیا تھا۔ خلیج میں مقیم ایشیائی لوگ اور ان کے لواحقین کے مابین خبروں کا تبادلہ اور خیریت کی بھرپور آگاہی کی گئی تھی۔

ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر فون سے بھی پیغام اور خیالات بھیجے جاتے ہیں مگر خط سے جو بیان ارسال کیا جاتا ہے اس کی بات جداگانہ ہوتی ہے۔ دونوں کا فرق سامعین و ناظرین واضح طور پر سمجھتے ہیں۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مراسلہ نسبتاً زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ ای میل، فیکس، فیس بک، واٹس ایپ اور ٹیوٹر کی صورت میں ہی سہی مگر مراسلہ چیزے دیگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس الیکٹرانک عہد میں بھی ذرائع ابلاغ خطوط نویسی کی صنف کو زندہ جاوید رکھنے کی کامیاب کوشش کیے ہوئے ہیں۔ مراسلے کے حوالے سے مراسلہ نگار نہ صرف اپنا تعارف پیش کرتا ہے بلکہ تعریفی پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس کے اس عمل سے ذریعۂ ابلاغ کے دائرۂ کار کا پتہ چلتا ہے کہ کتنی دور تک اس کی پہنچ ہے؟ ذرائع ابلاغ سے زبان کا بھی فروغ ہوا ہے اور زبان سے ذرائع ابلاغ کو فائدہ پہنچا ہے۔ چنانچہ زبان اردو اور ذرائع ابلاغ کا رشتہ مستحکم ہے۔

مراسلہ نگاری اور ذرائع ابلاغ ایک دوسرے سے گہرے طور پر مربوط ہیں مگر ایسا نہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ذرائع ابلاغ کے بغیر بھی مراسلہ نگاری رواں دواں رہے گی اور مراسلہ کے بغیر ذرائع ابلاغ ختم نہیں ہو جائیں گے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ عوام کے مراسلوں کے بغیر ذرائع ابلاغ متاثر ضرور ہوں گے اور یہ بات اس کی اہمیت و افادیت کے لیے کافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے لیے مراسلے کی وہی اہمیت ہے جو زبان کے لیے قواعد کی۔ چنانچہ مراسلہ نگاری ذرائع ابلاغ میں محض خانہ پری کے لیے مقبول نہیں بلکہ اس کے خیر مقدم کا سلسلہ ضرورتاً جاری و ساری ہے۔ اس کا دوطرفہ افادی پہلو ہے۔ اور اس عمل میں کچھ کام کی بات بھی ہو جاتی ہے۔ بہت سے مشورے بروئے کار آتے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ مراسلے سے عوامی فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ حالات کا منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت تک اپنی بات پہنچائی جاتی ہے۔ ذاتی یا اجتماعی مسائل کی طرف حکام کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ اس طرح ذرائع ابلاغ کو ارسال کیے گئے مراسلوں سے نہ صرف عوام سے عوام کا رشتہ ہموار ہوتا ہے بلکہ عوام کا حکومت سے براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔

■

Badr Mohammadi
AT - Chandpur Fatah
P.O. - Bariarpur - 843102 (Bihar)
Cell-9939311612
E-mail:badrmohammadi1963@gmail.com

نقد و نگاہ

ندیم احمد ندیم

اردو گیت کا سفر بحوالہ پنجاب

پانچ دریاؤں کے آب زلال سے سرسبز و شاداب سرزمین، پنجاب ہمیشہ سے ذکر وفکر کا مرکز رہی ہے۔اس کی زرخیزی ذہن ودل کو پاکیزگی اور روئیدگی عطا کرتی ہے اور اسی بالیدگی سے علم وعرفان کی کہکشائیں منور ہوتی چلی جاتی ہیں۔یہی سبب ہے کہ اس پنجاب نے ایسے بالغ النظر اور بیدار مغز انسان پیدا کیے جو بے شمار لوگوں کی فیضیابی کا باعث ہوئے۔لفظ 'پنجاب' زبان پر آتے ہی اس کرۂ ارض کا تصور ذہنی کینوس پر رقص کرنے لگتا ہے جہاں آب زلال کے ہنستے گاتے، جھاگ اڑاتے مست دریا اپنی تمام تر قوت وتابانی کو سنگیت کی ایک مدھر لے میں پرو دیتے ہیں۔رقص ونغمہ پنجابیوں کے خون میں اسی طرح شامل ہے جس طرح سرخ وسفید خلیے۔مستی سے بھگتی تک اور بھگتی سے مکتی تک گیت وسنگیت پنجابیوں کی منفرد پہچان ہے اور یہی سنسکرتی اور تہذیب ہندوستان کی ترجمان بھی ہے۔

گیت شدت جذبات وخیالات کا غنائی اظہار ہے۔اس لیے یہ خالص داخلی صنف سخن ہے یعنی اس میں کسی جذبے، خیال یا کیفیت کو پر سوز و بے ساختہ الفاظ وآہنگ کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔اس میں کسی طرح کی ساخت وبناوٹ نہیں ہوتی بلکہ یہ صاف وشفاف جھرنے کی مانند اپنے قدرتی بہاؤ کی طرف بہتا چلا جاتا ہے یعنی گیت من کی موج ہے، ہوا کا جھونکا ہے۔اس میں کسی طرح کی تصنع وپرکاری کا دخل نہیں ہوتا۔رنج وغم، انبساط وخوشی کے بے ساختہ پل گیت میں ابھر آتے ہیں اور ہر ذی شعور اور صاحب جبلت اس کی رو میں خود بخود بہتا چلا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں کی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ گیت ایک غنائی اور نسوانی صنف سخن ہے جس میں ایک فراق زدہ عورت ہجر ووصال کی باتیں بیان کرتی ہے۔خاص طور پر ہجر کو برہ یا برہا سے موسوم کرتے ہوئے اپنے محبوب کی جدائی سے پیدا ہونے والی تڑپ وکسک کو عالم تنہائی میں بے ساختہ گنگناتی یعنی اس کے دل کا درد سوز وگداز میں ڈھل جاتا ہے۔اور گیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔گیت کے وجود یعنی جذبے، خیال اور الفاظ میں صوتیت، غنائیت اور نسوانیت کی آمیزش بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔عورت کی دلآویز شخصیت کسی اور صنف میں اتنی اجاگر نہیں ہوتی جتنی کہ گیت کے رنگ وآہنگ میں ڈھل جاتی ہے۔

ہمارے صوفیوں نے اس روایت کو ایک نیا انداز دیا۔ انھوں نے بھی اپنے گیتوں میں وجود زن کو مقدم رکھتے ہوئے، اپنے آپ کو عورت تصور کرتے ہوئے اور عشق حقیقی کی سرشاری وبے قراری کو برقرار رکھتے ہوئے خدائے برتر کو ہی کبھی اپنا مرد معشوق مان لیا،تو کبھی شفیق باپ مانتے ہوئے اپنے جذبات کا برجستہ اظہار کیا بلکہ کچھ صوفیوں نے تو لمبے بال رکھے، مانگ نکالی، بالے پہنے اور یہاں تک کہ زنانہ لباس زیب تن کیا اور اپنے دل کی تڑپ کو بیان کرنے کے لیے گیتوں کا سہارا لیا۔نسوانیت کا یہی پہلو گیت کو دل خوش کن بناتا ہے۔

بدلتے وقت کے ساتھ گیتوں نے بھی کروٹ بدلی اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی سمیٹنا شروع کیا۔آج کا گیت زندگی کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہی خوبی گیت کی ترقی اور مقبولیت کا باعث ہے۔

اگر فن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو 'گیت' میں نہ تو بحروں کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی بحر کی ہیئت وتکنیک یا ساخت کی۔گیت کسی بھی وزن اور فارم میں لکھا جا سکتا ہے۔مضمون کے اعتبار سے گیت کی مختلف قسمیں سامنے آتی ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔'گیت' خالص ہندوستانی لفظ ہے اور سنسکرت کے لفظ 'گیتا' سے ماخوذ ہے۔اس لیے گنگا جمنی زبان کا استعمال بھی اس کی منفرد خاصیت ہے۔گیت کا مزاج فطرتاً ہجر وفراق کی بے چینی وبے قراری ہے۔

امیر خسرو ہندوستانی علوم وفنون کے امام کہے جا سکتے ہیں۔انھوں نے نہ صرف اردو زبان (ریختہ) کی ترویج وترقی میں اہم رول ادا کیا بلکہ مختلف اصناف سخن کے تعلق سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔انھوں نے اپنے زمانے کی عام بول چال اور صوفیوں کے اسلوب اور پیرائے میں دلی جذبات کا اظہار کیا تو جو فنی پیکر وجود پذیر ہوئے انھیں گیت کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے۔

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
نہ نیند نیناں، نہ انگ چینا، نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

اور اسی طرح 'کاہے کو بیاہی بدیس رے' بھی خسرو سے منسوب ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ہی اردو گیت کی بنیاد رکھی اور پھر اس کے بعد بہت سے نام اس فہرست میں شامل ہوتے چلے گئے جن میں قلی قطب شاہ، ملا وجہی، عادل شاہ، ولی دکنی، افضل جھنجانوی، عزلت، واجد علی شاہ، امانت لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، آرزو لکھنوی، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، میرا جی، قیوم نظر، الطاف مشہدی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، زبیر رضوی، ندا فاضلی، بیکل اتساہی، گلزار اور جاوید اختر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جب ہم گیت کے سلسلے میں پنجاب کا رخ کرتے ہیں تو سب سے پہلا اور بڑا نام محمد افضل جھنجانوی یا افضل پانی پتی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔مولانا افضل پانی پتی (متوفی 1035ھ) بظاہر 'بکٹ کہانی' کے مصنف کے طور پر شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کے بارہ ماسہ کا مطالعہ کرنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں گیت نگاری کے تمام تر لوازمات وافر مقدار میں موجود ہیں۔نہ صرف ان کے خیالات والفاظ بھی گیت کے عین مطابق ہیں بلکہ ان کا طرز بیان اور زبان خالص گیت والی ہے۔ بقول

پروفیسر نورالحسن نقوی ''شمالی ہندوستان میں جو بارہ ماسے لکھے گئے ان میں گیت کی فضا غالب ہے۔''

اردو شاعری میں شمالی ہندوستان کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمود شیرانی اپنی اہم تصنیف 'پنجاب میں اردو' میں لکھتے ہیں کہ'' ہمارے مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری ولی دکنی کی آمد اور محمد شاہی دور تک وجود میں نہیں آئی تھی لیکن محمد افضل کے دوازدہ ماہے کی روشنی میں ہمیں اس عقیدہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے''۔(صفحہ نمبر 174)

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دکن کے ساتھ ساتھ شمالی ہندوستان بھی شعروادب کا مرکز رہا ہے اور دوسرے یہ کہ ابتدائی اردو اصناف میں گیت بھی خاص اہمیت کا حامل ہے جس کا ایک اچھا نمونہ افضل پانی پتی کا بارہ ماسہ ہے۔

'بکٹ کہانی' دراصل ایک ایسا بارہ ماسہ ہے جس میں ایک ہجرزدہ عورت اپنے محبوب (خاوند) کے ہجر میں اپنی سکھیوں سہیلیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے دلی کیفیات کو المناک انداز میں گنگناتی ہے اور ہر ماہ کے بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے قصہ محبت وغم کو دلگداز آواز میں دہراتی ہے۔

سنو سکھیو! بکٹ میری کہانی   بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کو سکھ دن، نہ نیند راتاں   برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
نہیں اس درد کا دارو کسی کن   تھکے حیراں سبھی حکما، ذوفن
اری جس شخص کوں یہ دیولاگا   سیاناں دیکھ اوس کو دور بھاگا
اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے   کہ جسکی آگ میں سب جگ جلا ہے

اور پھر جب ساون کا مہینہ آتا ہے تو جذبات کچھ یوں کروٹ لیتے ہیں۔

اری جب کوک کوئل نیں سنائی   تمامی تن بدن میں آگ لائی
سوتی جب مور کی آواز بن سو   شکیب از دل شدو آرام تن سوں
چلا ساون وگر ساجن نہ آئی   اری کن سوکنی تونی چلائی

پھر بھادوں کی گرمی کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتی ہے۔

سکھی بھادوں تپت بھوتی پری ری   تمامی تن بدن میرا جری ری
پیا پردیس جا ہم کو بسارا   بخالوں کیا گنہہ دیکھا ہمارا

اور پھر آگے کہتی ہے۔

سنو سکھیو کہ رت آسوج آئی   پیاری کی خبر اب یک نیائی
لکھوں پتیا ارے کاگ لیجا   سلونی سانوری سندر پیا پا

لاہور، سیالکوٹ اور پانی پت کے علاوہ جالندھر بھی اہم ادبی مرکز رہا ہے۔موجودہ دور میں پنجاب سے شائع ہونے والا واحد اردو اخبار'ہند سماچار' آج بھی جالندھر سے نکل رہا ہے اور بہت سی ادبی انجمنیں آج بھی اپنی ادبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ گیت کے سلسلے میں بات کریں تو تین اہم نام اسی مردم خیز شہر سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ہیں حفیظ جالندھری، مخمور جالندھری اور ضیاء جالندھری۔ ان میں موخرالذکر دو کا تعلق سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ سے رہا ہے جبکہ حفیظ جالندھری بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔

ابوالاثر محمد حفیظ 16 جنوری 1900 کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور 21 دسمبر 1982 کو لاہور میں انتقال ہوا۔ 'شاہ نامہ اسلام' ادبی تاریخ کا وہ کارنامہ ہے جس نے حفیظ جالندھری کو حیات دوام عطا کیا۔ اس کے علاوہ گیت نگاری میں بھی ان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے گیتوں کی خاصیت چھوٹی اور مترنم بحریں ہیں،ساتھ ہی ان کے الفاظ کا استعمال سماعتوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔مضمون کے اعتبار سے حب الوطنی کا جذبہ ان کے گیتوں کا بے حد اہم پہلو ہے۔

پریت ہے تیری ریت پرانی
بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسالے اپنے من پریت

مخمور جالندھری کے گیت گنگا جمنی تہذیب وثقافت کے بہترین ترجمان ہیں یا یوں کہیے کہ ہمارے گیت کی روایت کے پاسبان بھی ہیں۔ جابہ جا ہندی الفاظ کا استعمال گیت کو بوجھل بنا دیتا ہے لیکن مخمور نے اپنے گیتوں میں ہندی اردو الفاظ کی جو آمیزش کی ہے اس سے زبان کو ایک وقار حاصل ہوا ہے جو کشش کی وجہ بنتا ہے اور اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

کوئی پار لگائے
من کی نیا، دکھ کے ساگر میں ہچکولے کھائے
جیون کے آکاش پہ میرے غم کے بادل چھائے
کوئی سکھ کا میرے دل پر اتنا مینھ برسائے
یہ میرے جیون کی اگنی پریم ندی بن جائے
..... کوئی پار لگائے
دن بیتیں جس دیس میں سکھ سے جی نہ میرا گھبرائے
مجھ دکھیاری کو آکر اس دیس کوئی پہنچائے
..... کوئی پار لگائے

حفیظ جالندھری اور مخمور جالندھری کے بعد تیسرا بڑا نام ضیاء جالندھری کا ہے۔ضیاء نے اپنے شہر کی روایات اور ادبی وتہذیبی ماحول کو برقرار رکھتے ہوئے کامیاب گیت لکھے۔الفاظ کی تکرار سے حسن وکیفیت پیدا کرنا شاعروں وگیت کاروں کا اہم حربہ ہوتا ہے جس کو ضیاء کے گیتوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کا یہ گیت ملاحظہ کریں۔

وہ نہ آئے
چاند کی جوت جلتی تھی جلتی رہی
رات شاخوں کی آہوں میں چپ چاپ ڈھلتی رہی
جی ڈراتے رہے کالے سائے یہاں
وہ نہ آئے
پھول امبر کے چنتی رہی بار بار
میں پروتی رہی اپنی آنکھوں میں تاروں کے ہار
اوس کے کتنے موتی بچھائے یہاں
وہ نہ آئے،وہ نہ آئے

اردو زبان وادب کے عظیم مورخ وناقد پروفیسر محمود شیرانی کے لخت جگر محمد داؤد خان،اختر شیرانی (4 مئی 1905 ٹونک، 9 ستمبر 1948 لاہور) اس دور کے گیت نگار ہیں جب مبالغے اور بناوٹ کی جگہ حقیقت نگاری کا بول بالا تھا،جس کے لیے گیت موزوں ترین صنف سخن ہے کیونکہ گیت وہ صنف سخن ہے جس کی بنیاد صرف اور صرف سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ سیدھے سچے جذبات وخیالات نہ صرف ہر ذی شعور اور ذی ہوش کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں بلکہ ایک مخصوص فضا میں گھیر لیتے ہیں اور اکثر انسان چاہتے ہوئے بھی اس حصار سے باہر نہیں نکل سکتا اور بار بار گیت کے بولوں کو دہراتا رہتا ہے لیکن اس کے لیے اختر شیرانی جیسا شاعر ہونا پہلی شرط ہے۔ان کے گیتوں کے یہ بند ملاحظہ کریں۔

پردیسی سے دل کا لگانا   بہتے پانی میں ہے نہانا
کوئی نہیں ندی کا ٹھکانا   رمتے جوگی کس کے میت

ہجر کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ کوئی ساتھی نہ کوئی سجنی نہ کوئی میرے پاس سہیلی
برہ کی بھی رات گزاروں،ڈر کے مارے کیسے اکیلی
اب بھی نہ آئے من کو چین

اختر کے کلام میں نظم گوئی بھی ایک اہم صنف کے طور پر شامل ہے لیکن اس پر بھی گیت کا اثر غالب ہے۔ان کی مشہور نظم ہے۔

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یاران وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا
کس رنگ میں ہیں کنعان وطن
وہ باغ وطن فردوس وطن
وہ سرو وطن ریحان وطن

اس نظم میں اختر نے جس خوبی سے مترنم الفاظ کا استعمال کیا ہے اور ان کی تکرار سے کلام کے حسن میں اضافہ کیا ہے، یہ ان کی قادرالکلامی کا واضح ثبوت ہے۔

ثناء اللہ ڈار، میراجی (پ: 1912 لاہور، انتقال 3 نومبر 1949 ممبئی) پنجاب میں اردو گیت کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک اہم اور قابل ذکر نام ثناء اللہ ڈار، میراجی کا ہے۔ جنھوں نے ہندوستانی زبان کی تمام تر روایتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی انفرادیت قائم کی۔ صوفیانہ سوچ وفکر کی عکاسی کرنے والے اس شاعر نے جہاں اپنے سوز وگداز کو غنائی اظہار دیا وہیں گیت کی مدھرتا اور ترنم کو برقرار رکھتے ہوئے پنجابی زبان وتہذیب کی نمائندگی کی۔

پھر ساون من بھاون آیا مورا بیرن آیا بیرن مورا رے
پھر ساون من بھاون آیا، پل میں من بستی کو سجایا رے
ساون آیا ٹوٹا دکھ کا بندھن مورا رے
آیا بیرن مورا رے
دھرتی پہ چھائی ہریالی، آئیں گھٹائیں کالی کالی
گھر بھر میں اجیالا چھایا، پل میں بندھائی دھیر
آیا بیرن مورا رے
آیا بال پنے کا سنگی، لایا چوڑی رنگ برنگی
پہنچی، جھانجن، چاندی کی زنجیر لایا
آیا بیرن مورا رے
آیا بیرن مورا رے

فیض احمد فیض کا شمار بنیادی طور پر ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے لیکن یہ بات بہت کم منظر عام پر آئی کہ انھوں نے گیت کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی بلکہ فلموں کے لیے بھی گیت لکھے۔ یہ گیت ان کے شعری مجموعے 'شام شہر یاراں' میں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں بالکل وہی انداز اپنایا جو ہمارے ابتدائی دور کے گیتوں کا خاصہ رہا ہے لیکن ان کی زبان زیادہ واضح اور نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

موری ارج سنو دست گیر پیر
مائی ری، کہو کا سے میں اپنے جیا کی پیر
نیا باندھو رے/ باندھو رے کنار دریا
مورے مندر اب کیوں نہیں آئے
اس صورت سے/ عرض سناتے/ درد بتاتے
نیا کھیتے/ منت کرتے/ رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں/ اب جا کر یہ بھید کھلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری/ جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمہاری/ جس سے دکھ کا دور ومانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تمھیں تو تھے/ وہ تمھیں تو تھے

اور فلم 'جاگو ہوا سویرا' میں ان کا انداز کچھ اس طرح سے ہے۔

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو/ چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو/ تھک گئی اکھیاں
گزر گئی برسات/ بیت چلی ہے رات

اردو گیت کاری کے پیشوا ساحر لدھیانوی (8 مارچ 1921 لدھیانہ، پنجاب۔ 25 اکتوبر 1980 ممبئی) واقعی ایک کھرے اور سچے فنکار ہیں۔ سچا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے نزدیک کسی بھی فن کی معراج، فن پارے سے پیدا ہونے والی تاثر آفرینی ہے۔ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو کسی شخص کی سوچ وفکر سے اس قدر یکجا کر دیتی ہے کہ وہ ذی شعور شخص ان کیفیات سے گزرنے لگتا ہے جہاں سے گزرتے ہوئے ایک فنکار اپنے فن کی تخلیق کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کیفیت دوسری تمام کیفیات سے منفرد و ممتاز اور احساس مسرت و سرور سے اس قدر سرشار ہوتی ہیں کہ انسان کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ساحر کے جذبات وخیالات اور زبان و بیان سے بارہا وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو ہم فن کی معراج کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ہی طرح کی صداقت، ذہانت اور فطانت کے واحد و یکتا فنکار ہیں جس کا ثبوت خود ان کے گیت ہیں۔

لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے
.... گھر جاؤں کیسے
ہو گئی میلی موری چنریا
گورے بدن کی گوری چنریا
جا کے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
.... گھر جاؤں کیسے
گوری چنریا آتما موری میل ہے مایا جال
وہ دنیا مورے بابل کا گھر، یہ دنیا سسرال
جا کے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
...... گھر جاؤں کیسے

ساحر کے گیتوں میں شدت، جدت، ندرت، محبت اور تخصص الفاظ، غرض تمام خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں اور ساتھ ہی ادب اور تہذیب کی چاشنی نے ان کے ذائقے کو دوگنا کر دیا ہے۔ ساحر نے اپنی تمام تر ادبی وفنی شاعری کو فلموں میں استعمال کیا جس سے فلمی گیتوں کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اسی لیے موجودہ فلمی گیتوں کے سربراہ پدم بھوشن گلزار نے جادوگر نغمہ گر ساحر کو سب سے بڑا گیت کار تسلیم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں 'گاتا جائے بنجارا' فلمی گیتوں کا اب تک کا سب سے خوشبودار گلدستہ ہے۔

قتیل شفائی کے گیتوں میں تاثر اور کیفیت کے ساتھ ساتھ موسیقیت کو بہت ہی عمدہ پیرائے میں ابھارا گیا ہے جس کی جھنکار کی رسائی دلوں تک ہوتی ہے اور ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے یہی سچا تخلیقی جوہر بھی ہے جو قتیل کے یہاں جلوہ گر ہے۔

موہے چاند کے پائل منگا دو سجن
خالی پیروں سے پنگھٹ کو میں چلوں
اپنی سکھیوں کو دیکھوں تو من میں جلوں
وہ تو تانا چیں میں شرما کے منھ پھیروں
موہے پنگھٹ کی رانی بنا دو سجن

صوتی آہنگ کے ذریعے غنائی کیفیت پیدا کرنا اور موسیقیت ابھارنا قتیل کی شاعری کی بڑی خاصیت ہے۔

اردو گیت نگاری کے تعلق سے عرش ملسیانی بھی ایک اہم نام ہے۔ فنی اور ادبی اعتبار سے ان کے گیت اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر 'برہ' کے موضوع پر انھوں نے عمدہ گیت تحریر کیے ہیں۔ ان کے زبان و بیان گیت کی فضا کے عین مطابق ہیں۔

آہ بھرت ہوں ہر کروٹ پر
چونک پڑت ہوں ہر آہٹ پر
روپ انیک دکھائے پیا نہیں آئے
سیج سنگار نہ بھائے/ پیا نہیں آئے/ پیا نہیں آئے

عام بول چال کی زبان کو گیتوں سے متعارف کروانے والے گیت کار آنند بخشی کا تعلق بھی پنجاب ہی سے ہے۔ انھیں قافیہ پیمائی پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے تقریباً ہر موضوع پر گیت لکھے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تقریباً 650 فلموں کے لیے تین ہزار سے زیادہ گیت لکھے۔ ان کی خدمات کے لیے انھیں کئی بار فلم فیئر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ عوام میں سانگ انجینئر کے طور پر مشہور ہوئے۔ ان کے گیتوں کا انداز کچھ یوں ہے۔

اک بنجارا گائے جیون کے گیت سنائے
ہم سب جینے والوں کو جینے کی راہ بتائے
کبھی کا دیکھو نہیں ہوتا ہے نصیبا روشن ستاروں جیسا
سیانا وہ ہے جو پت جھڑ میں بھی سجالے گلشن بہاروں جیسا
کاغذ کے پھولوں کو بھی مہکا کر دکھلائے
اک بنجارا گائے جیون کے گیت سنائے

پریم وار برٹنی اردو گیت نگاروں کی فہرست میں ایک قابل ذکر اور قابل قدر نام ہے۔ ان کے گیتوں میں خالص ادبی گیت شامل ہیں۔ محمد رفیع و لتا منگیشکر جیسے گلوکاروں نے ان کے الفاظ کو اپنی سریلی آواز دی۔ ان کے گیتوں کے مطالعے سے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی دلی کیفیات کو بہت ہی سادگی وعمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس عمل میں زبان اور بیان پر مکمل گرفت ان کی دوسری اہم خوبی ہے۔ زبان کی سلاست اور بیان کی

معصومیت ونرمی ان کی گیت کاری کے بنیادی وصف ہیں۔

دل جلے گا تو زمانے میں اجالا ہوگا
حسن ذروں کا ستاروں سے نرالا ہوگا
یہ جو آکاش پہ اک چاند نظر آتا ہے
کسی دیوانے نے دل اپنا اچھالا ہوگا

دیکھنا روئے گی فریاد کرے گی دنیا
ہم نہ ہونگے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا
اپنے جینے کی ادا بھی ہے انوکھی سب سے
اپنے مرنے کا بھی انداز نرالا ہوگا

یا پھر یہ گیت ملاحظہ کریں۔

میری زندگی کے راہی مجھے چھوڑ کر نہ جانا
مرے ساتھ صرف تو ہے ترے ساتھ ہے زمانہ
تجھے کیا خبر کہ میں نے تجھے روح میں اتارا
تجھے دیر تک صدا دی تجھے دور تک پکارا
مری حسرتوں نے چھیڑا ترے نام کا ترانہ
میری زندگی ....

فلم وادب کی ایک کثیر الجہت شخصیت سمپورن سنگھ کالڑا یعنی گلزار (پیدائش: 1934 دینا، ضلع جہلم، پنجاب، پاکستان) موجودہ دور کے بے حد اہم گیت کار ہیں۔ یہ ان کی گیت کاری کا ہی کمال ہے کہ انھیں ساہتیہ اکادمی اور فلموں کے سب سے بڑے ایوارڈ 'آسکر ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا:

میرا گورا رنگ لئی لے
موہے شام رنگ دئی دے

جیسے گیت سے اپنے فلمی کیریئر کی شروعات کرنے والے گلزار کی شاعری و گیت کاری کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں ہندوستانی روح اور اردو کی دھڑکن کو صاف طور پر سنا جاسکتا ہے۔ اگر ان کے تمام کلام کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور فلم 'دل سے' کے لیے لکھا جانے والا 'چل چھیاں چھیاں' ہمارے سامنے ہو تو میرا خیال ہے کہ ان کو بڑا گیت کار تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی قباحت نہیں ہوگی۔ شاعری کیا ہے؟ لفظوں کا استعمال کیا ہوتا ہے؟ فنی چابکدستی کیا ہوتی ہے؟ اس گیت سے بخوبی واضح بھی جاسکتا ہے۔

میرے عشق کی چادر چھیاں/ چل چھیاں چھیاں
جن کے سر ہو عشق کی چھاؤں/ پاؤں کے نیچے جنت ہوگی
چل چھیاں چھیاں
وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح
ہے جس کی زباں اردو کی طرح
مری شام ورات مری کائنات
وہ یار میرا سیاں سیاں
چل چھیاں چھیاں.......

اس گیت میں گلزار نے جس طرح 'اردو' کو اپنے محبوب کا وصف خاص بنایا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ 'اردو' کا اب تک کا بہترین استعمال ہے۔ اگر چہ داغ دہلوی نے بھی اردو کو خوبصورت انداز میں پیش کیا لیکن کسی کو اس لیے پسند کرنا کہ اس کی زبان اردو کی طرح مترنم اور شیریں ہے، اپنے آپ میں اردو سے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔

سلسلۂ گیت کا ایک معتبر و معتمد نام ڈاکٹر اسلم حبیب کا ہے جن کا تعلق پنجاب کی روحانی وادبی سرزمین مالیر کوٹلہ سے ہے۔ اچھی اور سچی گیت کاری ساحری سے کم نہیں ہوتی۔

زخمی پڑی ہے میری سرگم گھائل ہیں سرتال
گھائل ہیں سرتال رے ساتھی کیسے گیت سناؤں
کیسے گیت سناؤں رے ساتھی
گھائل ہیں سرتال
وار دکھوں کے سہتے سہتے ہو گئے گیت کٹیلے
بچھڑے ہم سے کیسے کیسے بانکے یار چھبیلے
اور نہ ہم سے بن پائیں گے اب جینے کے حیلے
اب تو کسی بھی طور ہو لیکن ختم ہو یہ جنجال
رے ساتھی گھائل ہیں سرتال
آنسو بن کر بہہ گئے کتنے کومل خواب سنہرے
کس کو دکھائیں زخم دلوں کے ساگر سے بھی گہرے
سارے دیوتا پتھر نکلے سارے انساں بہرے
کس سے بات کہوں میں دل کی کسے سناؤں حال
رے ساتھی گھائل ہیں سرتال

ستھرا اور نکھرا لہجہ رکھنے والے جل گیت کار اسلم کے تخلیقی عمل پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہی ان کے یہاں کوئی جذبہ لے بن کر ابھرتا ہے، الفاظ خود بخود آکر ان کی دہلیز پر کھڑے ہو جاتے ہیں جن کا فنکارانہ استعمال وہ اس مہارت وفراست سے کرتے ہیں کہ ان کے گیت فصاحت اور بلاغت کا مرقع نظر آتے ہیں۔

میرا جیون اک نیا ہے/ تو ہے کھیون ہار سوامی
کب سے کھڑا ہوں بیچ بھنور میں
اب تو لگا دے پار، سوامی تو ہے کھیون ہار
تن کی ترشنا، من کی الجھن، قدم قدم بھٹکائے
کیسے بچوں؟ گر تو نہ مجھ کو بانہہ پکڑ لے جائے
ہاتھ دے اپنا میں تو کھڑا ہوں
کب سے ہاتھ پسار سوامی تو ہے کھیون ہار

میں سمجھتا ہوں کہ شدت جذبات عمیق ذہانت کی علامت ہے اور اگر اس ذہانت کو مثبت سوچ یعنی طریقہ وسلیقہ نصیب ہو جائے تو اسلم جیسے شاعر وجود پذیر ہوتے ہیں۔

اردو گیت نگاری کے حوالے سے سوہن راہی کا نام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے جن کے متعدد مجموعے منظر عام آکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں جن میں گیت ہمارے خواب، کاغذ کا آئینہ، گھونگھٹ کے پٹ اور زخموں کے آنگن قابل ذکر ہیں۔ ان کے گیت ہند وپاک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سوہن راہی کی زندگی کا زیادہ وقت غیر ممالک میں گزرا ہے اس کے باوجود وہ ہندوستانی تہذیب اور گیت کے مزاج سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں۔ لفظوں کا بہترین استعمال، خاص کر ہندی الفاظ کی آمیزش سے زبان کو جو تازگی ورعنائی عطا کرتے ہیں اور نئی نئی ترکیبوں کا اختراع کرتے ہیں وہ انہی کا وصف خاص ہے۔ ساتھ ہی موسیقی کی معلومات نے ان کے گیتوں کے حسن میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک فطری گیت کار ہیں۔ بقول قتیل شفائی 'گیت ان کے مزاج میں رچا بسا ہوا ہے'۔

راہی تو چلتا چل/ راہی تو چلتا چل
تجھ کو منزل ڈھونڈ ہی لے گی
آج نہیں تو کل، آج نہیں تو کل
پیت کی کوئی ڈور بنے گا
درد بھرے تیرے گیت سنے گا
کوئی تیرے آنسو بھی چنے گا
روپ کے بنجاروں سے تیرا
من ہوگا بے کل/ راہی تو چلتا چل/ راہی تو چلتا چل

غریب الدیار ہونے کا دکھ کیا ہوتا ہے اس بات کو راہی کے گیتوں میں شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

کوئل کوک پپیہا والی نا پیپل کی چھاؤں
سات سمندر پار بسایا ہم نے ایسا گاؤں
ہمرا ایسا گاؤں
ہمرا ایسا گاؤں
ایسا گاؤں جس میں ٹھنڈی آگ سے تن جلتا ہے
سانس میں پون نہیں وش پرویا جاتا ہے
اس گاؤں کی سرحد سے نہ نکلیں پھر بھی باہر پاؤں
ایسا ہمرا گاؤں

گیت کاری کے تعلق سے خوشی کی بات یہ ہے کہ جہاں پنجاب میں ماضی کی خوبصورت روایت موجود ہے وہیں یہ سفر آج بھی جاری وساری ہے۔ ان متذکرہ گیت کاروں کے علاوہ باقی شعراء کے یہاں بھی گیت کاری کا رجحان ملتا ہے۔ ان میں سردار پنچھی، راجندر ناتھ رہبر، ناشر نقوی، ارشاد کامل اور صاحبزادہ اجمل خاں شیروانی کے نام قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Nadeem Ahmed
Assit. Prof. Dept of Urdu & Persian
Sri Guru Granth Sahib World University
Fatehgarh Sahib - 140406 (Punjab)
Mob.:09888856914

داستانِ امیر حمزہ کی مختلف اشاعتیں

عرشی خاتون

اردو میں داستان امیر حمزہ کی تصنیف، تالیف اور ترجمے کے سلسلے میں بہت ساری غلط باتیں رائج ہو گئی ہیں۔ اگر تصنیف کی بات کریں تو کچھ لوگ اس داستان کے اصل مصنف کا نام عباس برادر حمزہ بتاتے ہیں تو کوئی معاصر اکبر خسرو کو اس کا مصنف بتاتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ داستان عہد غزنوی میں لکھی گئی اور اس کا مصنف کوئی ابو المعالی ہے۔ کسی نے فیضی کو، تو کسی نے شاہ نصیر الدین کو اس کا مصنف بتایا ہے۔ کسی کے نزدیک ملا جلال بلخی اس کے مصنف ہیں۔

دراصل داستان امیر حمزہ کے ارتقا کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی اور دوسری منزل فارسی زبان میں اور تیسری یعنی آخری منزل اُردو زبان میں ظاہر ہوتی ہے۔

داستان امیر حمزہ سب سے پہلے فارسی زبان میں لکھی گئی۔ سہیل بخاری[1] کے مطابق اس قصے کی اصل ایک کتاب 'مغازی حمزہ' ہے۔ اس سے متعلق معلومات ایران کے ملک الشعرا محمد تقی بہار نے فارسی کی سیستان کے حوالے سے فراہم کرائی ہیں۔ یہ کتاب دور عباسی میں تصنیف کی گئی۔ سلاطین بنی عباس کے زمانے میں حمزہ بن عبداللہ الشاری الخارجی نامی شخص خارجیوں کا سردار تھا۔ مدتوں خلیفہ ہارون رشید سے معرکہ آرائی کرتا رہا۔ ہارون رشید کی وفات کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس نے مختلف ممالک، ہند، چین، سراندیپ، ترکستان اور روم وغیرہ کی سیر کی۔ پھر وہ سیستان واپس پہنچا۔ اس کے معتقدین نے ایک کتاب مغازی حمزہ لکھی جس میں اس کے جنگ وجدل اور سیر و سیاحت کے حالات کا بیان تھا۔ بعد میں شیعیہ (غیر خارجی) ایرانیوں نے اس کتاب کو عام مسلمانوں کے درمیان مقبول بنانے کی غرض سے ناموں میں تبدیلی کر کے اسے تاریخ سے دور کر دیا۔ اور حمزہ عبداللہ کے نام کو حمزہ عبدالمطلب اور بنی عباس کے نام کو افراسیاب سے متبدل کر دیا۔

مذکورہ بالا واقعہ کے بنا پر ہم مغازی حمزہ کے وجود کو تو ضرور قبول کر سکتے ہیں لیکن اس کو داستان امیر حمزہ کی اصل مان لینے میں ہمیں مزید تحقیق اور ثبوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فی الحال نہ تو مغازی حمزہ ہے اور امیر حمزہ کا ہی کوئی پرانا نسخہ ہے جس کو بنیاد بنا کر اس کے متعلق کوئی مضبوط رائے قائم کی جا سکے۔ معاصر تحقیق کی روشنی میں اتنی بات ضرور پتہ چلتی ہے کہ داستان امیر حمزہ عہد ہمایوں (سنہ وفات 963ھ) میں اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھی۔ گیان چند جین نے[2] رموز حمزہ کو داستان امیر حمزہ کی دوسری ارتقائی منزل قرار دیا ہے۔ یہ 1274ھ میں تہران سے چھپ چکی ہے جو دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد تین اور دوسری جلد چار حصوں میں ہے۔ اس طرح یہ کل سات حصوں میں ہے۔ اور ہر حصہ چند اجزا پر مشتمل ہے۔ ان حصوں میں دو کو الگ الگ نام بھی دیے گئے ہیں۔ ایرج نامہ اور صندلی نامہ۔ فارسی رموز حمزہ تہران کے علاوہ نول کشور پریس سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں داستان امیر حمزہ کا ایک نقش 'زبدۃ الرموز' کے نام سے محفوظ ہے۔ حاجی قصہ خواں ہمدانی جو اس کتاب کا مصنف ہے دیباچے میں لکھتا ہے کہ جب وہ 1613م 1022ھ میں عراق سے حیدرآباد گولکنڈہ پہنچا تو عبداللہ قطب شاہ 1611-72م 1020-83ھ کے دربار میں حاضر ہوا اور رموز حمزہ کے کئی نسخے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان نے اسے زبدۃ الرموز مرتب کرنے کا حکم دیا لہٰذا حکم کی تعمیل ہوئی اور زبدۃ الرموز تیار ہوئی۔ اس روایت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ 1613 کے آس پاس فارسی داستان امیر حمزہ (رموز حمزہ) واضح شکل کے ساتھ سامنے آ چکی تھی۔

اسٹیٹ لائبریری رام پور میں بھی رموز حمزہ کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاہ عباس ثانی کے عہد (1052ھ۔ 1077ھ) کی تصنیف ہے اور اس کے مصنف میر احمد علی ہیں۔

برٹش میوزیم لندن میں یک جلدی داستان امیر حمزہ کے چھ فارسی نسخے موجود ہیں ان میں سب سے قدیم نسخہ اسماء الحمزہ مکتوبہ 1112ھ/ 1700-01 ہے۔ اس میں بارہ قصے ہیں۔ اس کے علاوہ 'کتاب امیر حمزہ صاحب قران' مکتوبہ 1185ھ کے نام سے ایک نسخہ اسٹیٹ لائبریری رامپور میں ہے۔

نیشنل لائبریری کلکتہ کے بوہار کلکشن میں بھی قصۂ امیر حمزہ کا ایک فارسی مخطوطہ موجود ہے۔ انڈیا آفس میں اس یک جلدی داستان امیر حمزہ کے تین نسخے موجود ہیں۔ ان میں ایک 1909م 1327ھ کا بمبئی ایڈیشن اور 1914م اور 1923 کا لاہور اڈیشن بھی ہے۔

اردو میں داستان امیر حمزہ کے جو ابتدائی نسخے ملتے ہیں ان میں ایک نسخہ دکنی زبان میں بہ عنوان 'قصۂ جنگ امیر حمزہ' مکتوبہ 1198ھ ہے۔ یہ قومی کتب خانہ پیرس میں محفوظ ہے۔ بہ قول گیان چین:

''اس کا مخطوطہ پیرس کے کتب خانے میں ہے۔ تاریخ کتابت 1198ھ ہے۔ سنہ تالیف اور مؤلف کا نام تاریکی میں ہے۔ اس میں وہی قصہ ہے جو فورٹ ولیم میں خلیل علی خاں اشک نے پیش کیا ہے۔ بائیس داستانوں پر مشتمل ہے۔''[3]

انجمن ترقی اردو ہند (اب پاکستان) کے کتب خانے میں امیر حمزہ کا ایک ناقص الاول نسخہ تقسیم ملک سے قبل موجود تھا۔ جو 458 صفحات پر مشتمل تھا۔ زبان کی قدامت کے لحاظ سے اسے سترھویں صدی عیسوی کے اوائل کا مان لیا گیا ہے۔ اس کے مولف اور سنہ تالیف کے متعلق بھی کوئی جانکاری نہیں ہے۔

بہر حال یہاں پر بحث کا موضوع وہ یک جلدی داستان امیر حمزہ کی اشاعت ہے جسے غالب لکھنوی نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

نواب مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی کی (یک جلدی) داستان امیر حمزہ اردو کی بے حد مشہور داستان ہے۔ اردو میں داستان امیر حمزہ کی دو کڑی ہے پہلی کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے ہے جسے خلیل علی خاں اشک نے چار جلدوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ دوسری کڑی وہ ہے جسے منشی نول کشور پریس نے شائع کیا۔

اوّل الذکر کو 1215ھ/ 1801 میں فورٹ ولیم کالج نے ترجمہ کرکے شائع کیا تھا۔ یہ داستان چار جلدوں میں یکجا مجلد تھی اس کے مترجم خلیل علی خاں اشک نے کسی فارسی نسخے سے اس داستان کو اردو میں منتقل کیا تھا۔

اس کے بعد 1271ھ/فروری 1855 میں نواب مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی نے داستان امیر حمزہ کا ترجمہ اردو میں کیا۔ داستان گوئی ان کا پیشہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے قصہ حمزہ کی ابتدائی شکل کو فارسی زبان سے اردو میں منتقل کیا۔ دیباچہ میں غالب لکھنوی نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ حکیم شیخ امداد علی صاحب، خلف الرشید حکیم شیخ دلاور علی صاحب جو کہ شاگرد مرزا حیدر کے تھے کی فرمائش پر کیا ہے۔ اس لیے کہ میر عزت علی اس بات پر مصر تھے کہ اس داستان کو صاف صاف اور روز مرہ اردو میں لکھا جائے۔ اقتباس دیکھیے:

''اس داستانِ دلچسپ کے سیر کرنے والوں اور سننے والوں پر واضح ہو کہ حکیم شیخ امداد علی صاحب، خلف الرشید حکیم شیخ دلاور علی صاحب مغفور لکھنوی، نے شاگردِ نامی حکیم مرزا حیدر مبرور کے ہیں اور نفس الامر میں فنِ طبابت میں ید بیضا رکھتے ہیں، اس اضعف العباد، ہیچ مداں، کج مج زباں، امان علی خاں، دامادِ شاہزادہ فتح حیدر، خلفِ اکبر جنت نشان ٹیپو سلطان، سے فرمایا کہ شفیقِ معظم میر عزت علی صاحب مصر ہیں کہ داستانِ سلطان غفراں نشان، حلقہ فگن گوشِ گردن کشاں، صاحبقراں گیتی ستان، عم کبار پیغمبر آخر الزماں، گیرندۂ گرز سام و نریماں، شکنندۂ کمانِ رستم دستاں، زلازل قاف، کوچک سلیماں، یعنی حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف زبانِ فارسی سے زبانِ اردوے معلّی میں ترجمہ کرکے چھپوائی جائے، چونکہ مجھ کو مطب سے فرصت نہیں ہے، اس سبب سے انجام اس کا دشوار ہے، اور مطب سے ہاتھ ہٹاتا ہوں تو بندگانِ حکیم علی الاطلاق کے علاج و درماں سے معذور رہتا ہوں، لہٰذا بلحاظِ محبتِ قدیم تجھ کو تکلیف دیتا ہوں۔ لیکن صاف صاف روز مرہ اردو کا لکھا جائے کہ خاص و عام کو پسند آئے۔ احقر العباد کج مج زباں نے بہ لحاظ ان کی شفقت و مہربانی کے، کہ قدیم سے مترجم کے حال پر مبذول و مرعی ہے، عذر کرنا مناسب نہ جانا، دل و جاں سے قبول کیا اور خامۂ احمر نگار کو ہاتھ میں لیا، اور بہ سبب اس کے کہ اس داستان میں چار چیزیں ہیں: رزم، بزم، طلسم، عیاری، اس واسطے مترجم نے فارسی کی چودہ جلدوں کا ترجمہ کرکے چار کیں۔''4

لہٰذا ہدایت کے مطابق غالب لکھنوی نے اس داستان کو صاف صاف روز مرہ اردو کے مطابق لکھا۔ اس کی تاریخ تکمیل 23 فروری 1855 م 1271ھ ہے۔ جو کلکتہ سے طبع ہوا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس اشاعت کے بعد غالب لکھنوی کا یہ نسخہ بالکل غائب ہو گیا اور کافی دنوں تک پردۂ گمنامی میں رہا۔ یہاں تک کہ 1871 میں عبداللہ بلگرامی نے غالب لکھنوی کے اس ترجمے میں کسی قدر ردو بدل کرکے جب اپنے نام سے شائع کیا تو بھی غالب لکھنوی کا کہیں کوئی ذکر نہ کیا۔ بعد میں سہیل بخاری5 نے اپنی تحقیق کے ذریعے یہ بات ثابت کی کہ جسے عبداللہ بلگرامی اپنا مال بنا کر پیش کر رہے وہ دراصل غالب لکھنوی کی ہے اور 493 صفحات پر مشتمل 'قصہ امیر حمزہ' کا ایک نسخہ مطبوعہ 1271ھ مترجم غالب لکھنوی پنجاب یونیورسٹی لاہور میں محفوظ ہے اور یہ داستان اتنی مقبول ہوئی کہ منشی نول کشور نے داستان امیر حمزہ (طویل) کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔

دراصل ہوا یوں تھا کہ عبداللہ بلگرامی نے جب غالب لکھنوی کے ترجمے کو تھوڑی بہت تبدیلی کرکے جب اپنے نام سے چھپوایا تو یہ داستان عوام وخاص میں خوب مقبول ہوئی۔ شہرت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 15 سال کے اندر اس کی تین طباعتیں ہوئیں۔ 1887 میں مطبع نول کشور سے جب اس کی چوتھی اشاعت ہوئی تو مصحح کے طور پر شیخ تصدق حسین رضوی کا نام درج تھا۔ تصدق کے بعد مولوی عبدالباری آسی نے اس پر نظر ثانی کی۔ اور یہ نسخہ بیسویں صدی کے نصف اول میں نول کشور پریس سے ہی شائع ہوا۔ نسخۂ آسی کی دسویں طباعت نول کشور پریس ہی (جواب تیج کمار پریس) 1960 میں ہوئی۔ اس اشاعتی تفصیل کے بارے میں رفاقت علی شاہد کہتے ہیں۔ اقتباس:

''یک جلدی قصۂ امیر حمزہ کی اشاعتی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مختصر روایت کے اہم نسخے اشک اور غالب لکھنوی کے قصے ہیں اور ان میں بھی غالب لکھنوی کا نسخہ زیادہ مقبول رہا کہ تین افراد نے اس کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔''6

اور تقریباً ڈیڑھ صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد غالب لکھنوی کے اس نسخے کی آکسفورڈ پریس، کراچی سے 2011 میں دوسری بار اشاعت ہوئی ہے۔ رفاقت علی شاہد نے اس نسخے کو متعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اشک کے مقابلے میں غالب کا ترجمہ بہترین اور دلچسپ ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''بحیثیت مجموعی اردو میں 'قصہ امیر حمزہ' کا بہترین نسخہ غالب لکھنوی کا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس قصے کی زبان و بیان اور اس میں دل چسپی کا عنصر ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے واضح کیا ہے کہ غالب لکھنوی کے بیان میں دلچسپی اور فطری پن اشک کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اشک کچھ حیود وقیود کے پابند تھے۔ ان کے پیشِ نظر نو وارد انگریزوں کے لیے آسان اور سادہ اردو زبان لکھنا مجبوری تھی، پھر تہذیبی و معاشرتی مرقعوں کا بیان بھی ترجیح میں شامل تھا، تاکہ نو وارد انگریز افسران زبان کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے رسم و رواج اور عادات و مزاج سے بھی واقف ہو سکیں، جبکہ یہ پابندیاں غالب لکھنوی کے پاوں کی زنجیریں نہ بن سکیں اور وہ اپنے اسپ تخیل کو سرپٹ دوڑانے کے لیے آزاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اشک کے قصے میں زبان و بیان کی وہ دلکشی اور رنگا رنگی دیکھنے میں نہیں آتی جو غالب لکھنوی کے قصے کا خاصہ ہے۔ اپنی خوبیوں کے باوصف ایک صدی سے زائد عرصے تک پردۂ گم نامی میں رہنے اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے تک اشاعت ثانی کا منہ نہ دیکھنے والے اس اہم ترقصے کی اشاعتِ مکرر نہایت خوش آئند قدم ہے۔''7

گیان چند جین نے بھی غالب لکھنوی کے اس ترجمے کو نایاب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لکھنوی ہونے کی وجہ سے انھوں نے عبارت آرائی اور مرصع بیان کو اپنا شیوہ بنایا۔ غالب کا ترجمہ نادر بلکہ نایاب ہے۔''8

حواشی

1. سہیل بخاری، اردو داستان (تحقیقی تنقیدی مطالعہ)، ص 4-103 مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987
2. گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، ص 676 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2002
3. گیان چند جین، مضمون دکنی داستانیں، ص 36، رسالہ آج کل، دہلی، اپریل 1964
4. داستان امیر حمزہ، تالیف، نواب مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی، تعارف، رفاقت علی شاہد، ص 2، 3 آکسفورڈ پریس، کراچی، 2011
5. سہیل بخاری، اردو داستان (تحقیقی تنقیدی مطالعہ)، ص 229
6. داستان امیر حمزہ، تالیف، نواب مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی، تعارف، رفاقت علی شاہد، ص ذ
7. داستان امیر حمزہ، تالیف، نواب مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی، تعارف، رفاقت علی شاہد، ص ر، د
8. گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، ص 717

■

Dr. Arshi Khatoon D/o Sartaj Ahmad
Ward No.: 30, Mangal Bazar
Vision Studio Gali, Egg Merchant
Katihar - 854105 (Bihar)

شاہ رشاد عثمانی

بھٹکل کی موجودہ ادبی صورت حال

جنوبی ہند کی ریاست کرناٹک میں ساحل سمندر پر واقع 'بھٹکل' باغات سے سجا ہوا، سرسبز و شاداب اور پر رونق ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر یا تعلقہ ہے، جسے تین طرف سے پہاڑیوں کی بلندیوں نے گھیر رکھا ہے، درمیان سے ایک ندی بہتی ہے اور چوتھی طرف سمندر اپنی وسعتوں، گہرائیوں اور گیرائیوں کے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ پوری وادی میں ناریل اور سپاریوں کے درختوں نے اس شہر کو اس طرح اپنے زیر سایہ لے رکھا ہے کہ دور سے دیکھنے والوں کو سوائے درختوں کے سروں کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس الف لیلوی بستی میں رہنے والے مسلمانوں کو اہل نوائط کہا جاتا ہے۔ یہاں کی مقامی زبان نوائطی ہے اُردو سے بالکل مختلف لیکن رسم الخط اُردو ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہاں کے لوگ قدیم عرب تجار کی اولاد ہیں جو تیسری صدی ہجری میں ہی یہاں آکر آباد ہو گئے تھے اور آج بھی یہ اپنے آبائی پیشے پر قائم ہیں، خوش رو، خوش پوش اور خوش حال ہیں۔ ساتھ ہی عربی النسل خاندانوں کی خصوصیات اعلیٰ مہمان نوازی، خوش اخلاقی، گہری دینداری سے متصف ہیں۔ جس کا تذکرہ معروف عالمی سیاح ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔

بھٹکل میں اُردو ادب کی کوئی قدیم روایت تو نہیں ملتی، تاہم موجودہ ادبی و شعری ماحول یقیناً اُمید افزا ہے اور اہل علم حضرات کو متوجہ کرتا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا یہاں پر گھروں میں بولی جانے والی زبان نوائطی ہے مگر دوسرے تمام اجتماعی معاملات اور معاشرتی و معاشی کاروبار میں اُردو زبان مروج ہے اور یہ گویا ان کی دوسری مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ نوائطی بھی اب بولی (Dilect) کے مرحلے سے نکل کر زبان (Language) کے دائرے میں داخل ہو رہی ہے۔ کیونکہ گذشتہ تین دہائیوں سے 'نقش نوائط' نکل رہا ہے۔ اس پندرہ روزہ اخبار کی اشاعت نے بلا شبہ نوائطی نثر و صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے لیکن اس سے پہلے ایک طویل عرصے تک ماہنامہ النوائط ڈاکٹر حسن باپا ایم ٹی اور ڈاکٹر حنیف شباب اور پھر مختلف ادوار میں مختلف لوگوں کی ادارت میں نکلتا رہا ہے۔ اسی طرح نوائطی شاعری کی روایت بہت قدیم ہے قلمی مسودات میں حمد و مناجات اور مرثیے ملتے ہیں۔ آج کل اس کے گیت اور نغمے مشاعروں میں بے حد مقبول ہیں۔ سمیع اللہ برماور اور عبداللہ رفیق عصر حاضر کی نوائطی شاعری کے اہم نام ہیں۔ ابھی چند سال قبل عبداللہ رفیق نے نوائطی زبان میں ایک ادبی ماہنامہ 'اُزواڑ' کے نام سے شائع کیا تھا جس کے کئی شمارے نکلے۔ نقش نوائط کے بانی و مدیر عبدالرحیم ارشاد مرحوم تھے۔ پھر محمد علی قمر مرحوم کے بعد اب مولانا عبدالعلیم قاسمی مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جناب سید حسن سقاف ادبی و تعلیمی مسائل پر اس اخبار میں تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح جناب سید عبدالرحمٰن باطن اس اخبار کے درمیانی صفحات میں جو اُردو میں 'انجمن نامہ' کے نام سے شائع ہوتا ہے اس کی ادارت کے ساتھ نوائطی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ ادھر جناب ظفر علی معلم نے نوائطی زبان میں نوائطی ادب پر خاصا اچھا کام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا اس وقت موضوع اُردو شعر و ادب ہے نوائطی ادب کا مختصر تذکرہ صرف لسانی پس منظر کی حد تک کیا گیا ہے۔

بھٹکل میں اُردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور تخلیق و تصنیف کا آغاز بیسوی صدی کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ سر سید تحریک کے نتیجے میں شمال سے جنوب تک ملت اسلامیہ ہند کے درمیان ایک تعلیمی بیداری پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں زندہ دلوں کی یہ بستی عملی اقدام سے پیچھے کیسے رہ جاتی۔ چنانچہ 1919 میں ملت کے چند مخلص، بے غرض، ایثار پسند افراد نے اپنی تمام بے سروسامانیوں کے باوجود محض رضائے الٰہی کی خاطر اور درد ملت میں ایک ادارہ 'انجمن حامی مسلمین بھٹکل' کے نام سے قائم کیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے اپنی بنیادوں پر تعلیم کا نظم کیا جا سکے۔ اس ادارے کے ذریعے پہلے ایک مدرسہ پھر ہائی اسکول کی سنگ بنیاد ڈالی گئی۔ اخلاص و عمل کا یہ بیج برگ و بار لایا اور آج یہ ادارہ صرف مدرسہ اور اسکول ہی نہیں بلکہ اس کے تحت آرٹس، سائنس اور کامرس کالج اینڈ پی جی سنٹر، انجنیئرنگ کالج اور مینجمنٹ کالج کے ساتھ ساتھ تقریباً دو درجن تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بھٹکل کی یہ انجمن اس پورے علاقے کے لیے علم و ادب کا مرکز، تعلیم و تربیت کا گہوارہ اور زبان و تہذیب کا ایک چمن سدا بہار ہے جس کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور آج یہ تمام تعلیمی ادارے اپنے بانی صدر ایف اے حسن اور آئی ایچ صدیق اور بانی سکریٹری ایم ایم صدیق مرحومین سے لے کر موجودہ صدر محتشم عبدالغنی اور جنرل سکریٹری ظفر علی معلم صاحبان تک جتنے بھی خادمین انجمن ہیں ان کی جانفشانی، دردمندی، ایمانداری، بے غرضی، آہنی عزم، خلوص اور جذبۂ خدمت گذاری کی گواہی دے رہے ہیں۔ میری دعا ہے

یاالٰہی تا قیامت یہ چمن تازہ رہے
ہر شجر ہر نخل اس کا پھولتا پھلتا رہے

چنانچہ اس تعلیمی و تہذیبی تناظر میں جب یہاں ہائی اسکول قائم ہوتا ہے تو اُردو استاذ کی حیثیت سے عبدالواسع عصری،

محی الدین مومن اور مولانا شیخ محمود خیال مرحوم بھٹکل تشریف لاتے ہیں اور پھر یہیں کے ہو جاتے ہیں۔ محمود خیال شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور کامیاب مدرس تھے۔ انھوں نے نوجوانوں میں اُردو ادب کا اچھا ذوق پیدا کیا۔ خصوصاً ان کے ذریعے شعر وشاعری کا شوق طلبہ میں کافی پروان چڑھا۔ محمد عثمان حسن مرحوم ہائی اسکول کے بڑے مقبول ہیڈ ماسٹر تھے، آپ نے اپنے دور میں اُردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بعد میں جب بھٹکل میں ایک عربی دینی مدرسہ جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو وہاں بھی لکھنؤ سے مولانا عبدالحمید ندوی اوران کے ساتھ کئی دوسرے مدرسین بھٹکل تشریف لائے۔ جن کی موجودگی سے شہر میں خوشگوار ادبی فضاء قائم ہوئی۔ بعد کے دور میں بھی اسلامیہ اُردو ہائی اسکول میں کئی اساتذہ آئے۔ جن میں ڈاکٹر سید قدیر ناظم سرگرو خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو ایک خوش گلو اور خوش فکر شاعر ہیں اور ان کی موجودگی میں بھی کئی نوجوان شعرو شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھی عرصے تک ہائی اسکول میں تعلیم وتدریس کے مشغلہ سے منسلک رہے۔ انھوں نے خاص طور سے نوجوانوں کے اندر ادبی وشعری ذوق پیدا کیا اور اس پہلو سے نوجوانوں کی اچھی تربیت کی اس وقت بھٹکل میں نوجوان شعراء کی جو کھیپ نظر آتی ہے وہ سب فطرت صاحب کے شاگرد ہیں اور ان کے خون جگر کا نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو زبان کی ابتدائی تعلیم وتدریس کے نتیجے میں ہی اُردو شعروادب کا شعور بیدار ہوتا ہے اور اس دور میں یہ عمل نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ دور جدید میں انجمن کے علاوہ بھی کئی ملی ادارے قائم ہوئے جہاں اُردو زبان وادب کی تعلیم کا بھی نظم ہے۔

انجمن آرٹس سائنس اور کامرس کالج کے قیام اور بحیثیت پرنسپل ڈاکٹر سید انور علی مرحوم جیسے کمسٹری کے استاذ مگر اُردو کے خوش فکر شاعر، بہترین نثر نگار، اعلیٰ منتظم اور بے حد متحرک وفعال شخصیت کی آمد کے بعد تو بھٹکل میں گویا اُردو زبان وادب کی ایک تحریک برپا ہوگئی۔ کالج کے دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر افضل علی، پروفیسر رشید کوثر فاروقی، پروفیسر عمر حیات خان غوری، پروفیسر سید منصور علی ندوی اور چند مہینوں کے لیے ہی سہی پروفیسر عبدالباری شبنم سبحانی جیسے اُردو زبان و ادب کے ماہرین بھٹکل میں جمع ہوگئے تھے۔ اسی دور میں کل ہند مشاعرے اور ادبی سیمینار کی روایت قائم ہوئی اور یوں شہر میں اُردو شعرو ادب کا ایک مضبوط سلسلہ شروع ہوا۔

بھٹکل میں اُردو نثر کا آغاز مولوی شریف محی الدین اکرمی کی کتاب 'توضیح المسائل' اور دینی مسائل پر ان کے چند کتابچوں سے ہوتا ہے پھر مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی کی کتاب 'عرب و دیار ہند' ملتی ہے، جو 475 صفحات پر مشتمل ہے اور عرب وہند کے تعلقات اور تاریخ اسلام کے موضوع پر شاہکار تصنیف ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ استاذ گرامی علامہ سید سلیمان ندوی کی خواہش اور حکم کی تعمیل میں انہوں نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔ مولانا محمد فاروق ندوی نے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ خاص طور سے ان کا سفر نامہ 'دو ہفتہ دمشق میں' بہت مقبول ہوا۔

ان دنوں ایک نوجوان مصنف مولانا محمد الیاس ندوی کا قلم ماشاء اللہ بہت متحرک ہے۔ اسلامیات پر ان کی کئی قیمتی تصانیف ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر ہے اور کئی کتابیں لکھی ہیں۔ 'سیرت ٹیپو سلطان شہید' ان کی ایک بے حد معروف ومقبول تصنیف ہے۔ جس کا ترجمہ انگریزی وکنڑا زبان میں بھی شائع ہوا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے نوجوان مولانا محمد فیصل ندوی نے تحریک آزادی میں علماء کے کردار کے عنوان سے اپنی بہترین تحقیق شائع کی ہے۔ خواجہ معین الدین اکرمی مدنی کی ایک ضخیم تصنیف جدید اسلامی معاشرت، حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مرحوم محمد عثمان رکن الدین جو پیشے سے ریٹائرڈ انجینئر تھے مگر بڑا بالیدہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ملی مسائل پر چند کتابچے اور سفرنامے انھوں نے پہلے شائع کیے۔ پھر آئینۂ بھٹکل کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی جو ایک مدت تک شہر میں بعض تاریخی واقعات کے حوالے سے کافی متنازعہ اور بحث ومباحثہ کا موضوع بنی رہی۔ اس کتاب میں قوم نوائط کی علمی، دینی، تعلیمی، تہذیبی اور تاریخی سرگرمیوں کا پہلی بار بھر پور تعارف کرایا گیا ہے۔ بھٹکل کی ایک ممتاز دینی وعلمی شخصیت صدیق محمد جعفری مرحوم بھی تھے۔ تعلیمی اور تربیتی میدان میں آپ کی نمایاں خدمات رہی ہیں۔ آپ کا ادبی وشعری ذوق بھی بہت عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ مولانا ایوب ندوی نے بھی اسلامیات پر تقریباً ایک درجن کتابیں شائع کی ہیں جو فقہ شافعی کے تناظر میں مختلف دینی مسائل پر امت کی رہنمائی کرتی ہیں۔ نوجوانوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی تعلیم وتربیت کے خیال سے محمد زبیر چھپانے بعض بڑے مفید مضامین لکھے ہیں ان کا ایک مجموعہ 'امنگ' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ سرمایہ معلومات ان کی ایک اہم کتاب ہے۔

آج کے دور میں اُردو صحافت ہمارے معاشرے کی ناگزیر ضرورت ہے۔ قرطاس وقلم کی طاقت محسوس کرتے ہوئے ادھر چند برسوں میں کچھ باصلاحیت نوجوان اس میدان میں نمایاں ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے کالج کے پروفیسر نذیر احمد لوہانی مرحوم روزنامہ سالار کی نامہ نگاری اور مسائل اُردو پر اپنی ایک ضخیم کتاب کے لیے خاصے معروف ہیں۔ پروفیسر عبدالقیوم خاں کے بعض افسانے اور خاکے بھی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ پندرہ روزہ الاتحاد بھٹکل کا پہلا اُردو اخبار ہے جو کئی برسوں تک اسماعیل ارشاد خلیفہ کی ادارت میں پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ پھر نامساعد حالات کی بنا پر بند ہوگیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 'الاتحاد' کا نام اور اس کا پہلا شمارہ اس وقت کے ایک نوعمر اور کم سن طالب علم عتیق الرحمٰن شاہ بندری کے فطری صحافتی شوق کا نتیجہ ہے جبکہ اس نام سے پہلے قلمی وال پیپر کا مشغلہ شروع کیا پھر اس کی ماہانہ زیراکس کاپی نکلنے لگی اور پھر منزل بہ منزل یہ مشغلہ پندرہ روزہ 'الاتحاد' تک پہنچ گیا۔ الاتحاد سے علاحدگی کے بعد عتیق الرحمٰن شاہ بندری نے تین سال تک نوائے حیات کے نام سے پہلے ادبی میگزین نکالا پھر انھوں نے چار برس تک 'بھٹکل نیوز' کے نام سے ماہنامہ نکالا اور اب یہی اخبار پندرہ روزہ کی صورت میں 'ساحل نیوز' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد حنیف شباب ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ بمبئی میں دوران قیام جرنلزم کا کورس بھی مکمل کیا اور روزنامہ 'انقلاب' سے بحیثیت سب ایڈیٹر منسلک رہے۔ سہ روزہ دعوت دہلی اور روزنامہ سالار وغیرہ میں مختلف سیاسی و سماجی اور ملی مسائل پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اسی طرح 'ساحل نیوز' میں آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے کے مستقل عنوان سے وہ کالم نگاری میں کچھ نئے تجربے بھی کرتے رہے ہیں۔ اس اخبار کے مستقل لکھنے والوں میں جعفر صادق شاہ بندری بھی شامل ہیں۔ آفتاب حسین کولا یوں تو بطور پیشہ خلیج کی انگریزی صحافت سے وابستہ ہیں مگر اُردو اخبارات میں بھی اکثر اُن کے مضامین آتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نئی نسل کے کئی افراد میں صحافتی ذوق پیدا ہوا ہے اور ان کی قلمی مشق جاری ہے۔ اس حیثیت سے ہمارے شاگردوں میں ابرارالحق نظمی، عبدالستار نیلاور، ابو ہریرہ اکرمی، جاوید لقمان، صلاح الدین ظہیر شوپا وغیرہ نمایاں نام ہیں جن سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ بھٹکل کی اُردو صحافت میں پندرہ روزہ الداعی کا ذکر بھی ضروری ہے، جو 1975 میں ایمرجنسی کے نفاذ اور سہ روزہ دعوت دہلی کے بند ہونے کے بعد ادارہ تربیت اخوان

سے وابستہ بھٹکلی نوجوانوں نے ممبئی سے جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر حسن باپا ایم ٹی اس کے ایڈیٹر تھے۔ وہ دو برسوں تک پابندی سے یہ اخبار نکالتے رہے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی بھٹکل کے نوجوان سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ عنایت اللہ گوائی کا ساحل آن لائن انٹرنیٹ پر بہت مقبول ہے۔ عبدالمتین منیری جو دبئی میں مقیم ہیں خاصا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں اور اخبارات و رسائل میں مختلف علمی و دینی مسائل پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے ادبی و شعری کیسٹس بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے انٹرنیٹ پر بازگشت کے نام سے ایک ادبی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ محسن شاہ بندری اور ان کے رفقا نے بھٹکلیز ڈاٹ کام کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی شروع کیا ہے۔ جو بہت مقبول ہے۔

بہر حال یہ بھٹکل میں ہونے والی نثری کاوشوں کا مختصر جائزہ تھا۔ آیئے اب یہاں کی شعری سرگرمیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے شعرا کا کلام اپنے شعری محاسن فنی خصوصیات، اپنی بے ساختگی، شگفتگی اور سادگی کے لیے لائق تحسین ہے۔ کبھی کبھی تو واقعی بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ مراکز اُردو سے دور ہونے کے باوجود تخلیقی اور فنی سطح پر بعض چیزیں یہاں بڑے معرکے کی وجود میں آئی ہیں۔ ایک بات اور عرض کر دوں کہ اس 'حیرت و مسرت' کے اظہار میں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ عرصہ پہلے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے کلام فطرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا تھا۔ پھر انجمن حامی مسلمین کی پلاٹینم جوبلی تعلیمی سیمنار کے موقعے پر پورے ملک سے مشاہیر ادبا، ماہرین تعلیم اور دانشور حضرات بھٹکل تشریف لائے اور انھوں نے بھی بھٹکل کے ادبی و شعری ماحول اور تعلیمی و تہذیبی صورت حال کو دیکھ کر اپنی مسرت کے ساتھ حیرت کا اظہار کیا اس سلسلے میں سر دست میں صرف انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے اس مفصل مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے بھٹکل کو اُردو مراکز سے دور اُردو کا ایک اہم مرکز قرار دیتے ہوئے اپنے بہترین تاثرات کا اظہار کیا چند جملے پیش خدمت ہیں:

''انھوں نے جس انداز میں میرا استقبال کیا اور جس زبان میں ان سے گفتگو ہوئی اس سے مجھے اور بھی حیرت ہوئی بہت ہی صاف شستہ تلفظ اور دہلی و لکھنؤ کا سا انداز گفتگو۔ مجھے ان حضرات کی زبان اور انداز گفتگو پر حیرت ہو رہی تھی۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا کہ بھٹکل کے کتنے لوگ شمالی ہند رہ کر آئے ہیں؟ جواب ملا ایک بھی نہیں۔ میرے لیے ابھی تک ان حضرات کی زبان اور انداز گفتگو ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ...... بھٹکل میں اُردو کا بہت اچھا ماحول ہے، جو لوگ بھٹکل سے ناواقف ہیں جیسا کہ اب تک میں تھا ان کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہوگا کہ دہلی سے تقریباً تین ہزار میل دور جنوبی ہند کے کسی خطے میں اُردو کا ایسا چلن ہوگا اور وہاں سے ایسے خوبصورت رسالے شائع ہوتے ہوں گے۔ اُردو کی اس سے بڑی طاقت اور کیا ہوگی۔''

(ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی بابت 22 ستمبر 2000)

بھٹکل میں اس وقت درجنوں شعرا پرورش لوح و قلم میں مصروف ہیں اور اس بات کے اظہار میں مجھے کوئی تکلف نہیں کہ اس کاروان شعر و ادب کے سربراہ اور سپہ سالار ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی ہیں۔ جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ کی نظمیں ایک عرصہ تک انٹر میڈیٹ اُردو کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ اور پورا کرناٹک، شعریات فطرت سے مستفید ہوتا رہا ہے۔ فطرت ایک کہنہ مشق اور بزرگ شاعر ہیں جن کے یہاں شاعری کی قدیم روایات بھی ہیں، اور جدید رجحانات بھی۔ ان کے یہاں زبان و بیان کی عام ناہمواری یا جدید شاعری کی بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ کلام میں سادگی، صفائی، روانی اور برجستگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ غزل کا کلاسیکی لب و لہجہ ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر کلام میں کہیں بھی آورد کا احساس نہیں ہوتا۔ ہر جگہ آمد ہی آمد ہے۔ ان کی شاعری میں فکر و فن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اور در اصل یہی چیز معراج سخن ہے۔

فکر و فن کی پاکدامنی ہے معراج سخن
اپنا انداز تغزل باوضو ہے دوستو

فطرت کا فن پاکیزہ اور تغزل باوضو ہے، انھوں نے صحت مند تصور حیات اور زندگی کے حقائق کو پوری جذباتی شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تصانیف اپنے دامن میں غزلوں کے دوش بدوش نظموں کی بھی ایک کہکشاں سمیٹے ہوئی ہیں۔ لہٰذا غزلوں میں رمز و ایما کے ساتھ لطیف پیرائے ہیں لیکن نظموں میں راست بیانی اور وضاحت کے ساتھ انھوں نے اپنی باتیں کہی ہیں۔

میں روایت اور جدت کا علمبردار ہوں
فکر کی تاریکیوں میں ابر گوہر بار ہوں
فکر صالح مجھ کو اسلامی ادب کی دین ہے
شاعری جس کی بدولت میرے دل کا چین ہے

فطرت کے یہاں خدا پرستانہ انقلاب کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کی دعوت بھی

مجھے تاریکی ایام کا خطرہ نہیں فطرت
اندھیرے میں چراغ دل فروزاں کر کے چھوڑوں گا
جنوں میں حوصلہ درکار ہے خارا شگافی کا
فقط گلکاری لفظ و بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

ایس ایم سید عبدالرحمن باطن بزرگ شاعر ہیں جن کی شاعری میں ان کے مطالعے کی گہرائی، تجربے کی وسعت اور مشاہدے کی شدت صاف نظر آتی ہے۔ آپ ایک زمانہ تک گورنمنٹ جونیئر کالج اُڈپی میں بحیثیت پرنسپل خدمت انجام دینے کے بعد خلیجی ممالک کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے، اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھٹکل کی ادبی و سماجی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں۔ آپ ایک پختہ فکر اور صاحب فن استاذ شاعر ہیں جو گذشتہ تین دہائیوں سے پرورش لوح و قلم کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود حیرت ہے کہ اب تک آپ نے اپنے مجموعہ کلام کی ترتیب و اشاعت کی جانب توجہ نہیں دی۔ جو آپ کی صوفیانہ بے نیازی اور باطنی بلندی کی علامت ہے۔ لیکن بہر صورت اب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا چاہیے۔ باطن کی شاعری میں جدید حسیت، عصری مسائل اور صحت مند نظریۂ حیات کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہم داغ ہائے دل کی صدا مانگتے رہے
نغمے تڑپ تڑپ کے نوا مانگتے رہے
ہر طرف بانگ درا گونجی مسافر چل پڑے
دیکھتے ہو تم بھی اے باطن کدھر جلدی کرو
چشم باطن کو رہی نقش صداقت کی تلاش
لوگ ہیں زر کے پرستار خدا خیر کرے

عبدالرحیم ارشاد، محمد علی قمر، برماور اسماعیل حسرت اور محمد حسن معلم مرحومین ایسے شعرا تھے جنھوں نے بھٹکل میں اُردو شعر و شاعری کا گرمجوش ماحول بنایا اور ہمیشہ مشاعروں میں رونق کے باعث بنے۔ 1990 کی دہائی میں ان چاروں شعرا کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوا۔ ان شعرا کے یہاں فکر کی صلابت کے ساتھ فن کی پختگی، لہجے کی ندرت اور شعری انفرادیت پوری طرح موجود ہے۔

عبدالرحیم ارشاد مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا 'نقش نوائط' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا نوائطی ادب و شاعری سے سروکار زیادہ تھا۔ مشاعروں میں ان کے اُردو گیت بڑے مقبول تھے۔ قومی یکجہتی کے ایک جلسے میں ان کی ایک نظم میں نے سنی

تھی۔ جو اپنے اندر بڑا گہرا تاثر رکھتی ہے۔ ارشاد مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گذرا ہے، لہٰذا ان کی شخصیت اور شاعری میں بھی روشن خیالی اور ترقی پسندی کے عناصر موجود رہے ہیں۔

محمد علی قمر مرحوم نے بمبئی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا تھا اور وہیں ایک ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن بھٹکل منتقل ہوگئے اور آخری سانس تک بھٹکل کی ادبی وتہذیبی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک رہے۔ بڑی با وقار اور سنجیدہ شخصیت تھی، یہ سنجیدگی اور متانت ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔

فکر مظلوم ہے ظالم سے بھی دلداری ہے
قابل غور زمانے کی اداکاری ہے

برماور اسماعیل حسرت خوش فکر شاعر تھے۔ فن پر اچھی دستگاہ تھی۔ ان کے اشعار مسرت کے ساتھ بصیرت کا بھی سامان رکھتے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا مجموعۂ کلام 'ستاروں سے آگے' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس پر فطرت بھٹکلی نے ایک بھرپور مقدمہ تحریر کیا ہے اور بجا طور سے ان کے فکر و فن کی تعریف وتحسین کی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

معجزوں کے واسطے عزم خلیلی شرط ہے
کوئی شعلہ یونہی حسرت گلستاں ہوتا نہیں
کوئی تحریک نہیں چلتی محرک کے بغیر
جنبش مرغ نے صیاد کو دعوت دی ہے
رقص مسافر رقص بسمل رقص خنجر دیکھنا
ہے میسر عصر نو کو کتنے منظر دیکھنا

محمد حسن معلم مرحوم بھٹکل کے ایک نمائندہ مگر کم گو شاعر تھے۔ کلام معیاری ہوا کرتا تھا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ آپ نے نظمیں بھی کافی کہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری شاعر کی شخصیت کا عکس جمیل ہوتی ہے۔ سادگی و پرکاری ان کی شخصیت کی طرح ان کے فن کی بھی نمایاں خصوصیت ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے بکھرے ہوئے کلام کو آپ کے برادر عزیز ظفر علی معلم نے تلاش کیا۔ ترتیب دیا اور افکار معلم کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ جس میں ان کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کا نواطی کلام بھی محفوظ ہوگیا ہے۔ آپ نے عصری مسائل اور موضوعات پر بعض بہترین نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں محبوب یزداں، التجا، شاعر ملت کے حضور، تحفہ، عزم، نقش ونگار، نظارۂ جنوں، سوغات، دار و رسن، آزادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اب غزل کے چند اشعار دیکھیے:

نہیں کچھ شوق تجھ کو جستجوئے راز قدرت کا
مرے سینے میں پوشیدہ شرار حسرت دیدار
روز و شب تیرے تصور کے طفیل
زیست سر افراز ہو کر رہ گئی

ظفر علی معلم بھی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور اپنے برادر محترم محمد حسن معلم کے نقش قدم پر گامزن نظر آتے ہیں۔ آپ حکومت مہاراشٹر میں سکریٹری محکمۂ تعلیم کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھٹکل میں قیام پذیر ہیں۔ اور یہاں کی تعلیمی وتہذیبی اور ادبی وسماجی سرگرمیوں میں متحرک کردار ادا کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تخلیق کا سوتا خشک ہو چکا ہے یا ہنوز جاری ہے۔ کیونکہ آپ مشاعروں میں اپنا کلام نہیں سناتے، اخبارات و رسائل میں شعری تخلیقات نظر نہیں آتیں۔ غالباً اس کی وجہ وہ سادگی اور انکساری ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ آپ کی چند غزلیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کے رچاؤ اور فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے عناصر بھی آپ کی غزلوں میں موجود ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

برسر عام جسے کہنے سے گھبراتا ہے
چپکے چپکے وہ میرے کانوں میں کہہ جاتا ہے
خود ستائی کی وبا عام ہوئی ہے اتنی
دیکھیے جس کو وہ خود اپنے ہی گن گاتا ہے
کہتا پھرتا ہے وہ اوروں سے ظفر سے مل لو
اور خود مجھ سے وہ ملتے ہوئے کتراتا ہے
اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا
قرض ہونگے مرے ادا کیسے

کوثر جعفری بھٹکل کے موجودہ شعری منظرنامہ کا ایک اہم نام ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری اپنے وفور شوق اور شدت احساس کے باعث بہت مقبول ہے۔ 'اوج سخن' کے نام سے آپ کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں کرناٹک کے معروف نعت گو شعرا کا تذکرہ مع نعتیہ کلام 'جلوۂ رحمت' کے نام سے شائع کیا ہے۔ 'موج سخن' آپ کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کے مقدمہ میں پروفیسر عمر حیات خان غوری نے بجا طور سے یہ لکھا ہے کہ 'کوثر جعفری فطری شاعر ہیں۔ ان کا ذہن ومزاج ہی شعری سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے۔ کلام کی بے ساختگی، زبان کی سلاست و روانی، فکر کا ترفع اور روز مرہ محاوروں کے استعمال میں چابکدستی دعوت مطالعہ دیتی ہے۔'' چند اشعار دیکھیے:

زندگی مصروفیت کا نام ہے
موت سے پہلے کسے فرصت ملے
دیوانہ کوئی جانب صحرا اگر گیا
حیرت کی بات کیا ہے وہ اپنے ہی گھر گیا
سوکھے ہوئے پتوں کو پیروں سے نہ روندو تم
یہ گذری ہوئی رت کی بے رنگ نشانی ہے
نہ گل اپنے نہ خار اپنے نہ مونس باغباں اپنا
چمن میں کس کو آخر ہم بنائیں راز داں اپنا

ڈاکٹر محمد حنیف شباب جدید لب و لہجے کے خوش فکر شاعر ہیں جو بھٹکل کی ادبی وسماجی سرگرمیوں سے لے کر فکر و تخلیق کے محاذ تک خاصے متحرک اور فعال ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام 'سلگتے خواب' شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی جدت پسند طبیعت شاعری کی مختلف اصناف میں نت نئے تجربے پر آمادہ کرتی ہے، شعری اظہار اور فن پر قدرت ہے۔ آپ کی بعض آزاد نظمیں بہت ہی کامیاب اور متاثر کرنے والی ہیں۔ غزلوں کے چند اشعار دیکھیے:

خواب کے موتی تو سارے ہی بکھر کر رہ گئے
زندگی کرنا ہمیں آیا نہیں کیا کیجیے
حق پرستی کا سبق بھی دیجیے دنیا کو اور
مصلحت کی ڈگڈگی پر بھی نچایا کیجیے
سر مرا اچھالا ہے جس نے اپنے نیزے پر
وہ نہ تھا یزیدوں میں، تھا مرے عزیزوں میں

حنیف شاہ شبنم بھٹکل کے مشاعروں میں اپنی شعلہ نوائی کے لیے خاصے مشہور ہیں۔ عصری حسیت اور حالات حاضرہ کا بیان آپ کی شاعری کا امتیاز خاص ہے۔ نئی نسل کا بحران اور ان کا باغیانہ رویہ شبنم کی شاعری میں نمایاں ہے۔ 'شبنمی موتی' کے نام سے اُن کے منتخب اشعار کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جام میں شامل کہیں زہر ہلاہل تو نہیں
آج ساقی نے مجھے ہی کیوں پلایا دیر تک
رو رہے تھے اس کے بچے وہ کھلا سکتا نہ تھا
غم کے اس منظر نے شبنم کو رلایا دیر تک

سید اشرف برماور کی شاعری بلا شبہ فن کا رسوخ حاصل کر چکی ہے۔ بھٹکل کی شعری محفلوں میں آپ کا کلام شوق سے سنا جاتا ہے۔ کلام میں سنجیدگی، متانت اور خیال آرائی خوب ہوتی ہے۔ احباب کا مطالبہ ہے کہ اب آپ کا مجموعہ کلام منظر عام پر آنا چاہیے۔ چند اشعار دیکھیے:

دار پر مجھ کو چڑھا کر بھی نہیں خوش دنیا
اے معلوم میرا لخت جگر زندہ ہے
رات کی قبر میں ایک نجم سحر زندہ ہے
آج کے دور میں اشرف سا بشر زندہ ہے

یہ بات بھی اپنی جگہ قابل ذکر ہے کہ اشرف صاحب کی

رفیقۂ حیات محترمہ نورالنساء نور بھی خاصا اچھا شعری ذوق رکھتی ہیں، اُن کی چند نظمیں میری نظر سے گذری ہیں، جو نسوانی جذبات کے دلکش اظہار کا نمونہ ہیں۔

شاعرات بھٹکل میں دو نام اور ملتے ہیں جو اتفاق سے میری شاگردہ بھی رہی ہیں، مناسب یہ ہے کہ یہیں پر ان کا بھی ذکر ہو جائے۔ فرزانہ فرح محتشم، انجمن گرلز کالج میں اُردو کی لکچرر ہیں، خود بھی اچھی غزل کہتی ہیں اور ان دنوں بھٹکل میں اُردو غزل کے ارتقا پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔ شبانہ تمکین یہاں سے متصل علاقہ منکی میں رہتی ہیں، عربی مدرسہ سے عالمہ ہیں اور اب وہیں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ انجمن کالج بھٹکل کے اُردو یونیورسٹی اسٹڈی سینٹر سے بی اے بھی کر رہی ہیں۔ شبانہ تمکین کے چند اشعار دیکھیے، نسوانی احساسات و جذبات کا کیسا خوبصورت اظہار ہے:

ٹھہر سکے نہ کہیں جستجو میں منزل کی
گھنے شجر تھے بہت گرچہ اپنی راہوں میں
تو سنگ اور گہر کی تمیز کیا جانے
کہ یہ شعور تو اہل نظر میں ہوتا ہے
نبھانی آئی نہ تم کو ہی دوستی ورنہ
خلوص میں تھی کمی نہ مری وفاؤں میں
حرف جو بھی زبان سے نکلا
تیر جیسے کمان سے نکلا

عبدالعلیم شاہین کی شاعری توانا اور جدید حسیت کی آئینہ ہے۔ کوثر جعفری کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے، آپ ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان سے چھوٹے ایک بھائی اور ہیں نام صادق نوید ہے۔ بھٹکل کے کسی بھی مشاعرے میں شاعری کا یہ مثلث ضرور ہوتا ہے، تینوں ترنم سے پڑھتے ہیں اور مشاعرہ لوٹتے ہیں۔ شاہین کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

نئی سحر اور نیا آفتاب دینا ہے
ہمیں جہاں کو ایک انقلاب دینا ہے
جو خون گرم کرے اور زندگی دے دے
حیات بخش زمانہ کو خواب دینا ہے
جو معتبر ہے اور سرچشمۂ ہدایت ہے
جہاں کے ہاتھ میں ایسی کتاب دینا ہے

علی باشا بسمل بھٹکل کی تعلیمی و تہذیبی اور ادبی و شعری سرگرمیوں سے پوری طرح منسلک ہیں۔ ادبی و شعری نشستوں میں اپنا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں اور پسند کیے جاتے ہیں، چند اشعار دیکھیے:

نہ ہو جائے گلستاں خاک ان کی آہ سوزاں سے
نہ سمجھو تم طیور بے زباں سے کچھ نہیں ہوتا
وہی تیرگی، وہی ظلمتیں وہی بے بسی، وہی کلفتیں
ترے میکدے میں بھی ساقیا مرے درد دل کی دوا نہیں

پیام سعیدی بھٹکل کے کہنہ مشق شاعر ہیں، جوان دنوں بمبئی میں مقیم ہیں اور وہاں کی ادبی اور فلمی دنیا ہی اُن کے فکر و عمل کی جولان گاہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کی رومانی دنیا اور پرچھائیوں کے دیس نے ان کے فکر و فن پر گہرے اثرات مترتب کیے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

زلفوں کی مدہوش گھٹائیں تم نے جنھیں آنکھوں سے پلائے
اس نہیں ان کو جنت بھی میخانے میخانے ٹھہرے
چمن اُداس ہر اک پھول پیاسا پیاسا لگے
ترے بغیر یہ ماحول بے مزہ سا لگے
انساں کی بے بسی کا تو میں حال کیا کہوں
اس شہر کا پرند بھی بے پر ملا مجھے
سرمایہ دار سارے ملے فطرتاً فقیر
ہر اک غریب دل کا تونگر ملا مجھے

اقبال سعیدی کویت میں مقیم ہیں اور تعطیلات میں بھٹکل کی ادبی محفلوں کو رونق بخشتے ہیں۔ آپ کی شعری تخلیقات اکثر اخبارات و رسائل کی زینت بنتی ہیں۔ اسی طرح سید ابوبکر ماگی دوبئی میں رہتے ہیں اور بڑی سادگی اور صفائی کے ساتھ جذبہ و احساس کی شاعری کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'احساس' شائع ہو چکا ہے۔ دو اشعار مزید ملاحظہ کیجیے:

گن رہے ہیں وہ دوسروں کے عیوب
سامنے ان کے آئینہ کیجیے
حوصلے ہوں بلند اور ارادے جواں
توڑ لائے گا یہ کہکشاں آدمی

بھٹکل کے ادبی و شعری ماحول میں عبداللہ دامودی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو بڑی خوبصورت اور فصیح و بلیغ زبان میں تقریر کرتے ہیں، مشاعروں کی دلچسپ نظامت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ عام طور سے لوگ آپ کو شاعر نہیں مانتے مگر مشاعروں میں آپ کی آزاد نظمیں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ قومی یکجہتی کے ایک جلسہ میں آپ کی ایک کامیاب نظم مجھے اب تک نہیں بھولی ہے۔ محمد علی پرواز نعمان اکرمی، عبداللہ رفیق، مصطفی تابش، سلیم نازش اور ایمن فردوسی بھی پرورش لوح و قلم کر رہے ہیں۔ طوالت کے خوف سے جن کا تفصیلی تذکرہ نظر انداز کرتا ہوں۔ نئی نسل کے نوعمر اور نو مشق شعرا میں رحمت اللہ راہی، جاوید باطن، صادق اسرمتا، شکیل احمد فطرت، اسحاق حسان، ابوالحسن مغاز، اور سالک برماور کی مشق سخن جاری ہے اور یہ نوجوان اکثر حوصلہ افزا شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

کسی بھی شہر میں ادبی ماحول کو قائم کرنے یا خوشگوار شعری فضا بنانے میں صرف قلمکاروں اور فنکاروں کا حصہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ادب نواز سامعین اور باذوق عمائدین شہر کی شرکت اور حمایت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ میں اس موقع پر چند ایسی دلنواز شخصیات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں، جن کا براہ راست نہیں تو بالواسطہ حصہ ضرور ہے۔ ان میں محتشم عبدالغنی سرفہرست ہیں جو اوائل عمری میں حشمت بھٹکلی کے نام سے مشق سخن بھی کیا کرتے تھے۔ ایس ایم سید خلیل الرحمن جو پیشے سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور زیادہ تر دبئی میں ہوتے ہیں، مگر بھٹکل کی ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی طرح محمد ہاشم شاہ بندری، محمد یونس قاضیا اور میرے مخلص دوست دوبئی والے محمد اسماعیل شاہ بندری جب بھی بھٹکل آتے ہیں تو یہاں کی ادبی و شعری سرگرمیوں کو متحرک کر دیتے ہیں۔ مقامی سطح پر ڈاکٹر بدرالحسن معلم، قاضی محمد انصار، محمد اسماعیل دامودی، جوکا کو عبدالرحیم، دامدا حسن شبر، قاضیا محمد مزمل ایڈوکیٹ، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا قاضیا عبدالعظیم ندوی، مولانا علی سکری اکرمی، مولانا عبدالعزیز ندوی، قادر میراں پٹیل، سید عبداللہ لنکا، محمد مظفر کولا اور محتشم عبدالرحمن جان صاحبان کا نام ناقابل فراموش ہے جنھوں نے اپنی اخلاقی حمایت اور عملی تعاون سے بھٹکل میں اُردو کے ادبی و شعری ماحول کو تقویت پہنچائی ہے۔ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں انجمن کالج بھٹکل کے رول کا ذکر کیا تھا اور اب اس طویل گفتگو کے خاتمہ پر بھی انجمن کالج بھٹکل کے اُن فارغین کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے ہمیشہ ادبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جن میں سعداللہ دامدا، اسماعیل صدیق، محسن کھروری، الطاف کھروری، ایس ایم سید عبدالعظیم، یٰسین عسکری، محمد ذاکر اور شیرالی کے امجد حسین، شہباز سرگرو اور ہارون رشید کے نام نمایاں ہیں۔ جن کی موجودگی اور کارکردگی ادبی و شعری نشستوں کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ آخر میں دعا کرتا ہوں کہ:

داتا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

■

Dr. Shah Rashad Usmani
Head Dept of Urdu
Anjuman Degree College & PG Centre
Bhatkal - 581320 (Karnataka)

حقانی القاسمی

نگارشاتِ خواجہ احمد عباس کی بازیافت

[آٹھ جلدوں پر مشتمل کلیات کے حوالے سے]

اردو زبان وادب میں خواجہ احمد عباس (پ:7 جون 1914، و:1 جون 1987) جیسی متنوع شخصیتیں کم ہیں جن کا دائرۂ عمل کئی جہتوں اور زاویوں پر پھیلا ہوا ہو اور جو صرف ایک ہی زبان میں محصور نہ ہو۔ خواجہ احمد عباس کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے نہ ایک زبان اور نہ ایک میدان کو منتخب کیا بلکہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا اور صرف ادبیات کو ہی اپنا محور ومرکز نہیں بنایا بلکہ سماجیات، سیاسیات، اقتصادیات، فنون لطیفہ اور دیگر عالمی عصری مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ ایک طرف جہاں انھوں نے فکشن کے ذریعے عصری، سماجی، سیاسی موضوعات کو پیش کیا وہیں اپنے کالم کے ذریعے سماجی اور سیاسی شعور کی بیداری کا بھی کام لیا۔ ان کی گفتگو بنیادی طور پر عوام سے تھی اس لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں عوامی مسائل کو ترجیح دی اور اس کے لیے جتنے بھی ذرائع ہو سکتے تھے سب کا استعمال کیا۔ فلم کے ذریعے بھی انھوں نے وہی کام لیا جو وہ اپنے سیاسی کالموں کے ذریعے لیتے رہے۔ بنیادی طور پر وہ عوام کے فنکار اور عام آدمی کے تخلیق کار تھے۔ ان کے لیے عوامی مسائل اور موضوعات زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا بنیادی مقصد ایک مثالی سماج اور آئیڈیل سوسائٹی کی تشکیل ہے جہاں سب کو آزادی اور سماجی معاشی انصاف اور مساوات ملے۔ سماج سے ان کی بڑی گہری وابستگی تھی۔ ان کی کہانیوں کے موضوعی سروکاروں میں استعماریت کی مزاحمت، سماجی شعور کی بیداری، اربنائزیشن کے منفی اثرات اور امن و دوستی ہیں۔ انھوں نے جاگیردارانہ سماج، استعماریت اور آرتھوڈوکسی کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کا کہنا تھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان تو فاصلے کم ہو گئے مگر آدمی او ر آدمی کے درمیان دوریاں کم نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ خیال بھی ان کی خوب صورت سوچ کا مظہر ہے کہ ایکس کمروں میں ایک آدمی رہتا ہے اور کہیں کہیں ایک کمرے میں ایکس آدمی۔ اس طرح کا سماجی اور طبقاتی تفاوت ختم ہونا چاہیے۔ ان کے بیشتر کردار اسی طرح کے ترقی پسندانہ

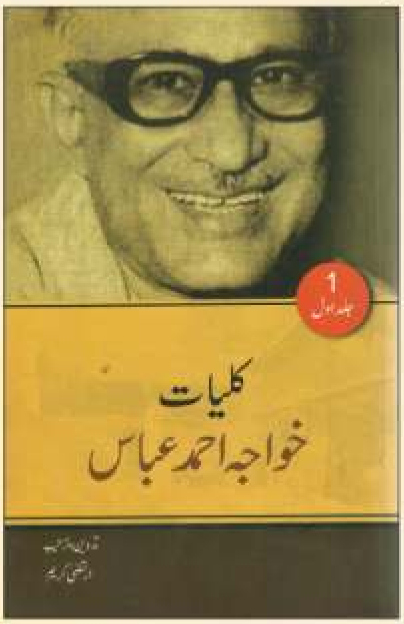

افکار کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں کے مرکز میں Common man ہے اس لیے بھوک، غربت، معاشی سماجی استحصال پر ان کی کہانیاں زیادہ ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے استحصال، آزادی اور حقوق کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور مضبوط نسائی کردار بھی عطا کیے ہیں۔

(ان کے thematic concerns کے لیے دیکھیے: The Short Stories of K.A. Abbas, (By H.S Chandalia

خواجہ احمد عباس نے مختلف اصناف میں جو تحریریں چھوڑی ہیں وہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کو سمیٹنا بہت مشکل کام تھا۔ انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، مضامین، مکالمے، سفرنامے، سوانح اور کالم لکھے۔ اس طرح ان کی تحریروں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور خوبی کی بات یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس نے بیشتر تحریروں میں جمالیاتی اور فنی معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی تحریروں کو جمع کرنا اور انھیں موضوعی اور صنفی ابواب بندی کے ساتھ مربوط اور منظم شکل میں پیش کرنا یقیناً ایک کارِ دشوار تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ پروفیسر ارتضی کریم نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ خواجہ احمد عباس کے بیشتر تحریری سرمایے کو آٹھ جلدوں میں سمیٹ دیا اور کوشش یہ کی ہے کہ ان کی بکھری ہوئی تحریریں کلیات میں شامل ہو جائیں تاکہ خواجہ احمد عباس کی مجموعی اور کلی قرأت ممکن ہو سکے۔ پروفیسر ارتضی کریم اپنے اس مقصد

میں کامیاب ہیں کہ انھیں خواجہ احمد عباس کی بیشتر تحریریں دستیاب ہوگئیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتب کردہ کلیات آٹھ جلدوں پر محیط ہے۔ یہ کلیات قومی اردو کونسل، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

پہلی، دوسری اور تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ جلد اول میں ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں چھبیس سال کی عمر میں لکھا گیا ان کا پہلا افسانہ 'ابابیل' بھی شامل ہے جو رسالہ 'جامعہ' نئی دہلی جون 1936 میں شائع ہوا تھا۔ یہ خواجہ احمد عباس کی سب سے بہترین کہانی ہے جو دنیا کی بہترین کہانیوں کے انتخاب West German Anthology میں بھی شامل ہے جس کے لیے ہندوستان سے خواجہ احمد عباس کے علاوہ صرف رابندر ناتھ ٹیگور اور ملک راج آنند کی کہانیاں ہی منتخب کی گئی تھیں۔

اس کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعوں 'ایک لڑکی' (1942)، پاؤں میں پھول (1948)، زعفران کے پھول (مارچ 1948)، میں کون ہوں (1949)، کہتے ہیں جسے عشق (1953) سے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل جتنے بھی افسانے ہیں وہ فنی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان پانچوں مجموعوں میں جن افسانوں

ان کا پہلا افسانہ 'ابابیل' بھی شامل ہے جو رسالہ 'جامعہ' نئی دہلی جون 1936 میں شائع ہوا تھا۔ یہ خواجہ احمد عباس کی سب سے بہترین کہانی ہے جو دنیا کی بہترین کہانیوں کے انتخاب West German Anthology میں بھی شامل ہے جس کے لیے ہندوستان سے خواجہ احمد عباس کے علاوہ صرف رابندر ناتھ ٹیگور اور ملک راج آنند کی کہانیاں ہی منتخب کی گئی تھیں۔

کو شامل کیا گیا ہے وہ مختلف مسائل اور موضوعات پر محیط ہیں۔ ان سے خواجہ احمد عباس کا فنی اور فکری تنوع بھی سامنے آتا ہے۔

دوسری جلد بھی افسانوں پر مشتمل ہے جس میں خواجہ احمد عباس کے افسانوی مجموعے 'گیہوں اور گلاب' (1955)، دیا جلے ساری رات (1959)، نئی دھرتی نئے انسان (1977)، نیلی ساڑی (1982)، سونے چاندی کے بت (1986) سے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی جو افسانے ہیں وہ اس اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں کہ خواجہ احمد عباس نے ان میں تکنیکی تجربے بھی کیے ہیں۔ خاص طور پر 'روپے آنہ پائی' یہ ایک نیا تجرباتی افسانہ ہے جس میں آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ Indian Literary Review کو 18 دسمبر 1970 میں انٹرویو دیتے ہوئے خواجہ احمد عباس نے اس کہانی کے بارے میں بتایا کہ جب ایک انگریزی میگزین کو یہ کہانی بھیجی گئی تو اکاؤنٹ بک کی تفصیل سمجھ کر اسے واپس کر دیا مگر جب خواجہ احمد عباس نے اس کی وضاحت کی تو کہانی اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی۔ اس کہانی کا بہت عمدہ تجزیہ محترمہ طاہرہ نقوی نے کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: Rupiya, Anna Pai: A Life Told on the Pages of an Accounts Ledger)

اس طرح کے اور بھی تجربے انھوں نے کیے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا کمال یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ خاص طور پر سماجی معاملات اور معمولات پر بہت گہری نظر ہے۔ انھوں نے Humanistic Concern کی کہانیاں لکھی ہیں۔ عوامی درد و کرب سے ان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں کی اساس ان مسائل اور موضوعات پر ہے جن سے عوام کا شب و روز کا رشتہ رہا ہے۔ وہ عوامی مسائل کو بڑی ہی تخلیقی ہنرمندی اور فنکاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور سماج کے نشیب و فراز اور مد و جزر کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کا رشتہ اس افادیت سے جڑ جاتا ہے جس کی توقع ادب سے کی جاتی ہے۔ وہ ایک مقصدی فن کار ہیں اسی لیے اپنے افسانوں میں مقصدیت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے خیالات کی ترسیل ہر خاص و عام تک ہوجائے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ کہانیاں شامل کی گئی ہیں جو ان کے کسی بھی مجموعے میں نہیں ہیں۔ اس جلد کی کہانیاں اس اعتبار سے اہم ہیں کہ یہ مختلف رسائل اور اخبارات میں تلاش و جستجو کے بعد شامل کی گئی ہیں۔ اس جلد میں ہفت وار عوامی دور نئی دہلی، شاہراہ، نقوش، شاعر، ساقی، شمع، بیسویں صدی سے کہانیاں لی گئی ہیں۔ اس میں تقریباً چالیس افسانے ہیں اور یقینی طور پر ان

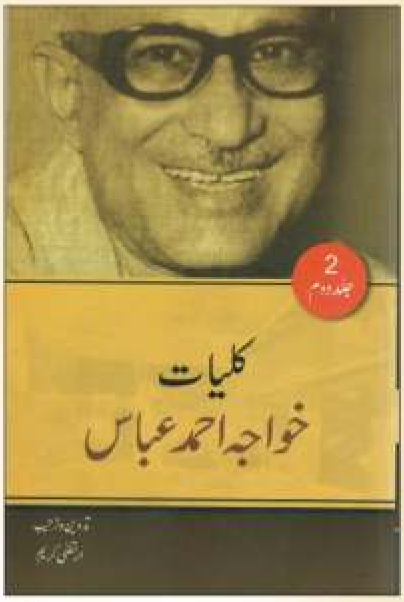

افسانوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ خاص طور پر آؤ تاج محل کو ڈھائیں، پانچ گھڑوں کا تاج محل، تین عورتیں اور ایک ریل، دل ہی تو ہے، پیرس کی ایک شام، انٹلکچول اور بینگن، اہم افسانے ہیں اور یہ وہ افسانے ہیں جن پر شاید کم گفتگو ہوئی ہے۔ جبکہ موضوعی اعتبار سے یہ افسانے بہت قیمتی ہیں۔

ان تین جلدوں میں خواجہ احمد عباس کی تقریباً پوری افسانوی کائنات سمٹ آئی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کے افسانوں کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''انھوں نے تقریباً سوا سو کہانیاں لکھی ہیں اور ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے اور بقیہ افسانوی مجموعے انھی دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے جنھیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرر کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ''بعض لوگوں نے ان کے مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کرلیا ہے۔ یہی سہو رام لعل اور پروفیسر صغریٰ مہدی سے ہوا ہے۔''

اردو کی طرح انگریزی اور ہندی میں بھی ان کی کہانیاں چھپی ہیں۔ اردو میں ان کی کہانیوں کا ایک انتخاب مشہور افسانہ نگار رام لعل نے 'خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے' (1988) کے عنوان سے شائع کیا ہے جس میں سترہ افسانے ہیں۔ ایک افسانہ 'سردار جی' بھی ہے جسے 'میری موت' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس افسانے پر سکھوں نے احتجاج کیا تھا اور خواجہ احمد عباس پر مقدمہ بھی چلایا گیا تھا جس کی تفصیل خواجہ احمد

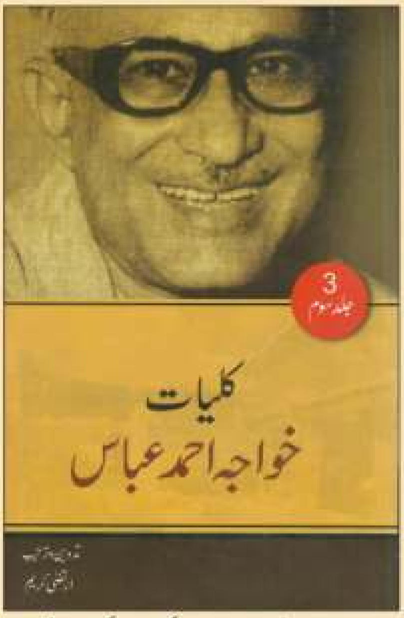

عباس نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی بیان کی ہے۔ محترمہ صغریٰ مہدی نے بھی 'اگر مجھ سے ملنا ہے' (2014) کے عنوان سے ان کے افسانوں کا انتخاب شائع کیا تھا جس میں 18 افسانے شامل ہیں۔

انگریزی میں ان کی جو کتابیں مشہور ہیں ان میں I am not an Island (جس کا پیش لفظ امیتابھ بچن نے لکھا ہے اور سریش کوہلی نے اسے ایڈٹ کیا ہے)، Bread, Beauty Revoution (انگریزی میں عفت فاطمہ اور سیدہ سیدین حمید نے ایڈٹ کیا ہے):

- Inquilab
- An Evening in paris and other Stories
- Sardar Ji and other Stories,
- An Evening in Lucknow,
- Bombay My Bombay,
- The Walls of Glass,
- That Woman

قابل ذکر ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نہ صرف اردو بلکہ ہندی اور انگریزی کے بھی مقبول افسانہ نگار تھے اور ان کو پسند کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ تھا جو کسی ایک لسانی دائرے میں محصور نہیں تھا۔ ان پر اردو میں راج نرائن راز نے 'خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار' (1989) کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں مشاہیر ادب کی تحریریں شامل ہیں اور خواجہ احمد عباس کے شخصی اور فنی زاویوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ عباس رضا نیر اور ڈاکٹر غلام حسین کی کتابیں بھی خواجہ احمد عباس کے حوالے سے شائع ہو چکی ہیں۔ وہیں انگریزی میں بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں کو تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے فکر و فن پر انگریزی میں صرف مضامین نہیں لکھے گئے بلکہ کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(1) Ahmad Hasib, The Novels of Khawja Ahmad Abbas: A Study in His Art and Vision (Delhi: Seema Publications, 1987)

(2) Chandalia, H.S., Ethos of Khwaja Ahmad Abbas (Jaipur: Bohra Prakashan, 1996)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں لوگوں کو اپیل کرنے کی یا مہمیز کرنے کی پوری قوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کو جتنی مقبولیت اردو میں ملی اتنی ہی مقبولیت ہندی اور انگریزی میں ملی اور کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ اس کو پسند کرنے والا طبقہ مختلف لسانی اور تہذیبی معاشرے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ان کی آفاقی نظر کو بھی واضح کرتا ہے کہ ان کے افسانوں کا تخاطب کسی خاص طبقے یا سماج سے نہیں تھا بلکہ پوری انسانیت سے تھا اور ایسے ہی انسانی افکار و اقدار کی ترسیل کی وجہ سے خواجہ احمد عباس کو مختلف ذہن اور مزاج رکھنے والے افراد نے قبول کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے جگر میں سارے جہاں کا درد تھا۔ ان کا بنیادی رشتہ انسانیت سے تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"Every writer, should be a humanist."

انھوں نے 'غبار کارواں' میں لکھا ہے:

انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتہ دار ساری دنیا میں روس میں، امریکہ میں، انگلستان میں اور چین میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان (John Donne) نے کہا ہے۔

''کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے''

''ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے''

ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے''

''ہر انسان کی موت میری موت ہے کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں''

خواجہ احمد عباس کمیونزم اور مارکسزم سے بہت متاثر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی رہی مگر وہ Dogmatic Communist کبھی نہیں رہے۔ وہ non-confirmist تھے۔

'کلیاتِ خواجہ احمد عباس' کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلدیں ناولوں پر محیط ہیں۔ چوتھی جلد میں چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں اور چار یار شامل ہیں۔ پانچویں جلد میں انقلاب، دو بوند پانی جیسے ناولوں کو شامل کیا گیا ہے اور چھٹی جلد میں فاصلہ، تین پہیے، ایک اور پریم کہانی، جوالا مکھی (نامکمل جاسوسی ناول) کی شمولیت ہے۔ خواجہ احمد عباس ایک بڑے ناول نگار تھے۔ فکشن تنقید میں بھی ان کے ناولوں کے حوالے سے گفتگو کم ہی سہی مگر ہوتی رہی ہے۔ خاص طور پر ان کا سوانحی ناول 'انقلاب' تذکروں میں اکثر شامل رہا ہے۔ اس ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا بھی خیال ہے کہ ''یہ ناول 1975 میں ضرور شائع ہوا، لیکن یہ ان کی پہلی کوشش ہے۔'' اس ناول کے تعلق سے خود خواجہ احمد عباس نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بڑی اہم ہیں اور عبرت انگیز

خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کو جتنی مقبولیت اردو میں ملی اتنی ہی مقبولیت ہندی اور انگریزی میں ملی اور کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ اس کو پسند کرنے والا طبقہ مختلف لسانی اور تہذیبی معاشرے سے تعلق رکھتا ہو۔

بھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ناولوں کے تئیں ہمارے ناقدین اور قارئین کا رویہ کیسا رہا ہے۔ خواجہ احمد عباس 'من کی' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''سب سے مشہور ناول اردو میں 'انقلاب' تھا، پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن 'سن آف انڈیا' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ اچھا یا برا اس کے

بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔''

یہ عمومی صورت حال ہے جس کی طرف خواجہ احمد عباس نے اشارہ کیا ہے۔ جب خواجہ احمد عباس جیسے ناول نگار کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو چھوٹے موٹے فکشن نگاروں کے ساتھ کیا رویہ رہتا ہوگا یہ سمجھ سے باہر نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں اچھے ناولوں کی تعداد کم ہے اور اس سے بھی کم ناول تنقید ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ بقول خواجہ احمد عباس:

1958 میں یہ ناول سوویت یونین کی یوکرینین زبان میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن پندرہ ہزار کا چھپا۔ دوسرا ایڈیشن جو پچھلے سال چھپا ہے پچاس ہزار کا ہے۔

1958 ہی میں یہ ناول سوویت یونین ہی کی آذربائی جانین زبان میں شائع ہوا۔ جو مختصر سے علاقے کی زبان ہے۔ (تعداد اشاعت پندرہ ہزار)

1959 میں چیکوسلوواکیہ کی سلوواکین زبان میں شائع ہوا۔ (تعداد اشاعت تین ہزار)

1960 میں سوویت قذاقستان کے ایک ادیب ساتھی ہندوستان تشریف لائے اور ایک کاپی قذاق ترجمے کے ساتھ لیتے آئے جو 1959 میں وہاں شائع ہوا تھا۔ قذاق ایک نئی زبان ہے جو بہت کم لوگ بولتے ہیں۔ (تعداد اشاعت چھ ہزار)

1961 میں ہندی زبان میں میرے دوست اور بہنوئی منیش نرائن سکسینہ نے جو ہندی کے مستند ادیب اور مترجم ہیں، اس کا ترجمہ کیا اور راجپال اینڈ سنز نے شائع کیا۔ (تعداد اشاعت دو ہزار)

جب سے کوشش کرتا رہا کہ اُردو کا کوئی پبلشر اس ناول کو چھاپنے کو راضی ہو جائے لیکن لوگ اس کی ضخامت دیکھتے ہی 'نہیں' کہہ دیتے تھے۔ پڑھنے کی تکلیف کسی نے نہ کی۔ جب کوئی تیار نہ ہوا تو اپنے اسّٹھویں سال میں میں نے اس کی خود کتابت کرائی، خود چھپوایا، اپنے خرچ سے خود شائع کیا۔ (تعداد اشاعت: ایک ہزار!!!) دیکھیں کتنے برس میں یہ بکے گا۔''

ذرا سوچیے جب روسی زبان میں چھپا تو اس کی 90000 ہزار کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ جبکہ اردو کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں ناول سوڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں بک پاتے ہیں۔ 'انقلاب' ان کا ایک ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی قومی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ اس میں وہ گاندھیائی فکر اور فلسفے سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے حوالے سے C. R. Yaravintelimath نے The Journal of Humanaties Karnataka University Dharwar 1987 میں Inquailab a Novel of Revolution کے عنوان سے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔

اسی جلد میں خواجہ احمد عباس کا ناول 'جوالا مکھی' بھی شامل ہے جس کو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے ایوان اردو فروری 2015 میں چھپے ایک مضمون کے توسط سے دریافت کیا۔ یہ ناول 'طبی دنیا' دہلی میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ ارتضیٰ کریم نے اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی یہ رائے بھی درج کی ہے:

''اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936 میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی مگر 'جوالا مکھی' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول 'جوالا مکھی' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

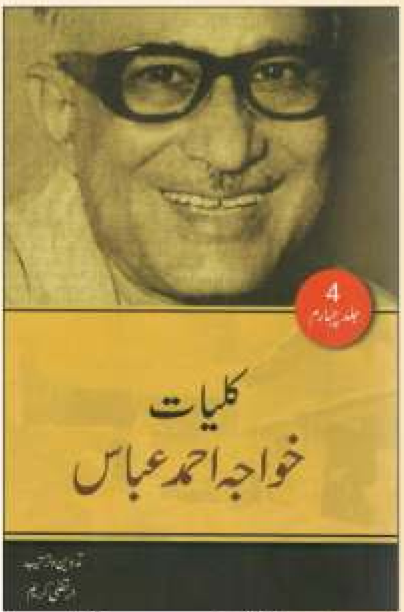

اس جلد میں بھی جوالا مکھی کی صرف ایک قسط شامل کی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس ناول کی تمام قسطیں تلاش کی جائیں کیونکہ یہ ناول ان کی اشتراکی فکر اور نظریے کی عکاسی کرتا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے بہت سے ناول لکھے مگر ہماری ناول تنقید کا المیہ یہ ہے کہ ان کے بہت سے ناولوں کو تنقیدی ڈسکورس میں شامل نہیں کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ناول کمزور ہوں مگر ان کمزوریوں کا بیان بھی ضروری ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی فکشن ناقدین کے سامنے یہ سوال رکھا ہے کہ ''آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ اس پر بات تو ہونی ہی چاہیے تھی تاکہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔'' ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا یہ سوال بہت معنی خیز ہے اور یہ سوال صرف خواجہ احمد عباس کے ناولوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اردو میں بہت سے ناولوں کے تعلق سے یہی سوال قائم کیا جا سکتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری ناول تنقید صرف چند ناولوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہم ناول آج بھی تنقید نگاروں کی نگاہِ گوہر شناس سے محروم ہیں اور اس کی وجہ سے فکشن تنقید کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔ اس پر ناقدین کو سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ان تینوں جلدوں میں خواجہ احمد عباس کے جو ناول ہیں ان میں سے اکثر پر گفتگو نہیں ہوئی ہے اس لیے ہماری ہمعصر

خواجہ احمد عباس نے بہت سے ناول لکھے مگر ہماری ناول تنقید کا المیہ یہ ہے کہ ان کے بہت سے ناولوں کو تنقیدی ڈسکورس میں شامل نہیں کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ ناول کمزور ہوں مگر ان کمزوریوں کا بھی بیان تو ضروری ہے۔

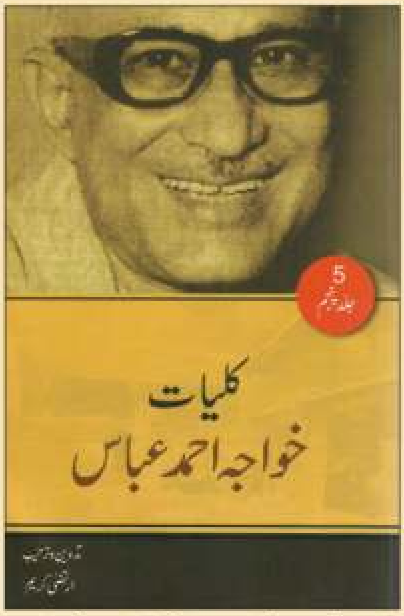

تنقید کا فریضہ ہے کہ ان ناولوں کو تنقید کا موضوع بنائے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کرے۔ خواجہ احمد عباس نے موضوعی اور اسلوبی ہر اعتبار سے ناول کے کینوس کو وسیع کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے ناولوں پر الگ سے تحقیقی مقالہ لکھا جانا چاہیے۔

○

کلیات کی ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے۔ سوانح کے ذیل میں مسولینی فاشیت اور جنگ جش، مولانا محمد علی جوہر، خروش چیف کیا چاہتا ہے ہیں تو سفرنامے کے تحت سرخ زمین اور پانچ ستارے، مسافر کی ڈائری شامل کیے گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے مسولینی کو ایک غیر معمولی شخصیت قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس وقت جس شخص کا دنیا میں سب سے زیادہ چرچا ہے وہ مسولینی ہے۔ وہ بہتوں کی نظر میں اٹلی کا نجات دہندہ تو کچھ لوگوں کی نظر میں وہ مطلق العنان حکمراں ہے۔ خواجہ احمد عباس نے مسولینی کی زندگی کے تعلق سے بہت اہم انکشافات کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دنیا کے مشہور انسانوں کی طرح مسولینی کی پیدائش بھی ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔ باون سال ہوئے اٹھارہ سو تراسی میں اٹلی کے صوبہ روما گنہ کے ایک گاؤں وارنوڈی کوسٹا میں لوہار کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ لوہار کا نام مسولینی تھا۔ بچے کا نام بنی تیور رکھا گیا۔ کئی پشت سے مسولینی خاندان کے لوگ لوہار کا کام کرتے تھے لیکن کچھ عرصے سے بنی تیور کے باپ نے اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر سرائے گیری شروع کردی تھی۔ اس غریب بھٹیارے یا اس کی بیوی کو کیا معلوم تھا کہ اس کا لڑکا آئندہ چل کر تمام اٹلی کا حکمراں ہوجائے گا'' خواجہ احمد عباس نے 'فاشیت اور مسولینی' کے عروج کے تعلق سے بہت اہم معلومات بھی درج کی ہیں۔ مسولینی جارحانہ قوم پرستی، قومی غرور اور فاشیت پر یقین رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی قوم کو جنگ کی تعلیم دی اور وہ امن کو دنیا کی ترقی میں ایک رکاوٹ خیال کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فاشیت دنیا میں امن قائم کرنے کو ناممکن سمجھتی ہے اور ناکارآمد۔ اس لیے ہم عدم تشدد کے نظریے کو مسترد کرتے ہیں جو کمزوری اور بزدلی کا ثبوت ہے۔ صرف جنگ ہی انسانی خوبیوں اور قابلیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں کہ مسولینی نے بھی نفرت کے جذبے کو ترقی دے کر اسے اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ ہر فاشی کا اعتقاد ہے کہ اس کی قوم دنیا کی بہترین قوم ہے اور دوسری تمام قومیں اٹلی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اور اس کے ملک کی حفاظت صرف فاشیت ہی کرسکتی ہے۔ یہ مضمون بہت اہم ہے۔ موجودہ عصری سیاسی تناظر میں بھی پڑھا جائے تو اس مضمون کی معنویت ظاہر ہوگی۔

شہید ملت رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم' کی مختصر سوانح حیات تحریر کی ہے جس میں انھوں نے محمد علی جوہر کے شخصی احوال کے علاوہ صحافتی اور سیاسی زندگی کے حوالے سے لکھا ہے مولانا محمد علی جوہر پر بہت بیش قیمت تحریر ہے جس میں ان کی دلیری اور حق گوئی کو خراج پیش کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری وصحافت کے حوالے سے بھی بہت سی اہم باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

'خروش چیف کیا چاہتا ہے' یہ بھی ایک اہم تحریر ہے جس کا آغاز' کالینو کے کسان کا لڑکا' کے عنوان سے ہوا ہے۔ انھوں نے خروش چیف پر لکھتے ہوئے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ خروش چیف کا کنبہ کسانوں میں سب سے غریب تھا۔ سردی کے موسم میں خروش چیف کے والد یوکرین کے علاقے میں ڈوبناس کی کانوں میں کام ڈھونڈنے جایا کرتے تھے۔ یہ کام بھی وہ پولیس سے ڈر کر کیا کرتے تھے کیونکہ زار کے زمانے میں کوئی بھی کسان اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

خواجہ احمد عباس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ خروش چیف جو عظیم سوویت کا وزیراعظم تھا پندرہ سال کی عمر تک بھیڑ بکریاں اور جاگیرداروں کی گائے چرایا کرتا تھا۔ اس کے بعد ایک ایسے کارخانے میں کام کیا جس کے مالکان جرمن تھے۔ پھر ایک ایسی کان میں کام شروع کیا جو فرانسیسیوں کی ملکیت تھی۔ دواؤں کے پلانٹ میں کام کیا، جو بلجیم کے سرمایہ داروں کی ملکیت تھی۔ خروش چیف کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اپنے ہم پلہ سیاست دانوں کے مقابلے میں غریب تھا۔ ان کے ہمعصر سیاست داں آئزن ہاور امیر کاشت کار کے بیٹے تھے تو میک میلن کے والد برطانیہ کے بڑے امیر ناشر تھے مگر خروش چیف بہت ہی غریب کسان کنبے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد ایک غریب کسان تھے جو سردی کے موسم میں کوئلے کی کانوں میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے۔ لڑکپن میں سوروں اور بھیڑوں کے ریوڑ چرایا کرتے تھے۔ پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑے پہنتے تھے اور ننگے پاؤں گھومتے تھے اور یہی شخصیت جب سیاست میں آتی ہے تو بہت ہی بلند مقام پر فائز ہوتی ہے۔ خروش چیف کے تعلق سے خواجہ احمد عباس نے بہت اہم معلومات مہیا کی ہیں جس کے پڑھنے سے سوویت روس کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام سے آگہی کے علاوہ سیاست کے کھیل بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس کلیات میں سرخ زمین اور پانچ ستارے کے عنوان سے ان کا سفرنامہ چین بھی شامل ہے۔ اس سفرنامے میں چین کے سماجی، سیاسی نظام اور دیگر احوال کے حوالے سے بہت اہم معلومات درج ہیں۔ انھوں نے چین کی خوبیوں کو اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ چین جسے لوگ غیر مہذب سمجھتے ہیں اور انگریزی ناولوں اور فلموں میں چین کا ایک منفی کردار پیش کیا جاتا ہے مگر یہ وہی چین ہے جہاں پانچ ہزار برس پہلے تہذیب اور تمدن نے جنم لیا۔ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جب یورپ کی آبادی کھال لپیٹے پھرتی تھی، چین، تہذیب، تمدن، آرٹ اور ادب کا مرکز تھا، مغرب والوں کو اپنی سائنس کی ایجادوں پر بڑا فخر ہے مگر دراصل انسانی زندگی کے لیے جتنی چیزیں چین میں ایجاد کی گئی ہیں وہ کسی اور ملک میں نہیں ہوئیں۔ ریشم، لکھنے کا کاغذ، سکّے سکّوں کے بجائے کاغذ کے نوٹ، چائے آتش بازی ان سب چیزوں کا استعمال مغرب نے چین سے سیکھا، بارود چین میں فقط تفریح کے لیے آتش بازی بنانے کے کام آتا تھا، یورپ والوں نے اس سے بندوق اور توپ اور بم جیسے خوفناک ہتھیار بنائے۔ چین کی تہذیب کا مقصد انسان کی سمجھ بوجھ کو ترقی دینا اور اس کی زندگی کی مشکلوں کو آسان کرنا تھا۔ اور مغربی تہذیب کا مقصد؟ دوسروں کو دھوکہ دے کر، ان پر ناجائز اثر ڈال کر، ڈرا کر، دھمکا کر، روپے کے زور سے، ہتھیاروں کے زور سے اپنی دولت اور اثر کو بڑھانا۔''

خواجہ احمد عباس نے اس سفرنامے میں چین کی انقلابی شخصیات خاص طور پر ماؤ سے تنگ کا بھی ذکر کیا

ہے۔ 'مسافر کی ڈائری' کے عنوان سے بھی ایک سفرنامہ ہے جس میں بمبئی سے شنگھائی تک کی داستان ہے۔ اس میں انھوں نے سترہ ملکوں کی سیاسی معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں اٹلی، کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ، جاپان، شنگھائی اور دیگر علاقوں کا ذکر ہے۔ جاپان کا بھی ذکر ہے۔ ناگاساکی کا بھی بیان ہے، ٹوکیو کا بھی ذکر ہے اور جاپان کے سرکاری مذہب شنٹو کے حوالے سے بھی اہم گفتگو ہے۔ اس مذہب کے حوالے سے خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں کہ ہر جاپانی کے لیے خواہ وہ بدھ ہو یا عیسائی، لازمی ہے کہ وہ شنٹو میں عقیدہ رکھتا ہو..... شنٹو کی بنیاد جاپانی بادشاہوں اور اپنے آبا و اجداد کی روحوں کی پرستش پر ہے اس مذہب کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ تمام جاپانی قوم سورج دیوتا سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی قوم کو دنیا کی تمام قوموں سے بالا تر سمجھتے ہیں۔ جاپانیوں کا بادشاہ سورج دیوتا کا جانشین ہے اسی لیے شنٹو کے بموجب اس کو تمام دنیا پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ علاوہ بادشاہ کے وہ چاند تاروں، ہوا آسمان وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ مظاہر قدرت بھی سورج سے پیدا ہوئے ہیں اور آبا و اجداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی سفرنامے میں انھوں نے امریکہ کے گاندھی اپٹن سنکلیر کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے بقول خواجہ احمد عباس ساٹھ برس کی عمر میں پوری ساٹھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ہر ایک میں (خواہ وہ ناول ہو، معاشیات پر کتاب ہو یا نظم) اس نے ظلم، جہالت، بے انصافی اور سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے، یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں اور درجنوں زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی زبان ہو، جس میں اپٹن سنکلیر کی کتابیں شائع نہ ہوئی ہوں۔"

شکاگو کے تعلق سے انھوں نے لکھا ہے کہ شکاگو کے ڈاکو دور دور تک مشہور ہیں۔ ان کے متعلق فلم بھی بنائی جاتی ہے مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شکاگو اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس کی تعلیم کا زبردست مرکز ہے۔ دنیا بھر میں جتنی ایجادیں ہوتی ہیں اور سائنس کے مختلف شعبوں کو ترقی ملتی ہے ان میں شکاگو کے پروفیسروں اور سائنس دانوں کا کافی حصہ ہوتا ہے۔ انھوں نے نیویارک، نیگرو، بوسٹن وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے اور بیسویں صدی کے مشہور افسانہ نگار ہیمنگوے کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ فرانس، پیرس کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے اور اسی ضمن میں انھوں نے مسٹر بروم فیلڈ کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو ایک معروف مصنف اور ناول نویس ہیں۔ ان کے تعلق سے خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

"چھ برس پہلے میں ان سے علی گڑھ میں ملا تھا، جہاں وہ ہندوستان کی سیر کے دوران میں ہفتہ بھر کے لیے ٹھہرے تھے، اس کے بعد وہ ہندوستان کئی بار گئے اور کل ملا کر دو برس مختلف شہروں میں قیام کیا، ہر قسم کے ہندوستانیوں سے ملے اور ہر طبقے میں اپنے دوست بنائے۔ یہاں تک کہ بڑودہ میں خاص شہر کے وسط میں ایک مکان لے کر بالکل ہندوستانی طرز پر چھ مہینے تک رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ناول "THE RAINS CAME" کے نام سے لکھا جو ہندوستان کی ایک فرضی ریاست کے متعلق ہے۔ اس ناول کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بروم فیلڈ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے کتنی ہمدردی ہے اور ان کے سماجی مسئلوں کا انھوں نے کتنی گہری توجہ سے مطالعہ کیا ہے۔

بروم فیلڈ پیرس سے پندرہ میل کے فاصلے پر ایک نہایت خوب صورت گاؤں اور سان لی SEN LHEIS میں رہتے ہیں۔ گو وہ امریکن ہیں مگر سال کا زیادہ عرصہ پیرس میں گزارتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب جی چاہتا ہے دنیا کا سفر کر آتے ہیں۔ بروم فیلڈ کے ایک ناول "THE RAINS CAME" ہی کی پچاس ہزار جلدیں فروخت ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی فلم بھی بن گئی ہے اور اس کا کافی معاوضہ ملا۔ اس لیے بروم فیلڈ کافی آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں مگر میاں بیوی دونوں حد درجہ مہمان نواز اور ملنسار ہیں۔ تمام امریکنوں کی طرح صاف گو اور سادہ مزاج اور بے تکلف ہیں۔

مجھے دونوں نے پہچان لیا بلکہ اپنے البم میں ہم لوگوں کی وہ تصویریں بھی دکھائیں جو انھوں نے علی گڑھ میں لی تھیں۔ گھنٹوں ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہمارے ملک سے ان دونوں کو بے حد محبت ہے۔ اس قدر کہ اپنے مکان کی دیواروں پر مسز بروم فیلڈ نے ہندوستان کے رنگین نظارے پینٹ کر رکھے ہیں۔"

خواجہ احمد عباس نے پیرس، جینوا کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان کے مطابق جینوا میں کشیدہ کاری کا کام بہت اچھا ہوتا ہے اور یہاں کی بنی ہوئی گھڑیاں دنیا بھر میں بکتی ہیں۔ مگر اس شہر کی شہرت ان وجوہات سے نہیں ہے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ یہ انجمن اقوام یعنی League of nations کا صدر مقام ہے۔ پیرس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ:

"پیرس وہ شہر ہے۔ جہاں:

☆ سڑکوں اور گلیوں کے نام نہ صرف بادشاہوں، وزیروں، جرنیلوں اور سیاست دانوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں بلکہ شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کے نام پر بھی۔

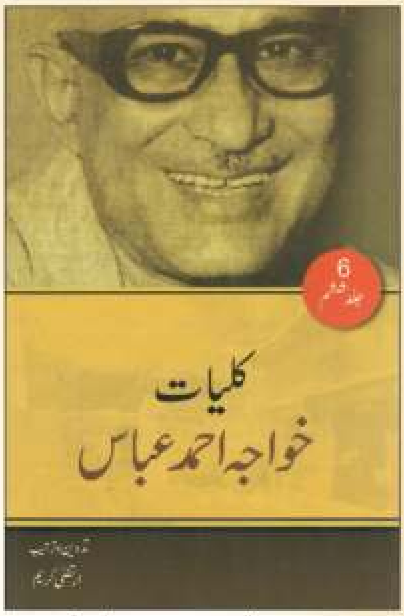

☆ فحش تصویریں گرجوں کی سیڑھیوں پر بکتی ہیں۔

☆ لوگ بلاتکلف پولیس والے سے قحبہ خانوں کا پتہ دریافت کر سکتے ہیں۔

☆ کھانے کے ساتھ شراب مفت ملتی ہے۔ مگر پانی مشکل سے ملتا ہے اور اکثر اس کی قیمت دینی پڑتی ہے۔

☆ موٹریں اور گاڑیاں سڑک کے بائیں بازو کے بجائے دائیں بازو چلتی ہیں۔

☆ عام لوگ آپس کے میل ملاپ میں اتنا ہی تکلف برتتے ہیں جتنا کہ لکھنؤ والے۔

☆ لندن کی شام کے اخبار گھنٹہ بھر میں ہوائی جہاز سے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔

☆ ہر تیسرا آدمی جو آپ کو سڑک پر نظر آتا ہے وہ انگریز ہوتا ہے یا امریکن۔

☆ ننگا ناچ دیکھنا یا سڑک پر بیٹھ کر شراب پینا عیب نہیں سمجھا جاتا مگر اتوار کو گرجا نہ جانا گناہ ہے۔

☆ شاہی محلوں کے باغات میں انقلاب پرستوں کے مجسمے نصب ہیں اور کالجوں کے برابر میں قحبہ خانے ہیں۔

☆ لمبے لمبے بالوں والے آرٹسٹ ہر جگہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بہانہ ملتے ہی آپ کے ساتھ کھانا کھانے یا شراب پینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

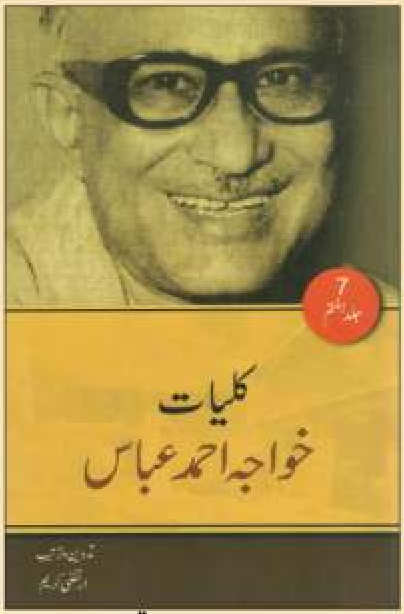

☆ بعض قہوہ خانوں میں سیکڑوں قیمتی اور نادر تصویریں لگی ہیں جو بھوکے مصوروں نے کھانے اور شراب کے عوض کوڑیوں کے مول بیچ دیں۔ پیرس کو پیرس والے پیرس نہیں کہتے 'پاری' کہتے ہیں۔''

اٹلی، سوئٹزر لینڈ اور وینس کے بارے میں بھی معلومات ہیں۔ وینس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وینس کی بڑی تعریف سنی تھی۔ ''جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا'' پرانے، گندے، اندھیرے مکان، تنگ و تاریک گلیاں اور تمام شہر میں سبزی مائل گندے پانی کی نہروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ شاید اسی کا نام شہری حسن ہو، مجھے تو غربت اور گندگی کا مظاہرہ معلوم ہوا۔ عام لوگوں کی حالت...... ان کے پھٹے پرانے میلے کپڑے اور ان کے بوسیدہ مکان...... دیکھ کر ہندوستان کا دھوکا ہوتا ہے۔''

یہ سفرنامے معلومات سے معمور ہیں۔ مختلف قوموں اور ملکوں کی حقیقی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے تمام اہم ملکوں کی سیاحت کے بعد یہی نتیجہ نکالا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کا ماضی بھی شاندار تھا اور مستقبل بھی شاندار ہوگا۔ ان ملکوں کی سیاحت کے بعد اپنے ملک سے اور محبت بڑھ گئی وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان جو میرا وطن ہے، جس کی خوبیاں میری خوبیاں ہیں اور جس کی برائیاں میری برائیاں ہیں، جو باجود اپنی غلامی، غربت اور جہالت کے دنیا کے بہت سے ملکوں سے بہتر ہے۔ جہاں علم کی کمی ہے مگر عقل کی کمی نہیں، جہاں لوگ غریب ہونے کے باوجود مہمان نواز ہیں، جہاں عوام میں پتھر کی مورتیوں کی پوجا ہوتی ہے مگر سونے کے سکوں کی نہیں۔ جہاں ایک لنگوٹی پوش فقیر کی عزت راجاؤں اور سرمایہ داروں اور سپہ سالاروں سے زیادہ ہوتی ہے، ہندوستان جہاں دھوپ نکلتی ہے اور سورج نظر آتا ہے اور لندن کی طرح دن میں بھی اندھیرا چھایا نہیں رہتا۔''

سوانح اور سفرنامے لکھنے کا بھی ایک الگ انداز ہے۔ خواجہ احمد عباس کے سفرنامے پڑھتے ہوئے دلچسپی اور لطف کا احساس ہوتا ہے اور ان کی تحریر میں اتنی کشش اور قوت ہے کہ آدمی شروع کرنے کے بعد آخری سطر پر ہی دم لیتا ہے۔ یہی حال ان کی سوانح عمری لکھنے کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریروں میں وہ جادو ہے کہ قاری اس کے جادوئی اثر سے نکل نہیں پاتا۔

O

آٹھویں جلد ڈرامے اور مضامین پر محیط ہے۔ اس میں زبیدہ، اناس اور ایٹم بم، بارہ بج کر پانچ منٹ، لال گلاب کی واپسی جیسے ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا اپٹا سے تعلق رہا ہے۔ اس لیے ان کے ڈرامے اسٹیج بھی کیے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈرامے میں عصری منظرنامے کو پیش کیا ہے۔ خاص طور پر وہ جس اشتراکی فکر کے حامل تھے اسی نظریے کی تبلیغ و تشہیر انھوں نے ڈراموں کے ذریعے کی ہے۔ انسانی مساوات اور معادلت پر ان کا یقین کامل تھا۔ اسی لیے ان کے بیشتر ڈرامے انسان دوستی اور اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کے جذبات پر مبنی ہیں۔ یہ سارے ڈرامے مقصدی اور افادی ڈرامے ہیں جن سے سماج کو روشنی بھی ملتی ہے اور نئی راہ بھی۔

اسی جلد میں کچھ مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر صحافتی نوعیت کی تحریریں ہیں۔ اس میں مختلف موضوعات اور مسائل کے حوالے سے انھوں نے اپنے بیباکانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور پرکشش عنوان کے ذریعے قاری کے ذہن کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان مضامین میں الہ دین اور اس کا عجیب و غریب چراغ، ڈاکٹر انصاری اور مونچھیں اور انگلیاں، اقبال، وطنیت اور انقلاب، اور انسان مر گیا، غبار کارواں شامل ہیں۔ صحافت میں ان کی پوری عمر گزری تھی۔ وہ بمبئی کرانیکل سے بھی وابستہ رہے۔ بلٹز سے بھی ان کا تعلق رہا اور علی گڑھ میں جب وہ بی اے میں انگریزی کے طالب علم تھے تو اس وقت علی گڑھ اوپینین کے نام سے ایک اخبار بھی نکال رہے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی بیشتر تحریروں پر حتیٰ کہ ناولوں پر بھی صحافت کے اثرات ملتے ہیں۔

اس کے علاوہ سونے اور چاندی کے بت کے عنوان سے فلموں کے حوالے سے کچھ تحریریں ہیں جو فلموں کے شائقین کے لیے بہت اہم ہیں۔ خواجہ احمد عباس فلموں کے اسکرپٹ رائٹر اور ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ ان کی مشہور فلموں میں بوبی، آوارہ، شری 420، میرا نام جوکر وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے فلم کو ایک نیا بیانیہ دیا۔ ان کے فلموں کے حوالے سے Rashmi Doraiswamy نے New Narratives for the New Age: The Cinema of K.A. Abbas کے عنوان سے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔

فن اور فنکار کے تحت فلمی دنیا کی اہم ترین شخصیتوں میں شانتا رام، پرتھوی راج کپور، راج کپور، دلیپ کمار، مینا کماری، بلراج ساہنی، امیتابھ بچن، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، ستیہ جیت رے وغیرہ پر لکھا ہے۔ فلمی شخصیات پر جو تحریریں ہیں وہ اس اعتبار سے اہم ہیں کہ بیشتر شخصیات سے ان کی ملاقاتیں رہی ہیں اور شب و روز کا رشتہ رہا ہے۔ مینا کماری کے حوالے سے انھوں نے بہت ہی جذباتی مضمون لکھا ہے۔ پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ فلم اسٹار مینا کماری کے علاوہ ایک

خواجہ احمد عباس نے تمام اہم ملکوں کی سیاحت کے بعد یہی نتیجہ نکالا کہ ہندوستان ایک ایساملک ہے جس کا ماضی بھی شاندار تھا اور مستقبل بھی شاندار ہوگا. انہیں ملکوں کی سیاحت کے بعد اپنے ملک سے اور محبت بڑہ گئی وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان جو میرا وطن ہے ، جس کی خوبیاں میری خوبیاں ہیں اور جس کی برائیاں میری برائیاں ہیں، جو بلوجود اپنی غلامی، غربت اور جہالت کے دنیا کے بہت سے ملکوں سے بہتر ہے.

اور مینا کماری کو انھوں نے دریافت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اس مینا کماری کے اندر کئی اور مینا کماریاں چھپی ہوئی تھیں۔ ایک اداکارہ تو مینا کماری تھی جو فلم کی جھوٹی اوپری دنیا میں بھی اپنے رول میں اتنی کھو جاتی تھی کہ پھر اسے دنیا کی کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی جو اچھی ایکٹنگ اس لیے نہیں کرتی تھی کہ اسے لاکھوں روپے ملیں گے، نہ اس لیے کہ اس کے فن کی تعریف ہوگی بلکہ اس لیے کہ اس کی اداکاری سے اس کی روح کو خوشی ہوگی، من کو شانتی ملے گی اور اس اداکارہ مینا کماری میں ایک حساس، نازک مزاج شاعرہ موجود تھی جو چھپ کر اپنی تسکین قلب و روح کے

لیے شعر کہتی تھی اور جس نے زندگی کے آخری سال میں اپنی غزلوں کو خود گا کر ریکارڈ کرایا۔ اور اس رومانی مزاج کی شاعرہ کے اندر وہ بچی چھپی ہوئی تھی جسے ماں باپ نے مہ جبیں کا نام دیا تھا اور جس نے کبھی بڑی غریبی کا بچپن بتایا تھا اور جو گڑیا کھیلنا چاہتی تھی اور ہنڈولے میں بیٹھنا چاہتی تھی اور ہنڈکلیا پکانا چاہتی تھی، شادی کر کے گود میں بچوں کو کھلانا چاہتی تھی لیکن جسے گھر کی اقتصادی مشکلات نے بچپن کی خواہشوں امنگوں اور آرزوؤں کو خیر باد کہہ کر سات برس کی عمر میں فلم ایکٹنگ کو اپنا ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اور آج جب کہ وہ اس دُنیا میں نہیں ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری عمر مینا کماری اسی مہ جبیں کو تلاش کرتی رہی۔ وہ معصوم بچی جو اس کے من کے اندھیرے میں چھپی بیٹھی رہی اور جس بچی کے من میں نہ جانے کتنے سپنے، کتنی آرزوئیں، کتنی امنگیں چھپی تھیں اور شاید مینا کماری کی روح کی بے چینی، اس کی شاعرانہ بادہ خواری، اس کی غم انگیز تلخ مسکراہٹ، اس کی اداکاری میں جو گہرائی، سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا وہ سب اسی تلاش کی دین تھی۔

مگر آج وہ تلاش ختم ہوگئی ہے۔

مینا کماری اور مہ جبیں مر کر ایک ہوگئی ہیں۔

صرف ایک افسانہ باقی رہ گیا ہے اور چند دلکش افسردہ یادیں!''

اسی طرح انھوں نے امیتابھ بچن کے حوالے سے لکھا ہے:

''تھوڑے دنوں میں امیت اردو کا ماہر بن گیا اور اپنی مشہور آواز میں اردو کے شعر تو ایسے پڑھتا تھا کہ کوئی بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ فلم ''کالیا'' میں اس نے کس خوبی کے ساتھ مکالمے اور اردو شاعروں کے شعر ادا کیے ہیں کہ مجھے خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ 'سات ہندوستانی' میں ہماری محنت رایگاں نہیں گئی۔''

یہاں خاطر نشاں رہے کہ آج کے سپر اسٹار امیتابھ بچن کو فلم میں اداکاری کا سب سے پہلا موقع خواجہ احمد عباس نے اپنی فلم 'سات ہندوستانی' میں دیا تھا۔ ان سے قبل امیتابھ بچن کو لمبا، بے ڈول اور کارٹون کہہ کر رد کر دیا گیا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے Ahmad Abbas: The Man who gave us Amitabh (bacchchan, The Hindu June 11, 2016

اس جلد میں عصمت چغتائی کی چوتھی کا جوڑا، دروازہ کھول دو، کرشن چندر کی کہانی، بلور کا بنا ہوا آدمی، آرٹ اور روپیہ اور فلم، چار سو تیں فلمیں یا چار سو بیں فلمیں وغیرہ جیسی تحریریں بھی شامل ہیں۔ بلور کا بنا ہوا آدمی مولانا آزاد کے حوالے سے ہے جس میں انھوں نے مولانا سے ملاقات کا حال لکھتے ہوئے ان کی نفاست اور وضع داری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اتنا صاف شفاف آدمی میں نے اور نہیں دیکھا ہے۔ جب بھی ملو لگتا تھا کہ ابھی ابھی نہا دھو کر نکلے ہیں۔ یہ صفائی اور نفاست جسم یا شریر کی ہی نہیں دل کی آتما کی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آدمی گوشت پوست کا نہیں بلور کا بنا ہوا ہے، جس میں علم کا نور اور گیان کی روشنی جھلکتی ہے۔''

آٹھ جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں خواجہ احمد عباس کی بیشتر تحریریں شامل ہوگئی ہیں مگر بہت سی تحریریں اب بھی ایسی ہیں جنھیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ احمد عباس اپنے عہد میں تو مقبول تھے اور اس زمانے میں ان کی تحریریں بڑی دلچسپی اور ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان تحریروں کی خوبی یہ ہے کہ یہ زمانی اور مکانی حصار سے ماورا ہیں اور آج کے عہد میں سیاق و سباق کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یہ تحریریں اور بھی معنویت کی حامل ہوگئی ہیں کیونکہ یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج کے عہد میں خواجہ احمد عباس کی طرح لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا عہد دوسرا خواجہ احمد عباس پیدا کرسکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں دوامیت کے نقوش ہیں اور کہیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ تحریریں ایک خاص عہد کے لیے لکھی گئی ہیں، ان تحریروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں آفاقی اقدار ہیں اور انہی آفاقی قدروں کی وجہ سے یہ تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ صرف تحریریں نہیں ہیں بلکہ وہ روشنی اور اجالے ہیں جو خواجہ احمد عباس کے ذہن سے نکل کر تحریروں میں بکھر گئے ہیں اور یہ صرف ان کے ذہن کی نہیں بلکہ روح کی بھی روشنی

”نگارشات خواجہ احمد عباس کی یہ بازیافت یقینا ایک بڑا کام ہے۔اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے کیونکہ آج کے دور میں وسائل کی فراوانی کے باوجود ان تمام تحریروں تک رسائی آسان نہیں دشوار ہے۔ ارتضیٰ کریم نے خواجہ احمد عباس کی تحریروں تک براہ راست رسائی کی جو صورت نکالی ہے اس سے یقینا پورا اردو معاشرہ کسب فیض کرسکتا ہے۔“

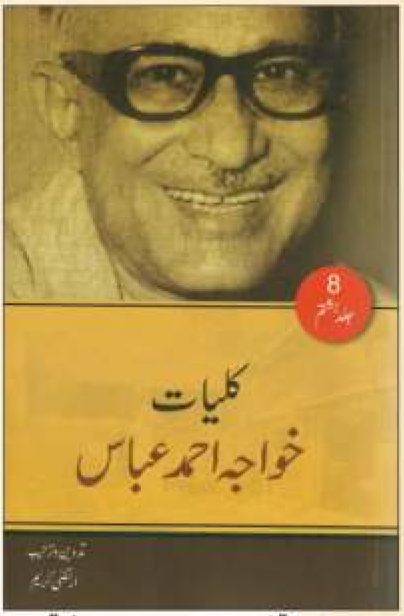

ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے خواجہ احمد عباس جیسی متنوع اور جامع الکمالات شخصیت کی تحریروں کو یکجا کردیا ہے۔ نگارشات خواجہ احمد عباس کی یہ بازیافت یقیناً ایک بڑا کام ہے۔ اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے کیونکہ آج کے دور میں وسائل کی فراوانی کے باوجود ان تمام تحریروں تک رسائی آسان نہیں، ارتضیٰ کریم نے خواجہ احمد عباس کی تحریروں تک براہِ راست رسائی کی جو صورت نکالی ہے اس سے یقیناً پورا اردو معاشرہ کسب فیض کرسکتا ہے۔

کلیات پر ان کا بیش قیمت مقدمہ ہے جو کلیات کی ضخامت کے اعتبار سے مختصر ضرور ہے مگر جامع ہے۔ خواجہ احمد عباس کے تعلق سے ان کا تحقیقی کام صرف کلیات تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے ہفت روزہ 'بلٹز' ممبئی میں شائع ہونے والی خواجہ احمد عباس کا مقبول ترین اور طویل مدتی کالم 'آزاد قلم' بھی مرتب کیا ہے جو جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ آخری صفحے پر شائع ہونے والے 'آزاد قلم' کو مرتب کرنے کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ یہ ایک ایسا کالم تھا جس کا قارئین بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔

آٹھ جلدوں میں کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت جہاں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے وہیں 'آزاد قلم' کا انتخاب بھی خواجہ احمد عباس کو ایک سچا اور اچھا خراج عقیدت ہے!

Haqqani Al-Qasmi
Cell.:9891726444
Email.: haqqanialqasmi@gmail.com

نبی احمد

جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ میں اردو تحقیق کی رفتار

تحقیق ایک جامع لفظ ہے۔ اس کی تعریف میں بہت سارے اوراق سیاہ کیے جاسکتے ہیں لیکن حتمی فیصلہ دشوار ہے کیونکہ کاروانِ تحقیق ہمیشہ نئی سمت کی نشاندہی میں مصروف ہے۔

دراصل دشتِ امکاں کی نشاندہی ہی تحقیق کا مقصد ہے۔ تحقیق حقیقت کو دریافت کرنا، اس کی تصدیق یا پایۂ ثبوت تک پہنچنا ہے۔ اسے انگریزی لفظ Research کا بدل قرار دیا گیا ہے اور اسے Care Inquity محتاط دریافت سے موسوم کیا گیا ہے۔ بہرحال تحقیق تلاش و جستجو کے ذریعے اصل حقیقت تک پہنچنے کا نام ہے۔ دانشوروں کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے "تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا جاننا، مواد کی بازیافت یا مواد کی ترتیب ہے۔" حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور حافظ محمود شیرانی سے لے کر قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ، حنیف نقوی، گیان چند جین اور تنویر احمد علوی جیسے محققین نے گیسوئے تحقیق کی مشاطگی میں خونِ جگر صرف کیا ہے۔

دانش گاہوں میں تحقیق کے تعلق سے ہمارے اہم محققین نے منفی رویے کا اظہار کیا ہے اور یہ خیال کچھ ایسا بے جا بھی نہیں ہے۔ بوالہوس نے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ آبروئے شیوہ اہل نظر باقی نہ رہ سکی۔ یہ داستانِ غم طویل ہے لیکن یہ سچ ہے کہ یونیورسٹیوں میں ماضی قریب میں اچھے ریسرچ اسکالرز نے بڑے بڑے تحقیقی معرکے سر کیے ہیں۔ محمود الٰہی، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عابد پیشاوری، تنویر احمد علوی وغیرہ کے اسمائے گرامی سامنے کے ہیں جن کے تحقیقی مقالے ہر اعتبار سے ستائش کے مستحق ہیں لیکن موجودہ تناظر میں ایسی مثالیں خال خال ہیں۔ آج یونیورسٹی میں جو مقالے لکھے جارہے ہیں ان میں جو اچھے بھی ہیں ہم انھیں چراغِ راہ تو کہہ سکتے ہیں، نشانِ منزل نہیں پھر بھی

کم نہیں اے دلِ بے تاب متاعِ امید
دستِ میخوار میں خالی ہی سہی جام تو ہے

سرزمین چھپرہ دلی، لکھنؤ، پٹنہ، رام پور وغیرہ کی طرح شعر و ادب کا دبستان نہیں رہی ہے اور نہ ہی کسی ادبی تحریک کا تعلق یہاں سے ہے۔ البتہ اس سرزمین سے ایسی شخصیتیں ابھری ہیں جنھیں تاریخِ ادب اردو فراموش نہیں کرسکتی۔ اس ضمن میں اجتبیٰ حسین رضوی، سید نقی حیدر، سید خورشید حیدر نیر، جمیل مظہری اور رضا نقوی واہی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے قبولِ عام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ چھپرہ یونیورسٹی کی یہ خوش بختی ہے کہ اس کے دامن سے سیوان اور گوپال گنج کا زرخیز علاقہ منسلک رہا۔ علم و ادب کی آبیاری میں حسن پورہ، گوپال پور، حسین گنج اور رانی پور کا نام یقیناً نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اس سرزمین نے چراغِ ادب کو خوب روشن کیا ہے اور تصوف کی بارگاہ میں بھی قدم رکھا ہے۔ اس ضمن میں حضرت مولانا الحاج سید شاہ محمد نعمت اللہ کے کارناموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ گوئی میں حکیم لطیف احمد کا نام دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ (متعدد تاریخی قطعات 'تہذیبِ نسواں' لاہور میں 1908 تا 1922 شائع ہوچکے ہیں)

علاوہ ازیں مولوی جمیل احمد اور سیدہ کے کارناموں کی بھی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ سارن کمشنری کا یہ خاصہ رہا ہے کہ اس نے اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا ہے جس کا

مستحسن نتیجہ یہ نکلا ہے کہ متعدد صوفیوں اور دانشوروں نے سیوان کو اپنا مستقر بنایا۔ اس میں شہنشاہِ ظرافت احمد جمال پاشا اور تصوف کے رازداں حضرت علامہ مفتی ابو سہیل محمد انیس عالم قادری رضوی رشیدی بانی ادارۂ شرعیہ بہار کا نام لیا جا سکتا ہے۔ خلوص و محبت کے پیکر مولانا محمد نعیم الدین اشرفی چھپرہ ہی کے ہو کر رہ گئے جن کی ادبی نگارشات لافانی ہیں اور مدرسہ نعیمیہ بلاشبہ فکر و فن کا مرکز ہے۔

جے پی یونیورسٹی چھپرہ، شعبۂ اردو کی کارکردگی کسی محدود علاقے اور شخصیت تک مرکوز نہیں اس نے تعصب سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ مذہب و ملت کی بنیاد پر اختلافی مسائل میں الجھنے سے گریز کیا اور بلا اختلاف مسلک تحقیق کے کارواں کو رفتار عطا کرتا رہا۔ یہاں تحریکات اور تحریکات سے منسلک شعرا اور ادبا بھی تحقیقات کا موضوع بنے ہیں۔ خواتین کی شاعری کو بھی موضوعِ تحقیق بنایا گیا اور خواتین ناول نگاروں کے موضوعاتی تنوع کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت ساری ایسی شخصیتیں جو گوشۂ گمنامی میں تھیں، جن کی صلاحیت کا اعتراف پوری ادبی دنیا کرتی تھی انھیں بھی موضوع بنا کر خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سہرا شعبۂ اردو کے سر ہے۔ مثال کے طور پر شائق مظفرپوری اور علی حیدر نیر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت پر تحقیقی مقالات قلمبند کیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ نعتیہ اور حمدیہ شاعری سے مورخین حضرات دامن بچاتے رہے اور یہ کہتے سنائی دیے کہ معاملہ شرعی ہے اس پر گفتگو نامناسب ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ محتاط رویہ اپناتے ہوئے ہمارے یہاں حمد و نعت پر پُر مغز مقالے لکھے گئے۔

اردو کے غیر مسلم قلم کاروں، رام لعل، کرشن چندر، کیول دھیر اور فراق گورکھپوری وغیرہ پر تحقیقی مقالوں کے ذریعے ان کے مرتبے اور منصب کا تعین کیا گیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغام دیا گیا ہے کہ اردو کسی ایک مخصوص قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی وراثت ہے۔

عہدِ حاضر کے ان عنوانات کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے جن سے اردو کا عام طبقہ نابلد ہے لہٰذا یک بابی ڈرامے، اردو خودنوشت کا ارتقا، تاریخ گوئی کا فن اور ہندوستان کا لسانی پس منظر، تانیثیت اور اردو شاعری، پروین شاکر کی نسائیہ شاعری، اردو میں مابعد جدیدیت، تصورات اور ادبی احساسات اور تصوف بحیثیت تزکیۂ نفس کے علاوہ مختلف عنوانات کی نشاندہی کرنا شعبۂ اردو کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

جے پرکاش یونیورسٹی کا شعبۂ اردو نوزائیدہ ہے اور مدتِ کار مختصر ہے۔ تحقیق کے مواقع وافر نہیں ہیں، مواد کی دستیابی کا مسئلہ ہنوز درپیش ہے۔ اس کے باوجود شعبۂ اردو تحقیق کے نئے منازل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بہر طور اپنی کم مائگی کا اعتراف کرتے ہوئے 67 افراد پر مشتمل ریسرچ کے موضوعات اور اسکالرز کے ناموں کی فہرست منسلک ہے۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

اکتوبر 2008 سے 31 مارچ 2018 تک مندرج ہونے والے مقالوں کے عنوانات، مقالہ نگاروں اور نگراں کے ناموں کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

عنوانات	اسکالرز	نگراں
پروین شاکر کی نسائیہ شاعری	ستارہ جبیں	علی فواد فیضی ایسوسی ایٹ پروفیسر
اردو میں مابعد جدیدیت: تصورات اور ادبی احساسات	علینہ علی ملک	//
سعادت حسن منٹو بحیثیت ترقی پسند افسانہ نگار	منظور عالم انصاری	//
کرشن چندر کے افسانوں میں مزاحیہ عناصر	کشوری	//
مولانا محمد نعیم الدین اشرفی: حیات اور کارنامے	نثار احمد	//
مولانا عبدالماجد دریابادی: بحیثیت نثر نگار	فیاض احمد	ڈاکٹر عبدالمالک ایسوسی ایٹ پروفیسر
دبستانِ بہار کی شاعری کے امتیازات	شکیل احمد	//
جوش ملیح آبادی: بحیثیت نظم نگار	جمیل احمد انصاری	//
مولانا وحیدالدین خاں: بحیثیت نثر نگار	مظہر حسین	//
اختر اورینوی: حیات اور کارنامے	ایس۔ ایم۔ سلیم	//
جاں نثار اختر: بحیثیت رومانوی شاعر	سید وارث امام	//
کرشن چندر: بحیثیت افسانہ نگار	تحسین کوثر	//
اردو میں حمدیہ شاعری کا ادبی اعجاز	معراج خالد	//
کرشن چندر بحیثیت طنز و مزاح نگار	فرح دیبا سیما	//
فیض احمد فیض بحیثیت شاعرِ انقلاب	افروز بانو	//
اقبال کی شاعری کا خارجی پیکر اور داخلی تصورات	عفیفہ بانو	//
حدائقِ بخشش کا موضوعاتی اسلوب	رجب علی نوری	ڈاکٹر عبدالمالک ایسوسی ایٹ پروفیسر
اردو شاعرات کے تانیثی افکار	زینت افروز	//
اقبال بحیثیت نثر نگار	ذاکر حسین	پروفیسر نبی احمد
اقبال کی شاعری میں منظر نگاری	سمیع حسن	//
اقبال کی شاعری میں قرآنی تلمیحات	ناصرہ بانو	//
اردو ناول کا سیاسی منظر نامہ	آصف جمال	//
اردو مثنویوں میں نسوانی کردار	دست گیر احمد	//
مولانا ابوالحسن علی ندوی نظریات و خیالات کے چند پہلو	محمد شمیم	//
احمد جمال پاشا: بحیثیت ظرافت نگار	محمد معصوم	//
شائق مظفرپوری: حیات اور خدمات	محمد شاہد	//
کرشن چندر بحیثیت انشائیہ نگار	الیاس احمد	//
اردو میں یک بابی ڈرامے	عابدہ خاتون	پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی
تانیثیت اور اردو شاعری	محمد قیام الدین	//
جمالیات اور ادبی تنقید	محمد حلیم	//
عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل نگاری (برگِ خزاں کے حوالے سے)	نور الہدیٰ	//
انیسویں صدی کے تہذیبی مطالعہ میں آئینۂ ترہت کی اہمیت	اشفاق احمد	//
عرفان عباسی کی تذکرہ نگاری	نسرین آرا	ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اسلم ایسوسی ایٹ پروفیسر
علی میاں کی ادبی اور ثقافتی خدمات	ذاکر حسین	ڈاکٹر نکہت پروین ایسوسی ایٹ پروفیسر
رام لعل کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ	محمد قیصر امام	ڈاکٹر مظہر کبریا ایسوسی ایٹ پروفیسر

احمد یوسف کی افسانہ نگاری ایک جائزہ	زیبا یاسمین	//
چھپرہ کے چند رباعی گوشعرا	سید معصوم رضا	//
تاج الشریعہ محمد اختر رضا خان کی شخصیت اور ادبی خدمات	محمد پرویز عالم	//
فن رباعی اور ناوک حمزہ پوری	منیزہ خاتون	ڈاکٹر سمیع احمد ایسوسی ایٹ پروفیسر
اردو میں پابند نظم گوئی کی روایت کا امین	ایس ضیاء الدین احمد	//
کلیم عاجز کی شاعری میں احساس کرب	معراج الدین	//
علی سردار جعفری بحیثیت اشتراکی و انقلابی شاعر	منیرہ زمانی	ڈاکٹر جمیل احمد انصاری ایسوسی ایٹ پروفیسر
ندوۃ العلما کی ادبی خدمات	لطیف الرحمٰن	ڈاکٹر تنویر اختر نور ایسوسی ایٹ پروفیسر
قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسائی کردار	ناظرین فاطمہ	//
فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کا تقابلی مطالعہ	شبانہ پروین	//
آزادی کے بعد بہار میں اردو افسانے کا فنی ارتقا	شبنم بیگم	ڈاکٹر عبدالستار اسسٹنٹ پروفیسر
تصوف بحیثیت تزکیۂ نفس	محمد صلاح الدین	//
قاضی عبدالودود حیات و خدمات	محمد ناصر الزماں	ڈاکٹر مظہر احمد غنی اسسٹنٹ پروفیسر
فراق گورکھپوری: حیات و خدمات	رومانہ خاتون	//
اقبال اور حالی ایک تقابلی مطالعہ (وطن دوستی کے حوالے سے)	بلقیس جہاں	//
اختر حسین رائے پوری: حیات و خدمات	شبنم پروین	ڈاکٹر ظفر اللہ اسسٹنٹ پروفیسر
اردو خودنوشت کا ارتقا 1947 کے بعد	جاوید اقبال	//
ہندوستان کا لسانی پس منظر اور اردو زبان	محمد ریاض الدین	ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن ایسوسی ایٹ پروفیسر
تاریخ گوئی کا فن اور ناوک حمزہ پوری	مبارک حسین	//
اردو ناولوں میں نسائی کردار	انور حسین انصاری	//
اردو ادب میں عبدالقادر سروری کی خدمات	نغمہ امام	//
اَسّی کی دہائی کے بعد اردو خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں موضوعاتی تنوع: ایک تجزیاتی مطالعہ	عالم آرا خانم	//
اختر الایمان: بحیثیت نظم نگار	عباد اللہ انصاری	ڈاکٹر سمیع اختر انصاری اسسٹنٹ پروفیسر
اردو غزل میں المیہ عناصر کی روایات عہد غالب تک	حیدر علی	//
علی عباس حسینی: بحیثیت افسانہ نگار	حسین امام	//
ڈاکٹر کیول دھیر: شخصیت اور افسانہ نگار	رضیہ سلطانہ	ڈاکٹر ابوالحیات اسسٹنٹ پروفیسر
ابو محمد سحر: حیات اور ادبی خدمات	رخشاں انجم	//
اردو ادب کی ترقی میں اخلاق اثر کی ادبی خدمات	شیخ صابرین	//
علی حیدر نیر کے حالات و ادبی خدمات	زینب ناز	//

شعبۂ اردو اپنی تنگ دامنی کے باوجود فعال رہا ہے اور مختصر مدت میں عالمی سیمنار کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ عصمت چغتائی فکر و فن، راجندر سنگھ بیدی: حیات و کارنامے، فیض احمد فیض کی انفرادیت، اقبال اور قومی یک جہتی کے تحت قومی سیمنار اس کے بین ثبوت ہیں۔ یہاں کے اساتذہ کی اپنی ایک شناخت ہے اور ان کے مضامین معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ عالمی اور بین الاقوامی سیمناروں میں طلبہ کی شرکت ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے اور اردو اکادمی پٹنہ اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے مثبت ریمارکس مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔

عنوانات بالا پر تحقیقی مضامین لکھے جا چکے ہیں اور بہ استثنائے چند ڈگریاں تفویض کی جا چکی ہیں، جن کو شعبۂ اردو کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔ تحقیق میں کوئی شے حرف آخر نہیں ہے۔ یہ جدوجہد کی متقاضی ہے۔ ممکن ہے کارگہ تحقیق میں کوئی قاضی عبدالودود کا بدل مل جائے لہٰذا تحقیق و تجسس کا یہ سفر روشن مستقبل کی امید کے ساتھ پابہ رکاب ہے۔

■

Prof. Nabi Ahmad
Dept of Urdu, J.P. University
Chapra - 841301 (Bihar)
Mob.:9631957798

اردو رسائل کے خصوصی شماروں کی اہمیت

فرزانہ بیگ جمیل احمد

اردو زبان و ادب کے فروغ میں رسائل نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان رسائل کا طباعتی وقت بھی مختلف رہا ہے۔ کوئی رسالہ ماہ نامہ کی شکل میں شائع ہوا تو کوئی دو ماہی اور کسی کی شکل سہ ماہی رہی۔ ان میں سے بیشتر رسائل اپنے معیار کے اعتبار سے انتہائی بلند تسلیم کیے جاتے رہے ہیں۔ جن میں شعروادب کی اشاعت مقصدی پیمانے پر کی جاتی رہی ہے۔

ہر چند یہ رسائل یوں تو اپنی جگہ اپنے معیاری طرز اشاعت کی وجہ سے خاصے مقبول رہے۔ لیکن ان کی شہرت میں دائمی اضافہ اس وقت زیادہ ہوا جب ان کے خصوصی شماروں کی طباعت کی جانے لگی۔ اس نوع کے شمارے عام طور پر شعروادب کے کسی اہم موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ بعض رسائل کے ان خصوصی شماروں میں کئی اہم موضوعات پر سپردِ قلم کیے گئے مضامین کی شمولیت ان کے معیار میں اضافہ ہی کرتی رہی ہے۔

اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ اردو رسائل کے عام شماروں اور ان کے خصوصی شماروں میں خاص فرق ہوتا ہے۔ خاص شماروں کی طباعت میں اعلیٰ اور معیاری مضامین کی فراہمی کے لیے خاص دھیان دینا پڑتا ہے اور اس سلسلے میں ایسے قلم کاروں سے رابطہ کرنا پڑتا ہے جو کسی اہم موضوع پر دسترس رکھتے ہوں۔

یہ خصوصی شمارے اس اعتبار سے بھی اہم مانے جاتے ہیں کہ ان میں کسی موضوع پر بیک وقت مثبت اور منفی طریقۂ فکر پر مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

یوں تو یہ خصوصی شمارے عام طور پر کسی خاص زبان میں شائع کیے جاتے ہیں اور ان میں لکھنے والوں کی اکثریت بھی اسی زبان کے اہم اور اعلیٰ قلم کاروں کی ہوتی ہے، جو اس زبان سے متعلق موضوعات ہی تک محدود رہ کر اپنے مضامین کی تخلیق کرتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کبھی کبھی دیگر زبانوں کے قلم کاروں کا تعاون بھی حاصل کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی زبان کا کوئی رسالہ سماجی موضوع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا خصوصی شمارہ شائع کرنا چاہتا ہے تو اس میں مختلف زبانوں کے ایسے قلم کاروں کی تخلیقات کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے جو سماجی معاملات پر کافی مضبوط گرفت رکھتے ہوں اور جو ان سماجی مسائل سے گہرا شغف رکھتے ہوئے ان کے سارے پہلوؤں پر گہری نظر بھی رکھتے ہوں۔ کم و بیش یہی کیفیت دیگر موضوعات کے سلسلے میں بھی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

ان خصوصی شماروں کی ترتیب سے لے کر ان کی طباعت کے دشوار کن مراحل سے بھی ان رسائل کے عملے کو گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس نوع کے خصوصی شماروں کو معیاری مواد کے ساتھ ساتھ صوری اعتبار سے زیادہ مزین کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ان کے سرورق کو دیدہ زیب بنانا پڑتا ہے۔ ان کی کتابت کو بھی دلکش انداز سے پیش کرنا پڑتا ہے۔

خصوصی شماروں کی ضخامت کا سوال بھی کافی اہم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی خاص موضوع پر جو مواد جمع کیا جاتا ہے اس کے تحت اس رسالے کے صفحات کا تعین بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں اس ضخیم خصوصی شمارے پر پیش آنے والے اخراجات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اور اس اقتصادی دشواری سے کسی بھی رسالے کے عملے کو گزرنا پڑتا ہے جس کی تلافی وہ خریداروں کے تعاون سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کے لیے انھیں اس خصوصی شمارے کی قیمت میں اچھا خاصا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ تاجرانہ اشتہارات کی وصولی پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے لیے انھیں کافی تگ و دو بھی کرنی پڑتی ہے۔

قابلِ ذکر رسائل کے خصوصی شماروں کی قدیم اور جدید صورتوں میں نمایاں فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ قدیم شمارے مواد کے اعتبار سے تو کافی اہم ہوا کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی تزئین میں جدید خصوصی شماروں کی طرح زیادہ دلکش نہیں ہوتے تھے۔ موجودہ دور میں اردو کے جو خصوصی شمارے شائع کیے جا رہے ہیں ان کی جانب مواد کے ساتھ ساتھ ان کی صوری تزئین کی جانب بھی خاصا دھیان دیا جارہا ہے۔

اس فرق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قدیم زمانے میں رسائل کی طباعت کے وہ مسائل موجود نہیں تھے جو آج پائے جاتے ہیں۔ جیسے پریس کی سہولیات بھی بے حد محدود تھیں۔ عام طور پر لیتھو پریس ہی میں ان رسائل کی طباعت کی جاتی تھی۔ فوٹو ٹیکنالوجی کا فقدان تھا۔

اس کے برخلاف دورِ جدید کی تکنیکی صورتوں نے جس طرح آج کے رسائل کی طباعت کے لیے سہولیات فراہم کردی ہیں ان کی وجہ سے عہدِ جدید کے اردو کے رسائل معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے کافی دلکش اور جاذبِ نظر بن گئے ہیں۔ آج کے اردو رسائل بھی دیگر زبانوں کے رسائل ہی کی طرح خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ ہی معیاری اور نامور آرٹسٹوں کے فنی ہنر کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ذریعے بنایا گیا دیدہ زیب سرورق ہی لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کردیتا ہے۔

اسی کے ساتھ موضوعات کے سلسلے میں بھی کافی کچھ تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں، جو اپنے عہد کے اہم ترین تقاضوں کی تبدیلی کو منعکس کرتی ہیں۔ ان موضوعات میں ادبی، شعری، سیاسی، معاشرتی، فلمی اور بڑی حد تک مذہبی شعبوں کے تقاضے شامل ہونے لگے ہیں۔

اگر اردو کے قدیم رسائل کا جائزہ لیا جائے تو

صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثریت ان رسائل کی ہوتی تھی جن کا تعلق ادب اور مذہب سے ہوتا تھا۔ اکا دکا فلمی رسالے بھی اس عہد میں شائع کیے جاتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس دور قدیم میں فلم تکنیک کافی کمزور تھی۔ زیادہ تر افراد کا رحجان ادب یا مذہب ہی کی جانب تھا اسی لیے ان موضوعات کو عام زندگی میں کافی دخل تھا۔ لیکن جیسے جیسے فلم انڈسٹری کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اس موضوع پر کافی توجہ دی جانے لگی اور اسی سے متعلق رسائل منظر عام پر آنے لگے۔

ادبی رسائل کے ساتھ غیر منقسم ہندوستان میں دہلی سے ماہنامہ 'شمع' کا اجراء حافظ یوسف دہلوی کے ذریعے کیا گیا۔ یہ ایک صاف ستھرا فلمی رسالہ تھا، جس کا بڑا حصہ فلمی مواد پر مشتمل رہتا تھا۔ مگر اس کے چند صفحات شعروادب کے لیے بھی مخصوص کر دیے گئے تھے، جن پر ملک کے اعلیٰ اور قابل ذکر قلم کاروں کی تخلیقات چھاپی جاتی تھیں، جس کی وجہ سے اس رسالے کی تھوڑی بہت ادبی حیثیت بھی بن گئی تھی۔ شروع میں اس رسالے کو دہلی کے محلہ پھاٹک حبش خاں سے جاری کیا گیا تھا اس کے بعد اس کے دفتر کو آصف علی روڈ پر منتقل کر دیا گیا۔ حافظ یوسف دہلوی کے ساتھ ہی ان کے بیٹے یونس دہلوی' ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی بھی اس کی ادارت میں شامل تھے۔ اس رسالے کی تزئین اس وقت کے چند مشہور آرٹسٹوں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اور اس میں قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھ پوری، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری، پریم وار برٹنی، بسمل سعیدی، جیسے فنکاروں کی تخلیقات برابر شائع کی جاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ اس رسالے میں چند مستقل عنوانات کے تحت مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ جن کا زیادہ تر تعلق فلمی موضوعات سے ہوتا تھا۔

تقسیم وطن سے قبل مذہبی رسائل میں دہلی سے ماہنامہ 'آستانہ' ماہنامہ 'دین دنیا' اور ماہنامہ 'مولوی' کی اشاعت کی جاتی تھی۔ یہ تینوں رسائل اس عہد میں خاصے مقبول تھے۔ جن کا بڑا حصہ مذہبی امور پر مشتمل ہوا کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ان میں کچھ سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی شامل کر دیا جاتا تھا جن کا تعلق اس عہد کے اہم سیاسی اور سماجی مسائل سے ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ مذہبی اعتبار سے اس وقت لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'سرفراز' بھی خاصا مقبول تھا، جس کے لیے خصوصی شمارے شائع کیے گئے جن میں محرم نمبر' رجب المرجب نمبر اور رمضان المبارک نمبر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس عہد کے مذکورہ ادبی، فلمی اور مذہبی رسائل گاہ بہ گاہ اہم موضوعات پر خصوصی شماروں کی اشاعت بھی کیا کرتے تھے۔ مگر یہ سارے خصوصی شمارے اپنی قدیم شکلوں میں شائع کیے جاتے تھے۔

بیسویں صدی میں اردو صحافت اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ادبی رسائل کا کافی بڑا مرکز لاہور ہی تھا جہاں سے 'ہمایوں'، 'نیرنگِ خیال' جیسے معیاری رسائل کی اشاعت کی جاتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ دہلی سے شائع ہونے والے رسائل میں 'ساقی' اور لکھنؤ سے طبع ہونے والے رسائل میں 'نگار' [جسے سب سے پہلے نیاز فتح پوری نے بھوپال سے شائع کیا تھا]۔ خوشتر گرامی نے اسی زمانے میں ماہ نامہ 'بیسویں صدی' کا اجرا کیا جو خالص ادبی حیثیت کا بڑا مقبول رسالہ تھا۔ اسی کے ساتھ آگرہ سے شائع ہونے والے ادبی رسالے 'شاعر' کو بھی کافی شہرت ملی ہوئی تھی۔ جسے بعد میں ممبئی میں منتقل کر دیا گیا۔ حسرت موہانی کا رسالہ 'اردوئے معلیٰ' نے اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ساتھ ہی شیخ عبدالقادر کے 'مخزن' سردار دیوان سنگھ مفتوں کا 'ریاست' راشد الخیری کا 'عصمت' ظفر علی خان کا 'زمیں دار' محبوب عالم کا 'پیسہ اخبار' منشی نول کشور کا 'اودھ اخبار' خواجہ حسن نظامی کا 'نظام مشائخ' مولوی مجید کا 'مدینہ' منشی دیا نارائن نگم کا 'زمانہ' مولانا محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا 'سچ' جالب دہلوی کا 'ہمدم' مہاشہ کرشن کا 'پرتاپ' لالہ لاج پت رائے کا 'وندے ماترم' مولانا محمد عثمان فارقلیط کا 'الجمعیۃ' سیّد حبیب کا روز نامہ 'سیاست' عبدالحمید انصاری کا روزنامہ 'انقلاب' چراغ حسن حسرت کا 'احسان' نسیم انہونی کا رسالہ 'حریم' لالہ شیام لال کپور کا 'کیسری' قاضی عبدالغفار کا 'پیام' غلام احمد آرزو کا 'ہندوستان' لالہ نانک چند ناز کا 'پربھات' حمید نظامی کا 'نوائے وقت' خلیل الرحمان کا 'جنگ' مالک رام کا 'تحریر' بھی اپنے عہد کے اہم رسائل' اخبارات اور ہفت روزہ تھے۔

تقسیم ہند کے بعد بھی ان قدیم رسائل کی طباعت کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر ان کی پرانی شکل میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نہیں لائی جا سکی۔ البتہ اس کے لکھنے والوں میں کچھ نئے نام ضرور جڑتے گئے۔

قدیم زمانے [آزادی وطن سے قبل] میں اردو رسائل کی طباعت زیادہ تر لاہور، دہلی اور لکھنؤ سے ہوتی تھی۔ مگر چند ماہنامے دیگر مقامات سے بھی شائع کیے جاتے تھے جن کی تفصیلات درج میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں صرف ان رسائل کی فہرست یہاں پیش کی جارہی ہے جو ماہناموں کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔ اور جن کی فہرست شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے ماہ نامہ 'آج کل' دہلی [ملاحظہ کیجیے جلد نمبر 42 شمارہ 4-5] میں شائع کی ہے۔ اس فہرست کے مطابق جو ماہ نامے قدیم عہد میں شائع ہوئے ان کے نام علی الترتیب اس طرح ہیں:

(1) پیر بر، دہلی پنچ المعروف بہ پیر بر ماہ نامہ دہلی اجراء 1885 مالک منشی افضل خاں۔ (2) دامن گلچیں لکھنؤ ماہنامہ سرپرست منشی امیر لکھنوی ایڈیٹر و مالک محمد احمد قمر خلف منشی امیر لکھنی اجرا فروری 1885، (3) دہلی پنچ لاپور اجراء 1880 ماہنامہ گلدستہ مالک بخش اللہ (4) گلدستۂ چمن سخن ماہنامہ بدایوں مالک محمد وارث علی خاں (5) گلدستہ حسن یار ماہنامہ قنوج ضلع فرخ آباد اجرا 18855 میر سید حسن صبح مختار عدالت تحصیل قنوج اور شیخ تہور علی مالکان۔

(2) گلدستۂ ناز ماہنامہ جاری شدہ 1884 ایڈیٹر محترمہ بلقیس بیگم (7) گل کدہ بہار سہوان ضلع بدایوں نامہ اجراء جنوری 1885 ایڈیٹر محمد متین خاں متین (8) گلدستہ پیام عاشق قنوج ضلع فرخ آباد اجراء وپل 1884 ماہنامہ مہتمم بھگو خاں رحم (9) گلدستہ نامہ عشاق بنارس ماہنامہ صفحات 20 مینیجر ولی محمد (1) گلدستۂ پیام یار لکھنؤ اجرا 1882 مہتمم محمد نثار حسین نثار ماہنامہ (11) معلم شفیق حیدر آباد دکن ماہنامہ ایڈیٹر سید محبّ حسین اجراء 1882، (12) نور بصیرت کلکتہ اجراء جولائی 1884 ایڈیٹر سید عبد الغفور شہباز [اس ماہنامہ کے بارے میں بھٹا چاریہ کا یہ نوٹ درج ہے۔

''یہ مکمل طور پر نثر میں شائع ہونے والا پہلا ماہنامہ ہے میری نظر سے اب تک اس سے قبل مکمل طور پر شائع ہونے والا کوئی ادبی ماہنامہ نہیں گزرا ہے۔''

(13) انجمن اسلام لکھنؤ ماہنامہ اجرا 1875 یہ ماہنامہ انجمن اسلام کا ترجمان تھا اور محمد وزیر کے اہتمام سے گلزار محمد باغ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔

(14) گلدستۂ شعراء [یہ انوار الاخبار کا ماہوار ضمیمہ تھا] اجرا 1874 مطبع انوار محمد سے باہتمام فتح...... کے شائع ہوتا تھا۔ (15) تکمیل الحکمۃ ماہنامہ لاہور، (16) مراۃ الطبعات ماہنامہ امرتسر، (17) ظریف ماہنامہ بنارس، (18) سوانح عمری ماہنامہ لاہور، (19) رسالہ فنون ماہنامہ حیدر آباد دکن (20) مذاق سخن ماہنامہ حیدر آباد دکن، (21) کلید قوانین ماہنامہ لاہور، (22) رسالہ' آئینۂ ہند ماہوار لاہور

اپنے اسی مضمون نے بھٹا چاریہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے ''پوری انیسویں صدی میں یعنی 1822 سے لے کر

1899 تک کم وبیش پانچ سو اخبارات و رسائل ہندوستان کے کونے کونے سے نکلے ہیں۔'' ہم نے یہاں پر انیسویں صدی میں شائع ہونے والے صرف ماہناموں کی فہرست درج کی ہے۔ ان کے علاوہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے جن روزناموں اور ہفت روزہ اخبارات کی طویل فہرست اپنے مضمون میں درج کی ہے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ ان کا تعلق ہمارے موضوع سے بہت کم رہا ہے۔ یہاں ہم بیسویں صدی میں شائع ہونے والے چند رسائل کے خصوصی شماروں کی فہرست درج کرتے ہیں جو اس طرح ہے:

'شاہ راہ' دہلی [مدیر ساحر لدھیانوی اور ظ۔ انصاری] کا ناولٹ نمبر 1958

'تحریر' دہلی [مدیر مالک رام] کا ضیا فتح آبادی نمبر 1977

'معاصر' [مدیران کلیم الدین احمد اور عظیم الدین احمد] کا قاضی عبدالودود نمبر

'صبح نو' [مدیر وفا ملک پوری اور کلام حیدری] کے علی عباس حسینی نمبر غالب نمبر وغیرہ

'ندیم' کا انجم مانپوری نمبر اور ریاست علی ندوی نمبر

''ساغر نو'' کا اختر اورینوی نمبر

☆

'سہیل' کے پریم چند نمبر، سہیل نمبر، کلام حیدری نمبر، شفیع مشہدی نمبر، قیصر عثمانی نمبر، کلیم الدین احمد نمبر

'آہنگ' گیا کا احتشام حسین نمبر

'زبان و ادب' [مدیران سہیل عظیم آبادی اور شین مظفر پوری] کا شاد عظیم آبادی نمبر، پرویز شاہدی نمبر، سہیل عظیم آبادی نمبر، اطفال نمبر

'اردوستان' پٹنہ سہیل عظیم آبادی نمبر [اپریل 1975]

درج بالا ماہناموں کی فہرست کے مقابلے میں جب ہم ماہنامہ ''نگار'' کے خصوصی شماروں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ اردو کا وہ واحد ماہنامہ رہا ہے جس کے خصوصی شماروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جسے یہاں درج کیا جاتا ہے:

(1) سالنامہ [مومن نمبر] 1928، (2) مصحفی نمبر 1939، (3) نظیر نمبر 1940، (4) غزل کا انتخاب نمبر 1942، (5) ریاض خیر آبادی نمبر 1943، (6) جدید شاعری نمبر 1944، (7) قرآن نمبر 1945، (8) سالنامہ 1946، (9) ماجد ولین نمبر 1947، (10) پاکستان نمبر 1948، (11) افسانہ نمبر 1949، (12) سالنامہ 1950، (13) سالنامہ 1951، (14) حسرت نمبر 1952، (15) فرمانروایان اسلام نمبر 1954، (16) علوم اسلامی نمبر 1955، (17) خدا نمبر 1956، (18) سالنامہ اصناف سخن نمبر 1957، (19) معلومات نمبر 1958، (20) تنقیح اسلام نمبر 1959، (21) مومن نمبر 1928، (22) غالب نمبر، (23) اصحاب کہف نمبر، (24) اسلامی نمبر 1938، (25) انتقاد نمبر 1946، (26) داغ نمبر 1953، (27) علم اسلامی و علمائے اسلام نمبر 1955، (28) تنقیح اسلام نمبر 1959، (29) اقبال نمبر 1962، (30) نیاز نمبر 1963 (31) تذکرہ نمبر، (32) اصناف ادب نمبر 1966

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماہ نامہ 'نگار' نے اردو صحافت کے دامن کو خصوصی شماروں کی طباعت کر کے مالا مال کر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اسی عہد میں بعض دوسرے رسائل نے بھی قابل ذکر خصوصی شماروں کی اشاعت کر کے اردو صحافت کو زریں دور عطا کیا۔ ایسے ہی چند ادبی رسائل کے چند لائق ذکر خصوصی شماروں کی تفصیلات یہاں درج کرنا مناسب معلوم دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

(1) ماہ نامہ عالم گیر لاہور خاص نمبر 1935
(2) ماہ نامہ عالم گیر لاہور خاص نمبر 1945
(3) ماہ نامہ عالم گیر لاہور سال نامہ 1947
(4) ماہ نامہ عالم گیر لاہور افسانہ نمبر 1947
(5) ماہ نامہ ساقی دہلی ظریف نمبر 1934
(6) ماہ نامہ ساقی دہلی سال نامہ نمبر 1934
(7) ماہ نامہ ساقی دہلی افسانہ نمبر 1937
(8) ماہ نامہ ساقی دہلی اشاعتِ خاص [افسانہ اور ڈرامہ پر مشتمل] 1939
(9) ماہ نامہ نیرنگ خیال لاہور اتا ترک مصطفیٰ کمال نمبر جولائی 1937
(10) ماہ نامہ جہاں گیر عثمان لاہور نظام نمبر 1933
(11) ماہ نامہ حقیقتِ اسلام لاہور سال نامہ 1933
(12) ماہ نامہ ہمایوں لاہور رسال گرہ نمبر 1938
(13) ماہ نامہ تحریک دہلی بیس سالہ انتخاب نمبر مارچ 1953
(14) ماہنامہ شاعر ممبئی آزادی نمبر 1971
(15) ماہنامہ شاعر سالنامہ 1972
(16) ماہنامہ شاعر قومی یک جہتی نمبر 1974
(17) ماہنامہ شاعر ہم عصر نمبر 1977
(18) ماہنامہ شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر 1980
(19) ماہنامہ ادب لطیف افسانہ نمبر 1943
(20) مجلّہ قند مردان ڈرامہ نمبر 1961
(21) فن اور شخصیت قتیل شفائی نمبر ستمبر 81، تا مارچ 1982
(22) فن اور شخصیت مہندر ناتھ نمبر مارچ 1975
(23) ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر یلدرم نمبر
(24) پندرہ روزہ قومی آواز کراچی عبدالحق نمبر 1961
(25) ماہنامہ افکار کراچی جوش نمبر 1961
(26) ہفتہ وار برگ آوارہ حیدرآباد [دکن] جائی نمبر جون 1971
(27) ماہنامہ ساقی دہلی نمبر 1934
(28) ماہنامہ ساقی راشد الخیری نمبر 1936
(29) ماہنامہ شاہ راہ دہلی ناولٹ نمبر
(30) ماہنامہ عالم گیر تقویم نمبر 1933
(31) ماہنامہ عالم گیر تاریخ نمبر 1943
(32) ماہنامہ نیرنگ خیال عید نمبر ۱۹۲۹ء
(33) ماہنامہ سرفراز لکھنؤ محرم نمبر 78-75-74۔ اور 1979
(34) ماہنامہ سرفراز لکھنؤ رجب نمبر 75-73-71-70 اور 1987
(35) سہ روزہ دعوت دہلی ہندوستانی مذہب نمبر 1993
(36) ماہنامہ الحسانات زکوٰۃ 1964
(37) ماہنامہ فروغ اردو احتشام حسین نمبر 1974 دھنپت رائے پریم چند نمبر
(38) ماہنامہ آج کل ڈراما نمبر 1959، شعر و شاعری نمبر 1953 نظم نمبر 1958 اردو نمبر 1973
(39) ماہنامہ صبا حیدرآباد ابوالکلام آزاد نمبر 1959
(40) نیا دور لکھنؤ جلد اول و دوم 1984
(41) ماہنامہ شاہکار الہ آباد فراق نمبر
(42) ماہنامہ تحریک دہلی چین نمبر 1964 اور 20 رسالہ انتخاب نمبر 1973
43) ماہنامہ گفتگو ممبئی ترقی پسند ادب نمبر جلد اول 1980
(44) ماہنامہ شمع دہلی خاص نمبر 1949 اور 1951
(45) ماہنامہ روبی دہلی افسانہ نمبر 1978
(46) ماہنامہ بانو دہلی خاص نمبر 1964 اور 1978
(47) ماہنامہ انوار حیدرآباد 1950
(48) ہمایوں سالگرہ نمبر 1934,1935 اور 1938

ان رسائل کے علاوہ اردو کے متعدد ڈائجسٹ نے بھی اپنے خصوصی شماروں کی اشاعت کی۔

ادبی رسائل کے خصوصی نمبرات کے شعوری مطالعے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت کا معیار بے حد بلند تھا۔ جس کے ذریعے علم و ادب کے کئی اہم پہلوؤں کو ابھار کر اہل ذوق حضرات کو اپنی جانب نہ صرف متوجہ ہی کیا گیا بلکہ ان کے علمی اور معلوماتی ذوق میں قابل قدر اضافے بھی کیے گئے۔

■

Dr. Farzana Beg Jameel Ahmad
2, North, Ghafoor Khan ki Bazaria
Indore (MP)

جویریہ قاضی

جناب محمد اقبال سے گفتگو

اقبال درزی نام ہے ایک ایسے علم دوست بزرگ کا جو گذشتہ تیس برس سے صمدیہ ہائی اسکول بھیونڈی میں لائبریرین کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ نہایت حلیم اور برد بار شخصیت کے مالک ہیں۔ نام و نمود اور شہرت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن معاشرے کے تمام مسائل سے پوری طرح واقف ہیں اور ان مسائل کے سد باب کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خالص دینی مزاج کے حامل اقبال درزی انسانیت کے فروغ کو سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہیں اور اسی لیے ان کا ماننا ہے کہ تمام مذاہب کے لوگوں کو مل کر انسانیت کی بقا کے لیے جدوجہد کی ضرورت آج سب سے زیادہ ہے۔ مومن گرلس ہائی اسکول بھیونڈی کی پرنسپل محترمہ جویریہ قاضی نے اقبال درزی صاحب سے گفتگو کی ہے۔

سوال: محترم ہم آپ کا مکمل نام جاننا چاہیں گے۔؟

جواب: محمد اقبال محمد حسن

سوال: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: 28 مارچ 1966 اور بھیونڈی (مہاراشٹر) میں ہوئی۔

سوال: آپ کی تعلیمی لیاقت کیا ہے۔؟ اور مشغولیت کیا ہے؟

جواب: تعلیمی لیاقت کا کیا کہوں۔ میں نے s.s.c صمدیہ ہائی اسکول سے جو کبھی بھیونڈی ویورس ہائی اسکول کے نام سے ہوا کرتا تھا اور H.s.c شاد آدم جونیر کالج سے اور لائبریرین کا کورس تھانے (مہاراشٹر) سے کیا۔ اور فی الوقت صمدیہ ہائی اسکول میں لائبریرین کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

سوال: کتابوں پر تبصرے اور خطوط لکھنے میں کیا چیز محرک بنی؟

جواب: کتابوں پر تبصرے لکھنے کا معاملہ لایعنی کتابوں پر تبصروں سے شروع ہوا میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر کسی سے براہ راست ملاقات نہ ہو سکے اور کچھ حاصل کرنا ہے تو خطوط واحد ذریعہ ہے مزید یہ کہ ایک یادگار واقعہ 1984 میں بھیونڈی میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا تو رئیس ہائی اسکول کے گراؤنڈ پر ریلیف کیمپ لگایا گیا تھا اس میں مدر ٹریسا اپنی پوری ٹیم کے ساتھ تشریف لائی تھیں انھوں نے میلے کچیلے بچوں کو گود لیا، مجبور بیواؤں کو گلے لگایا اس وقت ہم والنٹیر س کے طور پر کام کر رہے تھے تو میں نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا تو قریب ہی تھا پوچھ لیا کہ آپ یہ سب کیوں کرتی ہیں انھوں نے مترجم کے ذریعے کہلایا کہ ''سب کا خون ایک ہے اور سب کے مسائل ایک ہیں''۔ میں نے سب سے زیادہ تل ابیب سے خط و کتابت کی ہے کیونکہ انسانیت کی پامالی کا وہیں سے گہرا تعلق ہے۔

سوال: آپ کے پسندیدہ مصنف کون ہیں؟ اور کیوں؟

جواب: نثر میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید ابوالاعلی مودودی، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبان یہ وہ شخصیات ہیں جن کی تحریروں میں مذہبی رنگ کے ساتھ ساتھ اعلی درجے کا ادب پایا جاتا ہے۔ شعر و شاعری میں علامہ اقبال اور فیض احمد فیض، اور احمد فراز کی شاعری میں فن اور فلسفہ کے اعتبار سے بامعنی شاعری ہے جہاں زندگی کے مسائل، محبت اور بھائی چارہ۔ انسان سے انسان کے مضبوط رشتے کی استواری کا جابجا تذکرہ ملتا ہے اقبال کی شاعری کا سرچشمہ وحی الٰہی، تاریخ، منطق و فلسفہ اور گزرے ہوئے مفکرین و دانشوران ہیں انھوں نے دنیائے انسانیت کی عموما اور مسلمانوں کی حالت زار پر خصوصا توجہ دی ہے۔

سوال: آج لوگ مطالعہ (کتب بینی) سے دور ہو رہے ہیں۔ اس کے تدارک کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: یہ بات بالکل درست ہے بلکہ عوام کے ساتھ خواص میں بھی مطالعے کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ مطالعے سے دوری بتدریج بڑھتی گئی پہلے حصول علم کا ذریعہ کتابیں ہی ہوا کرتی تھیں رفتہ رفتہ قدریں بدلتی گئیں ٹکنالوجی نے سب کچھ بدل دیا باوجود اس کے کتاب کی حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کا کوئی متبادل نہیں ہے الیکٹرونک میڈیا نے ذوق مطالعہ کو بری طرح متاثر کیا ہے کتابوں سے طلبہ و اساتذہ کی دوری کا تدارک اہم اور حساس ذمہ داری ہے۔

سوال: آپ اسکول سے منسلک ہیں اس لیے آپ ایک معلم کو کیا پیغام دیں گے۔؟

جواب: ہر استاد اپنی ذمے داری کو ایمانداری سے ادا کرے میں قطعی ناپسند کرتا ہوں کہ اساتذہ اسکول کیمپس میں لاحاصل گفتگو کریں اپنے اپنے مضامین مذہبیات اور عام معلومات میں اپڈیٹ رہنا چاہیے ہر وقت یہ خوف ہونا چاہیے کہ صرف ہیڈ یا ایجوکیشن آفیسر نہیں بلکہ مالک حقیقی بھی مشاہدہ کر رہا ہے اور تمام طلبہ سے انصاف کریں۔

سوال: جمالیاتی حس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب۔ جمالیات سے لگاؤ فطری بات ہے قدیم انسان حسن پرست تھا اور جمالیات کا دلدادہ تھا جس کے نمونے آج بھی اجنتا ایلورا کے غار، تاج محل، اسپین کی مسجد قرطبہ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سنگ تراشی کے پیکر گواہ ہیں۔ لیکن آج کے انسان نے لالچ کو چلن بنا دیا ہے وہ اپنے باس سے ٹارگیٹ لیتا ہے کہ اس ماہ اس کو کتنے شکار گاہک کی صورت میں پکڑنے ہیں۔

سوال: نظام تعلیم پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب: جس نظام تعلیم میں اخلاقیات کا فقدان ہوگا وہ ہمیشہ پسپا ہوگا۔ ہر مرتبہ نظام میں نت نئے پیوند لگا کر اس کو بوسیدہ تر کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں درس و تدریس کو سنہرے حرفوں میں لکھا گیا ہے جس میں دیوی دیوتاؤں کو بھی استاد و شاگرد کے عظیم رشتے میں باندھا گیا ہے۔ کم از کم اپنے اسلاف کے عمل کی پاسداری کریں تو بھی کافی ہے۔

سوال: حالات کا تدارک کیسے ہوگا؟

جواب: مغربی دنیا نے خصوصا عیسائی قوم نے تدریس اور ہاسپٹل یعنی اسکول اور علاج و معالجہ کے نظام کو مذہبی جذبات

سے جوڑ دیا ہے چونکہ مذہب کا جذبہ روح سے منسلک ہوتا ہے اس لیے بھی اس کے ذریعے ہونے والا عمل فریب دہی سے خالی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مشنری اسکولیں اپنے عروج پر ہیں ہم بھی تدریس کے تئیں مذہب کو بنیاد بنائیں میں نہیں کہتا کہ صرف مسلمان بلکہ ہر ٹیچر اپنے اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو انجام دے، جس میں ذمہ داری کے ساتھ ساتھ خدا ترسی بھی ہو تو حالات کا بآسانی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

سوال: محترم آپ کن لوگوں سے متاثر ہیں یا کن لوگوں کی رہنمائی نے آپ کو حوصلہ دیا؟

جواب: میرے والدین کا میری تربیت میں خاص حصہ رہا ہے اس کے بعد میرے باعمل اساتذہ کرام جنھوں نے مجھے بتدریج علمی دنیا سے متعارف کرایا جن میں مشفق استاد محترم مرحوم مولانا حامد، مرحوم آفتاب، مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری، مولانا عمران ندوی، مرحوم شبیر راہی اور آج کل ہم الحمد للہ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمان اعظمی (صدر مدرس ندوۃ العلماء)، ڈاکٹر اکرم ندوی صاحب (استاد آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ) جیسے حضرات سے فیضیاب ہو رہے ہیں جن کی روحیں ان کے جسموں سے زیادہ قوی ہیں عام طور پر انسانی جسم گناہوں سے بوجھل ہوا کرتے ہیں۔

سوال: آپ کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: میں مولانا آزاد کی سوچ سے متفق ہوں میرے نزدیک دنیا کے تمام مذاہب میں اچھائیاں ہیں مذاہب کا منبع ایک ہی رہا ہے شکلیں بدلتی گئیں اور اتنی تبدیلی ہوگئی کم از کم جو چیز یا اچھائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں انھیں عزت دینی چاہیے کسی کو حقارت سے نہ دیکھا جائے تاکہ تمام لوگ ایک دوسرے کی باتیں سنیں اسی منفرد سوچ کے سبب بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے میں مذہب بیزار نہیں ہوں خالص مذہبی ہوں مذہب کو بالائے طاق رکھ کر کامیابی ملنے والی نہیں۔ اگر ملی بھی تو دیرپا نہ ہوگی۔

سوال: کیا آپ تہذیبی آلودگی محسوس کرتے ہیں؟

جواب: تصادم کے نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو آلودگی تو ہوتا ہی ہے تہذیب جدید کے نام پر جو بے حیائی اور آوارگی آئی ہے وہ سب کی سب تہذیبی آلودگی ہے نوجوان نسل کو اس وبا سے بچانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

سوال: اردو کتاب میلہ سنہ 2016 جو کے، ایم، ای سوسائٹی کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا اس کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: اردو کتاب میلہ سنہ 2016 کی ایک تاریخی حقیقت ہے اہل بھیونڈی کے گھروں میں کتابوں کا ذخیرہ ہوا۔ کتابوں کی صحبت اچھی صحبت ہے۔ انسان کو انسان بناتی ہے لیکن کتاب خریدنے اور علم حاصل کرنے میں فرق ہے۔

سوال: 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' اس موضوع پر کانفرنس کا خیال کیسے آیا؟

جواب: ہندوستان ایک قدیم ملک ہے اور دنیا کے جن خطوں میں انسانی تہذیب وتمدن نے آنکھیں کھولی ہیں ان میں ہندوستان کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ اور علم الانسان، جغرافیائی تحقیقات نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اب تک انسانوں کی ایسی کوئی بھی جماعت نہیں رہی ہے جو مذہب سے بالکل عاری ہو۔ خود ہندوستان بھی چار بڑے مذہب کا منبع ہے اور مختلف تہذیب وتمدن کی آماجگاہ رہا ہے۔ لیکن ویدک نظریہ نے انسانوں کو مختلف طبقات اور ورنوں میں تقسیم کیا۔ چنانچہ ذات پات کے اس نظام نے ایک طبقہ کو بام عروج پر پہنچا دیا اور دوسرے کو اسفل السافلین میں جگہ دی۔ لیکن دکن میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں نے حکمرانی کی ہے۔ عادل شاہی بادشاہوں کے عدل وانصاف، بہمنی تاجداروں کی رواداری لقب ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ مساوات کا جو برتاؤ آصف جاہی حکومت نے برتا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں ہر کسی کو مذہبی آزادی تھی۔ مسجد، مندر، گرودوارے، کلیسا، آتش کدہ سبھی کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں صدائے ناقوس بلند ہوتی وہیں اذان بھی سنائی دیتی، آتش کدوں میں آگ دہکتی اور گرجاؤں میں گھنٹے بجتے۔

حیدرآباد میں ایک طرف نوابوں کے خاندان امیرانہ تزک واحتشام کے ساتھ رہتے تھے تو دوسری طرف چھتریوں، برہموں اور کائستھوں کے خاندان باسطوت زندگی گزارتے تھے۔ محکمۂ امور مذہبی کا بنیادی مقصد ہی مختلف قوموں اور طبقوں کی مذہبی اور روحانی ترقی کے لیے سہولتیں پہنچانا تھا۔ ایسے قاعدے مرتب کیے گئے تھے کہ کسی کے مذہبی جذبات نہ بھڑکیں اور مملکت میں ہر طرف صلح وآشتی کا ماحول بنا رہے۔ اسی پس منظر میں حالات حاضرہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔

سوال: کیا آپ بھی پر امید ہیں کہ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی'؟

جواب: 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' اس مصرعے کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے وطن کی تعریف اس سے بڑھ کر اور بہتر انداز میں شاید ہی کوئی کر پائے جو شاعر مشرق علامہ اقبال نے ایک مصرعے میں کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص آج کے دل برداشتہ حالات سے بد دل ہو کر اس حقیقت کا مذاق اڑائے تو یہ اس کی غلطی ہے ملک کی ترقی وتعمیر، اس کی شہرت اور عظمت کی تمام تر ذمہ داریاں باشندگان ملک پر عائد ہوتی ہیں۔ یہاں مولانا آزاد کے اس خیال پر اپنی بات مکمل کرنا چاہوں گا کہ 'ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کے دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا میدان تھا۔' اور آخر بات ہمارے سمجھنے کی ہے کہ ماضی روشن ہو تو مستقبل بھی روشن ہوتا ہے۔ جو تاریخ کو مسخ کرتا ہے، تاریخ اسے مسخ کرتی ہے۔ تاریخ کسی کو بھی لمبی زندگی نہیں دیتی یہ ہمارا کام ہے کہ ایک لمحۂ بیکراں سے عمر جاوداں پیدا کریں۔

سوال: آج کا آخری سوال یہ ہے کہ اس وقت آپ کن مقاصد کی حصولیابی میں مصروف ہیں۔

جواب: 2005 سے ہم خیال دوستوں نے ایک فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی جسے اسلامک سوشل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن کے نام سے جانا جاتا ہے میں اس کا سکریٹری ہوں ہم نے اس کے جو مقاصد متعین کیے ہیں ان کا بنیادی مقصد بین المذاہب بھائی چارہ ہو اور بین الادیان امن ومحبت کے مذاکرات ہوں اس ضمن میں ہم نے قومی سطح پر کئی پروگرام کیے گذشتہ برس ہماری کانفرنس 'کثرت میں وحدت کانفرنس' کے عنوان سے منعقد ہوئی امسال 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' کے عنوان سے ایک عظیم کانفرنس ہونا طے ہے جس میں خادم حرمین شریفین ایوارڈ جو امن عالم کے ضمن میں ہوگا جبکہ ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام سائنس ایوارڈ جو کہ سائنسی خدمات کے سلسلے میں تفویض کیا جائے گا۔

ہمارے مقاصد میں پہلا مقصد جدید تقاضوں کو پورا کرنے والی ایک عظیم لائبریری کا قیام ہے جو بین المذاہب مطالعہ کا مرکز ہوگا اور ریسرچ سینٹر بھی ہمیں یقین ہے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

یہ اور بات کہ آندھی ہمارے بس میں نہیں
مگر چراغ جلانا تو اختیار میں ہے

■

Juwaria Qazi
Principal Momin Girls High School
Bhiwandi-421302 (MS)

شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری

محبوب الٰہی

ہندوستان کا مغلیہ شاہی خاندان نہ صرف یہ کہ ادب اور آرٹ کی سرپرستی کرتا رہا بلکہ اسے ادب اور فن سے گہری دل چسپی بھی تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ خود شاہی خاندان کے بہت سے افراد نے قابل قدر ادبی کارنامہ انجام دیا اور نظم و نثر میں اپنی یادگار چھوڑیں۔ انھیں میں سے ایک شاہ عالم ثانی آفتاب کی اہم شخصیت ہے۔ وہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دسواں مغل بادشاہ تھے۔ ان کی پیدائش 14 جون 1728 عیسوی میں ہوئی۔ جب مغلیہ سلطنت رو بہ زوال ہو چکی تھی۔

شاہ عالم ثانی آفتاب کو کئی مشرقی زبانوں پر دستگاہ حاصل تھی۔ حالانکہ ان کی پوری زندگی بے چینی میں گزری لیکن انھوں نے ہر حال میں ادب اور شاعری سے اپنی دلچسپی قائم رکھی۔ مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ادب اور شاعری سے یک گونہ ذہنی سکون ملتا تھا۔ اور یہی ان کی تنہائی کا بہترین ہم نشیں ہے۔

شاہ عالم ثانی آفتاب نے اردو فارسی کے علاوہ بھاشا اور پوربی میں بھی شاعری کی ہے۔ شاعری سے انھیں کس قدر دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب بکسر کی جنگ کے بعد انگریزوں کی سرپرستی یا نگرانی میں الہ آباد میں بے کاری کے دن گزار رہے تھے۔ ان دنوں انھوں نے اردو فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کی۔ غرض یہ کہ دربدری کے باوجود انھوں نے شعر و شاعری کو ترک نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ سفر میں بھی فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے۔ خصوصاً جب غلام قادر خان نے شاہ عام ثانی آفتاب کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں تو وہ صرف کان اور زبان سے ہی دل بہلایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے دور کے نامور شعرائے کرام جیسے حکیم ثناء اللہ خاں فراق، قدرت اللہ خاں قاسم، شاہ ہدایت میاں شکیبا، شیخ ولی اللہ محب وغیرہ اپنے کلام سے نابینا بادشاہ کو محظوظ کرتے اور ان کا دل بہلاتے اور بادشاہ کے کلام کی داد دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سید انشاء اپنے کلام کے علاوہ ادبی اور ظرافت آمیز باتوں سے شرکائے مجلس کو مسکرانے اور قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ اس لیے شاہ عالم ثانی آفتاب کو ان سے زیادہ تعلق ہو گیا تھا اور وہ سید انشا کی سب سے بڑھ کر قدر دانی کرتے اور ان کی ہر ضرورت اور فرمائش پوری کر دیا کرتے تھے۔

شاہ عالم ثانی آفتاب صاحب دیوان شاعر تھے۔ اردو فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے تھے۔ فارسی زبان میں ان کی شاعری کا مجموعہ 'مثنوی منظوم اقدس' کے نام سے ہے اور اردو میں ان کے دیوان کا نام 'نادرات شاہی' ہے لیکن شاہ عالم ثانی آفتاب کا اردو دیوان جس کا ذکر ڈاکٹر اشپرنگر نے دیوان آفتاب کے نام سے کیا ہے وہ اب نایاب ہے یہی حال منظوم اقدس کا ہے مگر مختلف تذکروں میں ان کے اردو اشعار ضرور پائے جاتے ہیں۔

اب وہ شاہ عالم ثانی آفتاب کے اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کلام کا ایک مجموعہ یعنی 'نادرات شاہی' دستیاب ہے جسے رضا لائبریری رامپور نے 1984 میں شائع کیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''یہ کتاب اس عہد کی صاف ستھری ہندی زبان کا قیمتی نمونہ ہونے کے سبب ہندی ادب کی تاریخ میں نمایاں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کے زمانے میں ہندوؤں کے حکومت سے کیسے تعلقات تھے قلعہ معلی میں اسلامی اور ہندوانہ کون کون سی رسمیں کس طرح برتی جاتی تھیں اور بادشاہ کو دیسی زبانوں سے کتنی دلچسپی تھی اس لیے یہ کتاب سیاسی اور سماجی حیثیت سے بھی بہت دلچسپ ہے، اور آخری صفت۔ جو اہمیت میں پہلی خوبیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ہے کہ اسے

بادشاہ نے دیوناگری اور نستعلیق دونوں خطوں میں لکھوا کر اس مسئلے کا بڑا اچھا حل پیدا کردیا جو آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں سے طے نہیں ہوسکا۔"

(بحوالہ مقدمہ: تقریب نادرات شاہی)

نادرات شاہی کے مطالعے سے اٹھارہویں صدی کے ان مذہبی اور معاشرتی رسوم اور تہواروں کا پتہ چلتا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج تھے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب نے ان کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین ہوتا ہے کہ عید، بقرعید، شب برات، چھٹی، بسم اللہ، منگنی، مہندی، ہولی اور دیوالی وغیرہ جیسے رسوم اور تہواروں کو وہ خود قلعے کے اندر منایا کرتے تھے۔ ذیل میں عید پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

جو ماہ عید، اس پر رہے گی نظر جہاں
تعریف ہوسکے نہیں، کچھ تیرے ابرواں کی

(بحوالہ صف نمبر 9 نادرات شاہ)

مذکورہ شعر میں عید کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس شعر کا مرکزی خیال عید نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ماہ عید آتا ہے تو شاعر کو اپنے محبوب کی یاد شدت سے آنے لگتی ہے چونکہ عید خوشیوں کا تہوار ہے اور اس مناسبت سے محبوب کا بنا سنورنا اور اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل جائے تو عاشق کے لیے راحت کا باعث بن جاتا ہے۔ اصل جو خاص بات ہے وہ یہ کہ عید کے لفظ کا استعمال شاہ عالم ثانی آفتاب نے اس شعر میں کیا ہے جس سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شعر میں 'عید' اور 'شب برات' دونوں کا استعمال ایک مصرعہ میں کس خوبصورتی سے کیا ہے ذرا ملاحظہ کیجیے

دن عید کا ساگر ہو، اور شب برات کی رات
تو ہی نہ ہو، تو پھر یہ دن رات کچھ نہیں ہے

(بحوالہ صفحہ نمبر 17 نادرات شاہی)

عید ہو یا شب برات بغیر محبوب کے سب بیکار ہے، مزہ تو تب ہے کہ ہر دن ہو اور ہر رات شب برات ہو عید قربان پہ بھی ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

عید قربان، بتو، ای شاہ، مبارک باشد
ہر زمان شادی دلخواہ مبارک باشد

(بحوالہ صفحہ نمبر 78 نادرات شاہی)

اس طرح سے ہم نے دیکھا کہ ان کی شاعری میں کتنی جہات ہیں۔ اب ہولی پہ بھی ایک شعر دیکھیے:

آج رنگ کھیل آئیں سکل برج کی ناری
چووا، چندن، عبیر، گلال اور پچکاری رنگ ماری

(بحوالہ صفحہ نمبر 141، نادرات شاہی)

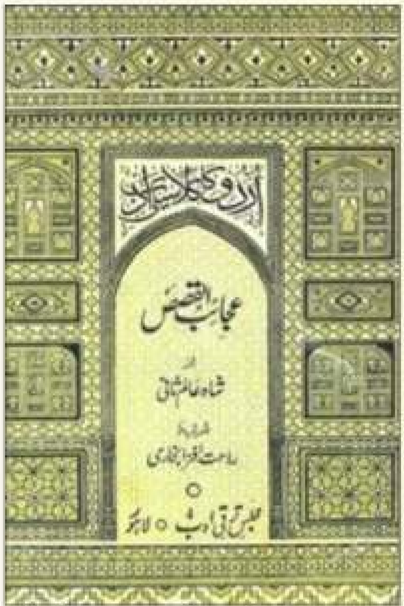

شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری کسی مقصد کے تحت نہیں تھی اگر مقصد ان کی شاعری پہ غالب ہوتا تو مختلف تہواروں کا ذکر ان کی شاعری میں نہیں ہوتا۔ اس سے ان کی آزاد خیالی کا اندازہ ہوتا ہے جس میں گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی دکھائی دیتی ہے سلطنت کی پیچیدہ ذمے داریوں سے دست برداری کے بعد ان کی شاعری میں ان کے احساسات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اٹھارہویں صدی اردو ادب و شاعری کے لحاظ سے ایک عظیم اور انقلابی دور تھا اس صدی میں سیاسی تبدیلی رونما ہوئی۔ شاہ عالم ثانی آفتاب نے اسی سیاسی اور لسانی انقلاب کی صدی میں فارسی، ہندی اور پنجابی کے علاوہ اردوئے معلی میں نہ صرف شاعری کی بلکہ نثر میں 'عجائب القصص' جیسی تاریخی اہمیت کی حامل داستان بھی تصنیف کی۔

شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری خصوصاً غزل اگرچہ اپنے دور کے بلند پایہ اور نامور شعرا جیسے میر، سودا، اور درد کے ہم پلہ نہیں بلکہ دوسرے درجے کی شاعری ہے لیکن ان کی شاعری اس دور کی تہذیب اور روایت کی عکاس ہونے کے اعتبار سے یقیناً منفرد اور ممتاز ہے۔ چنانچہ امتیاز علی خاں عرشی نے شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ان کے شعروں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں پیچ دار خیالات، مشکل فقرے یا لفظ اور دور از کار تشبیہیں نہیں ملتیں۔ ان کی شاعری جذبات کی شاعری ہے جو کچھ دل پر گزرتی ہے۔ خوشی ہو یا رنج، آرام ہو یا تکلیف اسے سادہ طریقے سے بیان کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شان وشکوہ کم مگر اثر زیادہ ہے۔ ممکن نہیں کہ آپ ان کے شعر پڑھیں اور پڑھ کر ان کی خوشی یا رنج کے ساتھی نہ بن جائیں۔ رہ گئی زبان تو وہ قلعہ معلی کے ممتاز رکن تھے۔ ان سے زیادہ ستھری اور پاک صاف اردو کون لکھ سکتا تھا وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں ہمارے لیے سند ہے۔ ایسی سند جس کے روبرو میر اور سودا جیسی تحریریں بھی ناقابل قبول ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے عہد کے شاعروں کے کلام سے مقابلہ کریں تو زبان کے لحاظ سے بڑے سے بڑے شاعر کو بھی ان کا ہم پلہ نہ پائیں گے۔"

مثال کے طور پر ایک غزل ملاحظہ ہو

مطلوب دل ہمارا، اے گلعزار، تو ہے
سب گل رخاں پے غالب، بے نوبہار، تو ہے
مجھ کو نہ سیر بھاوے باغوں کی اور گل کی
میرے بہار دل کی، اے میرے یار، تو ہے
سورج مکھی کیا دل اس آفتاب رو نے
اودھر کو دل پھرے ہے، جیدھر کو یار تو ہے
دل بیقرار ہر دم تیرے فراق میں، آہ!
مجھ بیقرار دل کا، پیارے، قرار تو ہے
مجھ زلف میں پھنسا ہے دل آفتاب کا اب
اب دیں رہا نہ اسلام، زناردار! تو ہے

(بحوالہ نادرات شاہی، ص 22)

مذکورہ بالا اشعار سے شاہ عالم ثانی آفتاب کے رنگ و آہنگ اور طرز ادا کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس غزل میں جو کہ غزل مسلسل ہے جس کا کلیدی لفظ دل ہے اور دل کو مختلف طریقے سے تقریباً ہر مصرعہ میں برتنے کی کوشش کی ہے اور جب کسی شاعر کے یہاں دل اور گل یا پھر گل وبلبل کی باتیں ہوں تو قاری کا ذہن عشق و عاشقی کی طرف منتقل ہو ہی جاتا ہے، شاہ عالم ثانی آفتاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں معلوم ہوتے ہیں چونکہ جس کرب کا اظہار وہ مذکورہ غزل میں کررہے ہیں یہ انھیں کا خاصہ معلوم ہوتا ہے اور اس غزل کے پہلے ہی مصرع میں اپنے مقصد کا اظہار کررہے ہیں کہ اے گلعزار میرے دل کا مقصد تو ہی ہے اور تمام گلوں پر فوقیت حاصل ہے تمھاری اس خوبی اور خوبصورتی کو دیکھ کر میرا دل ہی نہیں کرتا کہ باغوں کی طرف جاؤں اور گلوں کا نظارہ کروں ہم جو کچھ بھی دیکھنا چاہتے ہیں وہ سب تمھارے یہاں موجود ہے میرے یار اور دل کے بہار بلکہ سورج مکھی کی طرح تمھارا چہرہ ہے میرا دل بھی اس پھول کے مانند ہے جس پھول کا رنگ تم سے مشابہت رکھتا ہے۔ غزل کے تیسرے مصرع میں شاہ عالم ثانی نے آفتاب کا لفظ استعمال کیا ہے اور ان

کا تخلص بھی آفتاب ہے اسے نہایت ہی چابکدستی کے ساتھ ذومعنی استعمال کیا ہے تخلص کی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے پوری غزل میں خیالات کا تسلسل برقرار ہے جبکہ غزل کا ہر مصرعہ جداگانہ ہوتا ہے لیکن شاہ عالم ثانی کی یہ انفرادیت کہ غزل میں تسلسل برقرار رہتا ہے۔ اور مرکزی خیال سے قاری کو بھٹکنے نہیں دیتا اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو ان کی بیشتر غزلوں کا رنگ ایک ہی طرح کا ہے وہی خیالات کا تسلسل یہ غزل کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہے شاہ عالم ثانی جس وقت یہ شاعری کر رہے تھے وہ اردو کا ایک طرح سے ابتدائی زمانہ ہے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کا اس وقت ہندوستان کی دفتری زبان فارسی ہوا کرتی تھی اس اثنا میں اردو نے اپنی آنکھیں کھولنی شروع کر دیں۔

ڈاکٹر خاور جمیل نے شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری کے اوصاف وخصوصیات کے ساتھ اس میں پائے جانے والے بعض نقائص اور عیوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''انھوں نے شاعری صرف تفنن طبع کے طور پر نہیں کی بلکہ پوری سنجیدگی سے کی ہے۔ انھیں ادب وشعر کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ شاہ عالم نے اپنے دور پر شاعر وادیب بادشاہ کی حیثیت قابل ذکر اثرات چھوڑے ہیں۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''بحیثیت مجموعی شاہ عالم کی غزل اٹھارہویں صدی کی نمائندہ غزل ہے۔ ان کی شاعری آپ بیتی ہے جو کچھ دل پر گزرا ہے اسے بیان کر دیا۔ اس تخلیقی عمل میں شاعری کی آواز میر، سودا، درد کی طرح تو نہیں ابھرتی لیکن لہجے اور زبان کا لوچ، اظہار کی گرمی، جذبہ واحساس کی قوت ایسی اور اتنی ضروری ہے کہ ان کا شعر ہمیں آج بھی متاثر کرتا ہے۔''

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ غلام قادر خاں نے شاہ عالم کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں۔ چنانچہ آنکھ جیسی چیز سے محرومی کے بعد بھی انھوں نے جو شاعری کی اس میں انھوں نے آنکھ کو کئی طرح سے استعمال کیا ہے اور جس لاچاری اور کرب سے انھیں سابقہ پڑا اس کا اظہار انھوں نے کئی غزلوں میں اور مختلف پیرایہ میں کیا ہے۔ مثلاً

لاچار ہوں میں اپنی آنکھوں کے ہات یارو
کرتی ہیں دشمنی نت یہ میرے سات یارو

(بحوالہ صفحہ نمبر 5 نادرات شاہی)

یہاں دو غزلوں کے دو دو اشعار درج کیے جاتے ہیں جن میں شاہ عالم ثانی نے آنکھیں نہ ہونے کے دکھ اور لاچاری کو بیان کیا ہے۔

کرتی ہیں میرے دل پر جو کچھ جفا سو آنکھیں
تقصیر نہیں کسو کی جو ہیں بلا سو آنکھیں
خوباں سے آشنا ہو بیگانہ ہم سے ہو گئیں
دیکھی ہی سب جہاں میں نا آشنا سو آنکھیں

(بحوالہ صفحہ نمبر 12 نادرات شاہی)

دست ستم سے اس بت ظالم کے دل کو اب
ہرگز نہیں نباہ ان آنکھوں نے کیا کیا
اے آفتاب! کر نہیں سکتا ہوں کچھ بیاں
مجھ سے سلوک واہ ان آنکھوں نے کیا کیا

(بحوالہ صفحہ نمبر 22 نادرات شاہی)

شاہ عالم ثانی آفتاب نے نہ صرف غزلیں اور نظمیں کہی ہیں بلکہ مختلف رسوم اور تہواروں کے موقعوں کے لیے کبت، سوہرے، ترانے وغیرہ کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعے کے لیے سیٹھنے بھی کہے ہیں۔ اس طرح تمام مواقع کے کے لیے گانے والوں اور گانے والیوں کو بول دیے ہیں۔

چنانچہ خود قلعہ معلی کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہر قسم کے تہوار منائے جاتے تھے جس میں شاہ عالم دلچسپی لیتے تھے اور گویوں اور مراثیوں کو قلعہ معلی اور دیگر مقامات پر ہونے والی تقریبات میں گانے کے لیے ایسی شاعری اور بول کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس ضرورت کو شاہ عالم نے صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ خود اپنی شاعری کے ذریعے وقت کی اس ضرورت کو پورا کیا۔

شاہ عالم ثانی آفتاب کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری ہر سطح کے لوگوں کے لیے ہے جس میں تنوع ہے ایک ایسا شاعر جس نے عید بقرعید پہ شاعری کی ہے تو ہولی دیوالی نوروز وغیرہ کو بھی اپنے احساسات کے قالب میں ڈھالا ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری میں گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ بادشاہ ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کے لوگوں سے ان کا رابطہ رہا ہے۔ چونکہ بادشاہ کے دربار میں ہر طرح کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور مختلف النوع خیالات کی رعایا سے ان کا ملنا جلنا اور بات کرنا ایک اچھے بادشاہ ہونے کی دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ احساسات کے شاعر تھے تو بیجا نہ ہوگا ان کی شاعری ایک ایسے دور کی غماز ہے جو کسی تحریک سے وابستہ نہیں عمر کے آخری ایام میں آنکھوں کی بینائی کے جانے کے بعد انھوں نے اپنے محض احساسات سے جس طرح کی شاعری کی ہے اسے پڑھنے کے بعد رقت سی محسوس ہونے لگتی ہے زبان نہایت ہی سادہ ہے اور ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لانا شاہ عالم ثانی آفتاب کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے مغلیہ سلطنت کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ جسے وقت اور حالات نے کچھ اس طرح مجبور کر دیا تھا کہ ایسے حالات میں وہ اس کے علاوہ اپنی شاعری میں کہہ بھی کیا سکتے تھے ہر کیف انہی خصوصیات کی وجہ سے ہم ان کی شاعری پر آج کے دور میں بھی نظر ڈالیں تو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی عکاس نظر آتی ہے۔

■

Mahboob Ilahi
F-39, Near Nisar Masjid
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob: 9811148447, Email:elahi1983@gmail.com

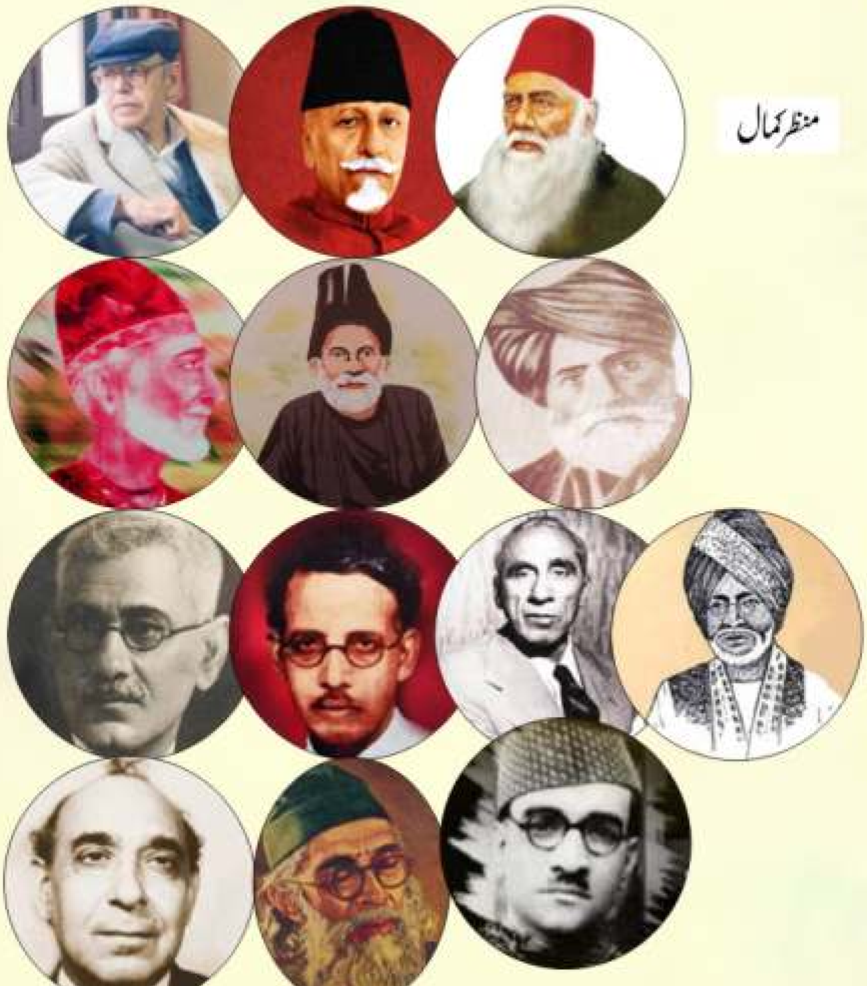

اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز اور روایت

منظر کمال

1857 کے ناکام انقلاب کے بعد اردو میں جدید نثر کا ارتقا ہوا۔ اسی زمانے میں غیر افسانوی نثر کی مختلف اصناف مغرب کے اثر سے اردو ادب میں رائج ہوئیں۔ مضمون، انشائیہ، سوانح، خاکہ، سفرنامہ اور رپورتاژ وغیرہ غیر افسانوی اصناف لکھنے کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوا۔ اگرچہ ان اصناف کے بعض عناصر وغیرہ اردو میں پہلے سے پائے جاتے تھے مگر بحیثیت ایک فن کے برتنے کا آغاز مغربی ادب کے زیرِ اثر ہوا۔ آہستہ آہستہ ان اصناف نے ترقی کی منازل طے کیں اور عوام وخواص میں مقبول ہوئیں۔ ان اصناف میں انشائیہ ایک بہت دلچسپ اور دلکش صنف ہے اور یہ اردو ادب میں ایک انفرادی صنف کی حیثیت سے کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ غیر افسانوی اصناف میں انشائیہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ گرچہ اس کے ابتدائی نقوش بہت واضح نہیں ہیں پھر بھی موجودہ دور میں اس کی اہمیت وافادیت پوری طرح مسلم ہے۔ غیر افسانوی صنف کی حیثیت سے اس کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر صنف ادب کے کچھ مبادیات اور تقاضے ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر اسے دیگر اصناف سے ممیز کیا جاتا ہے۔ مثلاً شاعری میں وزن اور آہنگ، داستان میں کہانی، ناول میں پلاٹ وکردار وغیرہ کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح دیگر اصناف کی جامع ومانع تعریف نہیں ہو سکتی، ٹھیک اسی طرح انشائیہ کی بھی قطعی تعریف دشوار ہے۔ مثلاً انگریزی انشائیہ نگار بیکن نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”انشائیہ ایک ایسی مختصر تحریر کا نام ہے، جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہو“۔ جانسن انشائیہ کو ’ذہن کی ایک ترنگ‘ قرار دیتا ہے۔ اردو کے معروف نقاد اور عہد ساز انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

”انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے، جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔“[1]

اسی طرح اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہماری زندگی کے کسی موضوع پر قلم کار کی گپ ہے، جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ انشائیہ ایک ایسی وسیع صنف ہے، جس میں کسی معمولی سے معمولی چیز پر بھی قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ انشائیہ میں ایک مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پھوٹ کر اپنا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت، اختصار اور تہہ داری ہوتی ہے اور زبان وبیان میں کاٹ وبانکپن موجود ہوتا ہے۔ اس میں غیر رسمی طریق کار اور شخصی ردعمل ہوتا ہے۔ مسرت بہم پہنچانا انشائیے کا بنیادی کام مانا جاتا ہے۔ عدم تکمیل اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مضمون یا مقالے کی بہ نسبت اس کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا ہوتا ہے۔ اس میں دلائل کا کوئی مربوط سلسلہ نہیں ہوتا۔ یہ قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔ انشائیہ کا موضوع اور نقطۂ نظر انوکھا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتا ہے بلکہ قاری کو مخصوص انداز میں سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ناول اور افسانے کی مانند انشائیہ بھی انگریزی ادب کے توسط سے اردو ادب میں داخل ہوا۔ 16 ویں صدی کے ربع آخر میں فرانسیسی ادیب مونٹین کے ہاتھوں اس صنف کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ فرانس سے یہ صنف انگلستان پہنچتی ہے اور وہاں کافی مقبولیت حاصل کرتی ہے۔ انگریزی میں بیکن، ایڈیسن، چارلس اور اسٹیل وغیرہ نمائندہ انشائیہ نگار ہوئے ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ انشائیہ کے اولین نقوش ملا وجہی کی ’سب رس‘ میں ملتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر جاوید وششٹ نے ملا وجہی کو اردو

کا پہلا انشائیہ نگار اور اردو انشائیہ کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''میں ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم قرار دیتا ہوں اور اس کے ان اکسٹھ انشائیوں کو اردو کے پہلے انشائیے۔ یہ نہ فرانسیسی زبان کی تقلید میں تخلیق ہوئے ہیں اور نہ انگریزی ایسے کے مرہون منت ہیں۔ یہ اردو کے پہلے اور اپنے انشائیے ہیں۔ جو عالمی انشائیہ کے معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔''[2]

لیکن جاوید وششٹ کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے اس لیے ان کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس وقت ہندوستان میں صنف انشائیہ سے کوئی واقف بھی نہیں تھا۔ اس لیے کوئی صنف غیر ارادی طور پر وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ملا وجہی فرانسیسی انشائیہ نگار مونتین کے ہم عصر تھے لیکن ایک داستان کو انشائیے کے زمرے میں شمار کرنا ناانصافی بھی ہوگی۔ سب رس میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش یا چند عناصر ہو سکتے ہیں لیکن اسے انشائیوں کا مجموعہ تو نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

وجہی کے بعد غالب کے خطوط میں انشائیہ کے نقوش بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب اردو کے ایک ایسے شاعر اور ادیب ہیں جنھیں نثر و نظم دونوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل ہے۔ غالب کو ان کے خطوط نے اردو نثر میں اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ غالب نے 1850 کے قریب اردو میں خطوط لکھنا شروع کیا۔ اس سے قبل وہ فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ بہت جلد غالب کے خطوط عوام وخواص میں مقبول ہوگئے اور ان کے انداز نگارش کا چہار جانب چرچا ہونے لگا۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے 'اردوئے معلی' اور 'عود ہندی' ان کی زندگی میں ہی شائع ہوگئے تھے۔ بعض ناقدین غالب کے اردو خطوط میں بھی انشائیہ کے نقوش اور عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کیونکہ خطوط غالب میں ایک ایسی فضا ملتی ہے جس میں انشائیہ کا عکس نظر آتا ہے۔

اردو میں باقاعدہ طور پر انشائیہ کی ابتدا کا سہرا سرسید کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن سرسید سے قبل 19ویں صدی کی ابتدا میں دلی کالج کے ریاضی کے ایک نامور استاد ماسٹر رام چندر نے بیکن اور ایڈیسن وغیرہ انگریزی ادبا کے مضامین سے متاثر ہوکر اردو میں مضمون لکھنے کا آغاز کیا۔ انھوں نے زیادہ تر علمی وسائنسی قبیل کے مضامین قلم بند کیے۔ ان مضامین میں قلبی تاثرات و احساسات کی جھلک تو دیکھنے کو ملتی ہے لیکن باقاعدہ انشائیہ نگاری نہیں۔ انھوں نے 'فوائدالناظرین' (1845) اور 'خیرخواہ ہند' (1847) نام کے رسالے بھی شائع کیے۔ جس میں علمی، سائنسی، مذہبی اور اخلاقی وغیرہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

گرچہ سرسید کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار تسلیم کرنے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ان کے انشائیہ نگار ہونے میں بہت کم اختلاف ہے۔ انگریزی مضامین کی طرز پر انھوں نے اردو میں باقاعدہ مضامین لکھے۔ بیشتر ناقدین انھیں انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ عہد سرسید میں انشائیہ کی اصطلاح کسی مخصوص صنف کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی اور یہ اصطلاح بہت بعد میں جا کر رائج ہوئی۔ ایک عرصے تک سرسید کو ہی اردو کا پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا جاتا تھا لیکن وزیر آغا کے ذریعے خود کو پہلا انشائیہ نگار قرار دینے کے بعد یہ اختلاف مزید بڑھ گیا۔ وزیر آغا کی کسوٹی پر سرسید احمد خاں پورے نہیں اترتے اسی لیے وہ سرے سے سرسید کو انشائیہ نگار ہی نہیں تسلیم کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''انشائیے کے بنیادی محاسن کو اجاگر کرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اردو میں انشائیہ کی صنف کے بارے میں تحقیق کی جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ اردو انشائیہ نے اب تک کیا ترقی کی ہے اور مستقبل میں اس کے فروغ وارتقا کے کیا امکانات ہیں۔ لیکن جب اردو انشائیہ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے.... فی الواقع اردو میں تاحال انشائیہ کی صنف بطور ایک تحریک کے معرض وجود میں نہیں آئی۔ کہیں ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے ایک لمحے کے لیے انشائیہ کے تحت شمار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی بعض نقائص کے پیش نظر یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے بعض مضامین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم انھیں انشائیہ کے تحت شمار کرسکتے ہیں لیکن میری دانست میں ایسا کرنا درست نہیں۔ کیونکہ سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے، جو انشائیہ میں نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے انداز بیان میں وہ تخلیقی تازگی نہیں جو انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔ تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کے بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان مضامین کو انشائیہ کے زمرے میں شامل نہیں کرسکتے۔''[3]

وزیر آغا کی ان باتوں پر غور کریں تو اسے درست نہیں کہا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے بہت سے محققین اور ناقدین نے سرسید کو ہی اردو کو پہلا انشائیہ نگار قرار دیا ہے جن میں سید ظہیرالدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر جمیل آذر، پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں معروف ناقد ڈاکٹر عبادت بریلوی سرسید کی اولیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''انشائیہ کی صحیح فضا سرسید کے مضامین سے پیدا ہوتی ہے۔ سرسید نے سب سے پہلے یہ مضامین (جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے) لکھ کر اردو انشائیہ کے فن کا چراغ روشن کیا۔ اس چراغ سے دوسروں نے بھی اپنے فن کے چراغ جلائے۔ اس طرح فن کی روایت کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا سرسید کے ساتھیوں میں محسن الملک، حالی اور وقارالملک نے بھی ایسے مضامین لکھے جن کو انشائیہ کے تحت شمار کیا جاسکتا ہے۔''[4]

اس عہد میں سرسید کے بعد دوسرا بڑا نام ان کے ہم عصر محمد حسین آزاد کا آتا ہے جن کے یہاں انشائیہ کا زبردست شعور ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے تمثیلی انشائیے انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'نیرنگ خیال' کے انشائیے۔ اس مجموعے میں آزاد نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے ''انگریزی انشاپردازوں سے اردو انشاپردازی کا چراغ روشن کیا ہے۔'' ان کے مطالعے سے آزاد کی انشاپردازی، تخلیقی رویے، رنگین خیالات، تہداری اور وسعت علم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مولوی ذکاء اللہ نے اخلاقیات پر انشائیہ نما مضامین لکھے جو اردو انشائیہ کے ارتقا کی اہم کڑی ہیں۔ وہ دلی کے رہنے والے تھے، آزاد اور نذیر احمد کے ساتھیوں میں تھے ریاضی، تاریخ، اخلاق اور ادب پر گہری گرفت رکھتے تھے۔ بہت سے ادبی مضامین بھی لکھے جو تہذیب الاخلاق اور دیگر رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض تخلیقی اور ان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں تو بعض انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں۔ ان میں بیشتر اخلاقی و اصلاحی مضامین ہیں۔ ان کے بعض مضامین انشائیے کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھیں عہد سرسید کے بہترین مضمون نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ 'آگ'، اور 'ذہانت اور تہذیب' وغیرہ ان کے بہترین انشائیے ہیں۔ ان کے انشائیہ 'آگ' کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''آگ ایک عجیب نامبارک اولاد ہے پیدا ہوتے ہی ماں باپ کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں سے پیدا ہوتی ہے انھیں جلا کر خاک کردیتی ہے اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے۔ آگ ہی ہماری دشمن جاں سوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لیے

ہمارے رنج وتکلیف کو دور کرنے کے لیے آسائش وآرام کے واسطے صدہا ضرورت زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولہے پر ماما گری کرتی ہے۔ اپنے کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔ آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے جیسا کہ انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے۔''5

اردو انشائیہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم نام میر ناصر علی دہلوی کا بھی ہے۔ انھوں نے اس زمانے کے مشہور' دلی کالج' میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے جواب میں آگرہ سے ایک رسالہ 'تیرہویں صدی' (1876) جاری کیا۔ یہ رومانوی فکر کا نمائندہ تھا جو بعد میں 'زمانہ' (1880) کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اسی طرح بعد میں 'ناصری' کو شائع کیا جس کے لکھنے والوں میں مرزا حیرت دہلوی بھی شامل تھے۔ ان کا ایک اور مشہور رسالہ 'صلائے عام' (1908) تقریباً بیس سالوں تک شائع ہوتا رہا اور عوام وخواص میں بہت مقبول ہوا۔ اس رسالہ میں بیشتر مضامین ناصر صاحب کے ہوتے تھے۔

میر ناصر اپنے عہد کے مشہور انشا پرداز تھے اور انھوں نے اپنی طویل ادبی زندگی میں بہت کچھ لکھا لیکن ناقدین سے انھیں وہ توجہ نہیں ملی جس کے وہ حقدار تھے۔ ان کے مضامین جذبات کے متوازن بہاؤ اور ندرت افکار کے سنگم پر شوخی اور شگفتگی کا ایسا خوبصورت امتزاج پیش کرتے ہیں جو عام طور پر انشائیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میر ناصر علی نے انشائیہ کی صنف کو اپنی تحریروں میں باقاعدہ طور پر برتا ہے۔ انھوں نے اپنی ان شگفتہ تحریروں کو 'خیالات پریشان' (مقامات ناصری) کا نام دیا ہے۔ ان کی دہلی کی ٹکسالی زبان، فلسفیانہ نکات، شوخی تحریر اور لطافت بات کو نہایت دلچسپ اور دلکش بنا دیتی ہے۔

رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، خلیقی دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سجاد انصاری وغیرہ نے انشائیے تحریر کیے ہیں لیکن اپنی ان تحریروں کو کبھی انشائیہ نہیں کہا ہے۔ سجاد انصاری کے انشائیوں کی روح ان کا دلکش اسلوب ہے۔ ان کی تحریروں میں ان کے دل و دماغ کی دھڑکن اور شخصیت کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو بڑی بے باکی سے پیش کرتے ہیں۔

ناول کے ذریعہ اسلامی تاریخ کی عظمت اور شان و شوکت کو زندہ کرنے کا کارنامہ عبدالحلیم شرر نے انجام دیا۔ سرسید کی پیروی کرتے ہوئے رسالہ 'دلگداز' (1887) جاری کیا۔ شرر نے بکثرت انشائیے لکھے ہیں۔ جو بیشتر دلگداز میں شائع ہوئے ہیں۔ شگفتگی، بے ساختگی اور روانی شرر کی تحریروں کی اہم خصوصیات ہیں۔ وہ تشبیہات اور استعارات کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان شاعرانہ ہے۔ انھیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کے ذریعے عکاسی اور مصوری کرتے ہیں اور مناظر فطرت کے بیان میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کے مضامین اور انشائیے کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے بکثرت لکھا ہے یہی سبب ہے کہ ان کا شمار اردو کے بسیار نویس ادبا میں بھی ہوتا ہے۔ نہیں، نسیم سحر، عمر رفتہ، ہم تم اور وہ اور مغرور جوتا وغیرہ ان کے مشہور انشائیے ہیں۔

اردو انشائیہ کی روایت میں خواجہ حسن نظامی ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے انشائیہ نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی اہم خوبی ان کے معمولی اور انوکھے عنوانات ہیں، جن کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ مثلاً مچھر، الو، دیاسلائی، جھینگر کا جنازہ اور اوس وغیرہ۔ ان کے انشائیوں میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ دلی کی ٹکسالی زبان کو باقی رکھنے میں خواجہ صاحب کا کردار نہایت اہم ہے۔ ان کے ایک انشائیہ 'جھینگر کا جنازہ' کا ایک اقتباس دیکھیں:

''خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں، بوریہ کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کو وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوہ طور ہے''6

اسی طرح مرزا فرحت اللہ بیگ بھی اردو انشائیہ کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیے اپنی شگفتگی، خوش طبعی، بے تکلفی، اور شیرینی زبان کے لیے جانے جاتے ہیں۔ 'پٹنا' ان کا مشہور انشائیہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اردو ادب کی ممتاز اور منفرد شخصیت ہیں۔ 'غبار خاطر' میں ان کی انشا پردازی کے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ 'چڑیا چڑے کی کہانی' اور 'زندگی اور وجود' وغیرہ ان کی انشائیہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

اسی طرح رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی، احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے انشائیوں میں طنز ومزاح کا اسلوب غالب نظر آتا ہے۔ اردو میں انشائیہ نگاری کی یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔ اردو انشائیہ کی تاریخ میں رشید احمد صدیقی کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ ان کا اسلوب طنز ومزاح کی شائستگی وشگفتگی سے بھرپور ہے۔ ان کی علمیت ان کے انشائیوں میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں تفکر کی کارفرمائی، لفظی بازی گری اور فلسفیانہ عمل وغیرہ نظر آتے ہیں۔ انھیں لمبی چوڑی بات کو مختصر انداز میں پیش کرنے کا بخوبی ہنر آتا ہے۔ چارپائی، وکیل، ارہر کا کھیت اور دیہاتی ڈاکٹر وغیرہ ان کے مشہور انشائیے ہیں۔ 'ارہر کا کھیت' کا ایک اقتباس دیکھیں:

''دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت میں پڑی تھی۔''9

پطرس بخاری 'مضامین پطرس' کی بدولت اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ایسی دلکشی اور جاذبیت ہے کہ ہر عہد میں لوگ یاد کرتے ہیں۔ لفظی الٹ پھیر کے بجائے واقعات سے مزاح پیدا کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ وہ خود اپنی ذات کو بھی طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں اور موضوع پر تخصی زاویے سے نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں مزاح کا اسلوب غالب ہے۔ کتے، مرحوم کی یاد میں، سینما کا عشق، بچے، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی وغیرہ مشہور انشائیے ہیں۔ 'کتے' کا ایک اقتباس دیکھیں:

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا کیا فائدہ ہے؟ گائے کو لیجیے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں! کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔''8

اردو میں ترقی پسند تحریک (1936) کے آغاز کے سبب انشائیہ کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اردو میں سرسید تحریک کے بعد دوسری بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اس تحریک نے ادب میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔ ادب کی افادیت پر زور دیا۔ ادب میں حسن کاری پر توجہ کم ہو گئی۔ دراصل اس تحریک کے ادبی مقاصد انشائیہ کے مقاصد کے برعکس تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ذہنی ترنگ کے بجائے مواد اور

موضوع پر زیادہ زور دیا جانے لگا اس لیے صنف انشائیہ کی اہمیت اور مقبولیت کم ہوگئی اور اس کے اسلوب پر طنز و مزاح کا غلبہ زیادہ ہوگیا۔

تقسیم ہند کے بعد اردو انشائیہ ترقی کی راہ پر پھر سے گامزن ہوتا ہے اور اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ خاص اور اہم بات یہ ہے کہ انشائیہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں زیادہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس کی کئی ساری وجہیں ہیں۔ مثلاً اردو کے بیشتر ادبا کی پاکستان ہجرت، پاکستان میں ادبی رسائل و جرائد کی کثرت، ترقی پسند تحریک پر پابندی اور خود انشائیہ کی اپنی اہمیت و افادیت وغیرہ۔ آج بھی پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے زیادہ انشائیے تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ جس کا بنیادی سبب وہاں انشائیہ نگاروں اور ادبی رسائل و جرائد کی کثرت ہے۔ پاکستان میں انشائیہ کی روایت کو آگے بڑھانے اور اسے قبول عام کی سند دلانے میں سب سے اہم کردار وزیر آغا نے ادا کیا ہے۔ خیال پارے، چوری سے یاری تک اور دوسرا کنارہ وغیرہ ان کے انشائیوں کے مشہور و مقبول مجموعے ہیں۔ پاکستانی انشائیہ نگاروں میں نئے اور پرانے کئی سارے نام قابل ذکر ہیں جن کے بغیر اردو انشائیہ کی تاریخ نامکمل رہے گی مثلاً۔ کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، مشکور حسین یاد، ابن انشا، داؤد رہبر، نظیر صدیقی، جمیل آذر، انور سدید، مشتاق قمر، اکبر حمیدی، عطاء الحق قاسمی، عبدالقیوم، ناصر عباس نیر، حیدر قریشی اور محمد یونس بٹ وغیرہ نے اردو انشائیہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں کئی سارے انشائیہ نگار ابھر کر سامنے آئے اور انھوں نے اردو انشائیہ کی روایت کو پروان چڑھایا اور اپنی تخلیقات سے اردو انشائیہ کا دامن مالا مال کیا۔ مثلاً وجاہت علی سندیلوی، نریندر لوتھر، سید حسنین، یوسف ناظم، رام لعل نابھوی، جاوید وشسٹ، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، بھارت چند کھنہ، ضمیر حسن دہلوی، معین اعجاز اور افتخار بیگم صدیقی وغیرہ نے اردو انشائیہ کو بلندیوں پر پہنچانے میں اپنا غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح عصر حاضر کے انشائیہ نگاروں میں نصرت ظہیر، اسد رضا، شفیقہ فرحت، منظور عثمانی، محمد اسد اللہ، انجم عثمانی، محمد اکرام الحق، خالد محمود اور مشہود جمال وغیرہ اہم نام ہیں۔ عہد حاضر میں برصغیر ہندو پاک کے انشائیہ نگاروں میں مجتبیٰ حسین اپنا منفرد اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک بسیار نویس ادیب ہیں اور ان کی ادبی زندگی چار دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ ان کی بے پناہ

> **اردو انشائیہ نے ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں۔ آج بھی ان دونوں ممالک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں بھی انشائیہ کی روایت اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے اور نئے نئے انشائیہ نگار منظر عام پر آ رہے ہیں اور اپنی تخلیقات سے اردو انشائیہ کا دامن مالامال کر رہے ہیں۔امید ہے کہ مستقبل میں بھی اس صنف کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگا۔**

شہرت و مقبولیت کا راز ان کے فن میں پوشیدہ ہے۔ ان کی تحریریں شگفتہ، شائستہ، چلبلی اور دلکش ہوا کرتی ہیں۔ ان کے لطیف مزاح، شائستگی، شرافت، اعتدال پسندی، رمزیت، برجستگی، طنز کی ہلکی آمیزش، زبان کا رچاؤ، تیکھے اور دلکش اسلوب نے انھیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز و منفرد بنایا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں مزاح کا اسلوب غالب ہے۔ ان کے یہاں طنز کا پہلو کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا موضوع نوع انساں ہے۔ وہ اسے انسان کی حیثیت سے دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں ان کا کمال فن عروج پر نظر آتا ہے۔ ان کا مشاہدہ کافی عمیق ہے۔ اسی وصف کے سہارے وہ مختلف واقعات کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعات پر بھی ان کی توجہ رہتی ہے۔ سماج کے مختلف طبقات اور شعبۂ حیات سے متعلق افراد کے طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویوں، عادتوں اور خصائل کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے۔ ان کے ایک انشائیہ 'ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں' کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے:

''ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ! ضروریات زندگی میں کون کون سی اشیا شامل ہوتی ہیں؟ انھوں نے کہا: ''کھانا، کپڑا، مکان، غالب اور دیوان غالب۔'' صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالب کے طرفدار تھے اور اس حد تک طرفدار تھے کہ خود غالب کی ذات کو 'دیوان غالب' سے جدا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالب سے اپنی طرفداری جتانے کے لیے 'کلیات میر' پر بھی دیوان غالب کا ٹائٹل چڑھا رکھا ہے اور محض ٹائٹل کے دھوکے میں میر کے کلام کو بھی غالب کا کلام سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں قطع کلام کرنے کا کوئی موقع عنایت نہیں کرتے کیونکہ ان صاحب کی نظر میں اردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے غالب۔ ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب والا! اردو کے تین بڑے شعرا کے نام بتائیے۔ موصوف نے کہا تھا: ''غالب، مرزا غالب اور مرزا اسد اللہ خاں غالب۔'' اس پر ہم نے فرض کرتے ہوئے کہ آگے ان کی دال نہ گلے گی، پوچھا کہ اب لگے ہاتھوں چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتائیے تو کہنے لگے: ''نجم الدولہ، دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب۔''[9]

غرض کہ اردو انشائیہ نے ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں۔ آج بھی ان دونوں ممالک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں بھی انشائیہ کی روایت اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے اور نئے نئے انشائیہ نگار منظر عام پر آ رہے ہیں اور اپنی تخلیقات سے اردو انشائیہ کا دامن مالا مال کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل میں بھی اس صنف کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

حواشی

(1) وزیر آغا، انشائیہ کے خد و خال، نئی آواز، نئی دہلی، 1991، ص 50

(2) جاوید وشسٹ، ملاوجہی کے انشائیے، بک سروس، دہلی، 1972، ص 79

(3) وزیر آغا، انشائیہ کے خد و خال، نئی آواز، نئی دہلی، 1991، ص 14-15

(4) ماہنامہ ادیب علی گڑھ (انشائیہ نمبر) شمارہ۔5، جلد 5

(5) نصیر احمد خاں (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، اردو اکادمی دہلی، 2003، ص 37

(6) نصیر احمد خاں (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، اردو اکادمی دہلی، 2003، ص 45

(7) صنف انشائیہ اور انشائیے، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2012

(8) نصیر احمد خاں (مرتب) آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، اردو اکادمی دہلی، 2003، ص 200

(9) مجتبیٰ حسین، تکلف برطرف، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد، 1968، ص 54

■

Manzar Kamal
246, Satluj Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob No.: 8707627905

تمباکو

حکیم حبیب الرحمٰن

مسکرات یعنی نشہ ایک ایسی بیماری ہے جو سمندر کی طرح بے شمار شاخیں رکھتی ہیں جن میں بعض بڑی اور بعض خاص ہوتی ہیں۔ مسکرات کا استعمال عموماً آدمی کو مدہوش کردیتا ہے۔ مسکرات کے بحر پایاں کی سب سے بڑی شاخ تمباکو ہے جو کھانے پینے اور سونگھنے کی شکل میں اختیار کی جاتی ہے۔

تمباکو وہ ضرر رساں شے ہے جس کو حضرت انسان جانتے ہوئے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس کی زہر افشانی کم وبیش اس کے ہر حصے میں ہوتی ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق 62 فیصد انسان اس کو کسی نہ کسی شکل میں استعمال کرتا ہے۔

نام: تمباکو کو عربی میں تبغ، فارسی میں تمبول، یونانی میں تکوس، کشمیری میں تمبوس، گجراتی میں تماخو، سنسکرت میں تمراکو، سندھی میں تماس یا تماک، بنگالی میں تماکو، مرہٹی اور اردو میں تمباکو، انگریزی میں Tobacco اور تکنیکی الفاظ میں Lobia-Inflala کہا جاتا ہے۔

اقسام: ہندوستان میں چار قسم کی تمباکو پیدا ہوتی ہے:

1- دیسی
2- یورپی
3- کلکتی
4- گجراتی

تمباکو کا ذائقہ کچھ تلخ اور خراش دار ہوتا ہے اور اس کی بو تیز وتند ہوتی ہے۔ تمباکو انتہائی درجہ گرم وخشک ہے۔

تاریخ: تمباکو اور امریکہ کی دریافت ایک ساتھ ہوئی۔

1542 میں جب کولمبس نئی دنیا میں پہنچا تو اس نے اپنے چند ساتھیوں کو جزیرہ کیوبا کے اندرونی حالات دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان ساتھیوں نے واپس آکر بیان کیا کہ اس جزیرہ پر ایسے آدمی بستے ہیں جن کے پاس ایک خاص جڑی ہے، جس کی بو عجیب وغریب ہوتی ہے۔ وہ لوگ اس کو کھا کر مست ہوجاتے ہیں اور اس کو جلا کر منھ میں لیتے اور منھ سے دھواں نکالتے ہیں۔ اس واقعہ کے تقریباً نصف صدی کے بعد فرانسسکو فرنانڈیز جس کو شاہ ہسپانیہ نے میکسکو کی پیداوار دریافت کرنے بھیجا تھا۔ جزیرہ کیوبا سے اس عجیب جڑی کو ہسپانیہ لایا۔

1615 میں سر تھامس جو انگلستان کے بادشاہ جیمس اوّل کا سفیر تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا تو اپنے ساتھ تمباکو بھی لایا۔ اس طرح ہندوستانی تمباکو سے آشنا ہوئے۔ تمباکو کو تفتیش کے طور پر سب سے پہلے انگلستان میں استعمال کیا گیا۔ شروع شروع میں تمباکو کے استعمال کی شدید مخالفتیں کی گئیں۔ انگلستان کی ملکہ الزبتھ نے تمباکو نوشی کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد جیمس اوّل نے تمباکو نوشی پر جرمانے کی سزا مقرر کی۔ اس کے جانشین شاہ چارلس نے اس حکم کو بحال رکھا۔ حکیم مومن خاں مومن نے تحفۃ المومنین میں لکھا ہے کہ بقراط کے زمانے میں ایک قسم کی بوٹی تھی جس کی چار اقسام تھیں جو شاید تمباکو تھیں اور وبائی زہر کو دور کرنے کے واسطے بوئی جاتی تھیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ وہی شے ہے۔

تمباکو کا استعمال شروع میں محرک اور بعد میں مضعف مسکن ثابت ہوتا ہے۔ آج کل تمباکو تین شکلوں میں عام طور پر استعمال ہوتی ہے:

(1) تمباکو نوشی: جیسے سلفا، چلم، سگریٹ، چانہ، بیڑی، پائپ سگار اور حقہ وغیرہ۔ حقہ کے ذریعے سے تمباکو کا استعمال کم مضر ہے کیونکہ منھ میں آنے سے پہلے دھواں پانی میں سے ہوکر گزرتا ہے اور فاصلہ کی زیادتی کی وجہ سے تمباکو کے دھوئیں کا زہر اپنا پورا اثر نہیں دکھا سکتا۔

(2) جیسے زردہ اور اس کے مرکبات۔

(3) ناک کے ذریعے تمباکو کا استعمال۔

تمباکو کے ان ہی طریقوں کو ایک ظریف شاعر نے خوب قلم بند کیا ہے۔

کوئی پیوے کوئی کھاوے، کوئی لیوے ناش
تمباکو کو جو اچھا کہے اس کا ستیاناس

تمباکو کا سب سے زیادہ استعمال تمباکو نوشی میں ہوتا ہے۔ انگلستان میں سب سے پہلے سر والٹر ریلے نے تمباکو نوشی کی بنیاد ڈالی اور 1565 میں تمباکو کو سگریٹ کی شکل میں استعمال کرنا شروع کیا۔ سر والٹر نے تمباکو نوشی شروع کی تو ایک دن تمباکو پیتے وقت ان کو پیاس محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے ملازم سے شراب طلب کی۔ ملازم جب شراب لے کر آیا تو اس وقت سر والٹر تمباکو کا ایک کش کھینچ کر ناک اور منھ سے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ نوکر نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سخت متحیر ہوا اور خیال کیا کہ مالک کے جسم میں آگ لگ گئی ہے۔ اس مفروضہ آگ کو بجھانے کی غرض سے شراب کی بوتل مالک کے سر پر الٹ دی۔

دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں تمباکو کی عادی تھیں۔ انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن و فلسفی کارلائل و رسل وغیرہ تمباکو سے ایسے مغلوب ہوئے کہ تمام عمر اسے ترک نہ کرسکے۔

تمباکو کو بطور ناس شہنشاہ فرانس دوم نے استعمال کیا۔ 1570 میں نکوٹ نے تمباکو کے سوکھے پتے پیس کر شہنشاہ کے پاس بھجوائے تاکہ اس کے حناد سے شہنشاہ کے سر کے درد کا علاج کیا جائے۔ اتفاقاً ہوا کے ذریعے سے یہ سفوف شہنشاہ کی ناک میں چلا گیا جس سے چھینکیں آئیں اور درد سر جاتا رہا۔ اس واقعہ کے بعد سے شہنشاہ نے تمباکو کو ناس کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں شاہی خاندان کے افراد نے شہنشاہ کی تقلید کی۔ اس کے بعد یہ چیز اتنی عام ہوئی کہ ناس لینا اس زمانہ کے فیشن میں داخل ہوگیا۔ گرجوں اور عبادت گاہوں میں چھینکوں کی وجہ سے وعظ کا سننا تک مشکل ہوجاتا تھا۔ شاہ ہشتم نے ناس لینا ممنوع قرار دیا۔ لیکن بنڈک سیزدہم نے اس امتناع کو اٹھالیا کیونکہ وہ خود ناس کا عادی تھا۔ زردے کی شکل میں تمباکو کا استعمال بالکل حال کی ایجاد ہے۔ دانتوں میں درد میں کمی ہونے کی وجہ سے اس کو پان کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا اور جب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ تمباکو کی وجہ سے پان کی سرخی میں خاصی دلکشی پیدا ہوجاتی ہے تو سنگھار کے شوق میں تلخ زہر کو بھی گوارا کرلیا گیا۔

تمباکو اور اس کے زہر سے پیدا ہونے والے امراض اسباب علامات نیز جدید تحقیقات سے حاصل نتائج کا خاکہ اب بیان کیا جاتا ہے۔

تمباکو کا زہر

تمباکو کے پودے کی ہر ایک جز میں ایک کھاری زہر ہوتا ہے جس کو نکوٹین کہتے ہیں۔ ہر ملک کی تمباکو میں یہ زہر موجود ہوتا ہے۔ نکوٹین کو تمباکو کے پتوں سے تیار کرتے ہیں۔

تمباکو کے رس کو چونے کے پانی سے ملا کر اس کا عطر کھینچا جاتا ہے۔ یہ بے رنگ ایک تیل سا ہوتا ہے۔ صاف کرنے پر اور ہوا میں رکھنے سے بھورا سا ہوجاتا ہے۔ بو نہایت تیز بدبودار یا مانند حقے کی نلی کی بو کے۔ منھ میں رکھنے سے سخت جلن ہوتی ہے۔ پانی میں ڈالنے سے تیلوں کی طرح اوپر تیرتا نہیں بلکہ گھل جاتا ہے۔ کاربائٹ ایسڈ کے ساتھ ملانے سے نکوٹین تیز آب بن جاتا ہے۔ اگر 500 ملی گرام نکوٹین انجکشن کے ذریعہ براہ راست خون میں شامل کردی جائے تو فوری موت واقع ہوجائے گی۔

نکوٹین سے دماغ پر دو طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں:

(1) تھوڑی مقدار میں نکوٹین لینے یا ایک سگریٹ پینے سے دماغ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اس ہیجان کو عام طور پر دیر میں محسوس کیا جاتا ہے۔ ایسے افراد میں ذہنی پستی پیدا ہوجاتی ہے۔ Policyclic Hydric Corbons پالی سائکلک ہائڈروک کاربنس طاقتور کینسر پیدا کرنے والے مادہ ہیں۔ اگر ماں تمباکو کے استعمال کی عادی ہو تو اس کے شیرخوار بچے کے خون میں تمباکو کے زہر (نکوٹین) کے اثرات پائے جائیں گے یعنی تمباکو کا خاص نقصان اس کے زہر نکوٹین میں ہوتا ہے۔

ہر سو اونس سوکھے ہوئے تمباکو کے پتوں میں 2 اونس نکوٹین ہوتا ہے۔ 300 گرام وزن کی مچھلی ایک ملی گرام نکوٹین سے چند منٹ میں مرجاتی ہے۔ مینڈک کو مارنے کے لیے اس کے دو قطرے کافی ہیں۔ کبوتر کی چونچ پر دو قطرے نکوٹین لگا دیں تو وہ مرجائے گا۔ خرگوش کی جلد پر ایک قطرہ ڈالنے سے وہ ہلاک ہوجائے گا اور بلی و کتے کی زبان پر اگر نکوٹین کے دو قطرے ڈالیں تو وہ فوری مرجائیں گے۔ تمباکو پر تحقیق کرنے والے ایک محقق اور ماہر ایف واس نے تمباکو کے دھوئیں کو ایک جگہ جمع کرکے پانی میں حل کیا اور یہ پانی جب خرگوش کو پلایا گیا تو خرگوش کا وزن گھٹنے لگا اور وہ بیمار ہوگیا۔

نکوٹین مہلک ترین اساسی زہروں میں سے ایک ہے۔ صرف 60 ملی گرام نکوٹین ایک جوان آدمی کا عمل تنفس مفلوج کرکے اسے ہلاک کرسکتی ہے۔ سگریٹ کے ایک کش کے دھوئیں میں اوسطاً 60 ملی گرام نکوٹین ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں اب بھی فروخت ہونے والی سگریٹ اوسطاً ایک ملی گرام سے زیادہ نکوٹین رکھتی ہے۔ ضعف و نامردی، بدہضمی، سقوط اشتہا اور رعشہ کا سبب بھی تمباکو ہوسکتا ہے۔

تمباکو نوشی کے اثرات مختلف عمروں میں مختلف شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔

تمباکو میں نکوٹین کے علاوہ 19 قسم کے زہر اور ہوتے ہیں جن میں سے چند قابل ذکر ہیں:

(1) Proskagid (پروسکاجڈ) یہ مہلک زہر ہے۔ اس کی وجہ سے سر درد دوران سر اور غشائی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

(2) ایکسرولین (Exceroline): اس کی بنا پر دماغ مختل ہوجاتا ہے اور بینائی جاتی رہتی ہے۔ یہ زہر عام طور پر گھٹیا قسم کے تمباکو میں پایا جاتا ہے۔

(3) نیوکلاسین Neoclacin: اس عنصر میں روغنی جز پایا جاتا ہے۔ یہ بھی بہت خطرناک قسم کا زہر ہوتا ہے۔ اس زہر کا ایک قطرہ کتے کو ہلاک کرسکتا ہے۔

(4) فرفیورل (Furfuril): یہ الکوحل Alcohol سے کئی گنا زائد زہریلے اثرات رکھتا ہے۔ اس کی مقدار ایک سگریٹ میں 2 تولہ وہسکی کے برابر ہوتی ہے۔ یہ عنصر پٹھوں کو کمزور کرتا ہے۔ دماغی اور اخلاقی کمزوریوں کا باعث بنتا ہے۔

عام مضرات ایک نظر میں

تمباکو نوشی عام جسمانی طاقت کو زائل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کند ذہنی صرع یعنی Epilpcy و بے خوابی یعنی Insomania کمزوری دماغ Weakness of Mind اختلاج القلب اور بدحواسی کا شکار بناتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کے مضر اثرات حواس خمسہ یعنی قوت شامہ، قوت باصرہ اور قوت ذائقہ پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ تمباکو نوشی سرطان زبان (Cancer of Tonge) بھی پیدا کرتی ہے۔ گلے کی متعدد بیماریوں کی بھی جڑ ہے۔

■

Dr. HKM. S Habibur Rehman
Hakeem Ajmal Khan Memorial Academy
97/128, Talaq Mahal
Kanpur (UP)

ورڈ پیڈ
(Wordpad)

جس سوفٹ ویئر یا پروگرام کے ذریعے دستاویزوں کی تشکیل، ایڈیٹنگ اور چھپائی کی جاتی ہے، انھیں ورڈ پروسیسر (Word processor) کہا جاتا ہے۔ ونڈوز میں ایک طاقتور ورڈ پروسیسر موجود ہے، جسے ورڈ پیڈ (Wordpad) کہتے ہیں۔ یہ ورڈ پروسیسر کو ایک ہی دستاویز میں ٹیکسٹ (Text)، تصویر (Graphics) اور آواز (Sound) وغیرہ شامل کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اس باب میں آپ ورڈ پیڈ کا استعمال کرکے دستاویز بنانے، ایڈیٹنگ کرنے اور چھپوانے کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔

ورڈ پیڈ شروع کرنا (Starting Wordpad)

دستاویزوں پر کام شروع کرنے سے پہلے ورڈ پیڈ پروگرام کو شروع کرنا ضروری ہے۔ ایسا کرنے کے کئی طریقے ہیں:

1۔ اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر ورڈ پیڈ کا شارٹ کٹ ہے، تو اسے ڈبل کلک کرکے آپ ورڈ پیڈ شروع کر سکتے ہیں۔

2۔ نئے صارف کے لیے کوئی پروگرام چلانے کا ایک اور آسان طریقہ یہ ہے:

- اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

تصویر w-8.1: Accessories کا ذیلی مینو

- اسٹارٹ مینو میں 'All Programs' پر کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو میں ایک ذیلی مینو کھل جائے گا۔
- اس ذیلی مینو میں 'Accessories' آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے 'Accessories' کا ذیلی مینو کھلے گا۔ اس وقت آپ کی اسکرین تصویر W-8.1 کی طرح نظر آئے گی۔
- اس ذیلی مینو میں 'WordPad' آپشن پر ماؤس پوائنٹر لے جاکر کلک کیجیے۔

ورڈ پیڈ پروگرام شروع ہوتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر W-8.2 کی طرح اس کی ونڈو نظر آنے لگے گی، جس میں آپ کوئی بھی نیا ڈاکیومنٹ بنا سکتے ہیں یا پرانی ڈاکیومنٹ فائل کو کھول کر اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔ ورڈ پیڈ کی ونڈو کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند اہم حصوں کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

ٹائٹل بار (Title Bar): اس میں اس پروگرام کا نام دکھایا جاتا ہے۔ اگر کوئی ڈاکیومنٹ کھلا ہوا ہے، تو اس کا نام بھی اس بار میں 'بائیں کونے' میں دکھایا جاتا ہے، ورنہ Document لفظ دکھائی دیتا ہے۔

ورڈ پیڈ بٹن (WordPad Button): ورڈ پیڈ کے لیے نئے ورژن میں پرانے ورژن کے مقابلے فائل مینو (File Menu) کی جگہ پر ورڈ پیڈ بٹن دیا گیا ہے۔ اس پر کلک کرنے پر ایک مینو کھلتا ہے، جو دو افقی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مینو کے بائیں حصہ میں بنیادی ہدایت (Command)، جیسے New، Open، Save، Save As، Print، Page Setup، Send، About WordPad، Exit وغیرہ دیے گئے ہیں۔ دائیں حصے میں ان دستاویزوں کی لسٹ دی جاتی ہے، جن پر آپ نے ہی حال میں کام کیا ہے۔ انھیں Recent Documents کہا جاتا ہے۔ (تصویر W-8.3)

ربن (Ribbon): ورڈ پیڈ کے پرانے ورژن میں مینو بار اور ٹول بار ہوتا تھا۔ ونڈوز 7 میں ان کی جگہ پر اب ربن دکھائی دیتا ہے، جس کا بنیادی کام کسی بھی ہدایت کو آسانی سے اور کم ماؤس کلک کے ذریعے ایکٹو کرنا ہے۔ ربن کو کل دو ٹیب میں بانٹا گیا ہے، جس میں ہر ایک ٹیب کاموں کے ایک خاص مجموعے کو ظاہر کرتا ہے۔ سبھی اہم کمانڈ ایک ہی ٹیب کے تحت مل جانے کے سبب، ورڈ پیڈ کے پرانے ورژن کی طرح مینو اور سب مینو کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ربن کے بنیادی حصے (ٹیب) درج ذیل ہیں:

- ہوم ٹیب **(Home Tab)**: ہوم ٹیب میں کاموں کے پانچ اہم مجموعے ہیں: Clipboard، Font، Paragraph، Insert اور Editing۔ ان کے تحت دی گئی

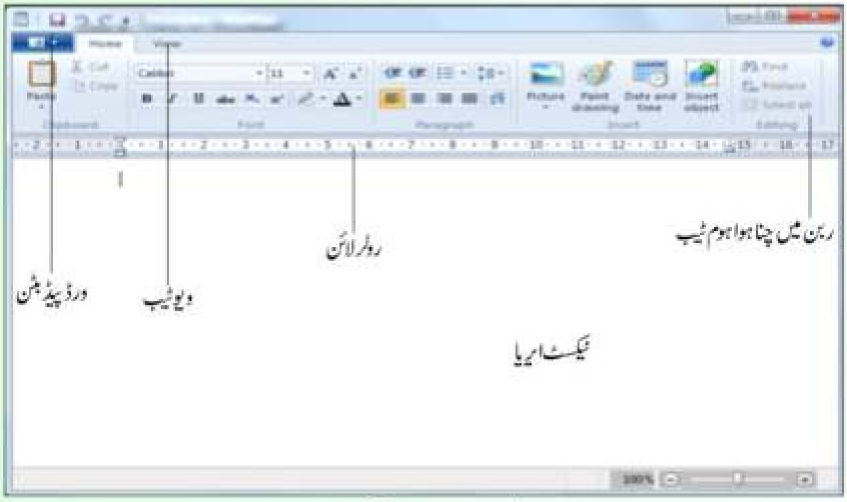

تصویر w-8.2: ورڈ پیڈ کی ونڈو

ہدایتوں کی مدد سے آپ ٹیکسٹ اپنی خواہش کے مطابق ایڈٹ اور فارمیٹ کر سکتے ہیں۔

- **ویو ٹیب (View Tab)**: اس ٹیب میں وہ سبھی کمانڈ ہیں، جن کے ذریعے آپ اپنی ونڈو یا دستاویز کی شکل بدل سکتے ہیں۔ اس کے بنیادی حصے ہیں: Zoom، Show/Hide اور Settings۔

رولر لائن (Ruler Line): ربن کے ٹھیک نیچے ایک رولر لائن ہوتی ہے۔ اس سے آپ مختلف حاشیے (Margin) دیکھ اور سدھار سکتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

ٹیکسٹ ایریا (Text Area): اسکرین (ونڈو) کا زیادہ تر حصہ ایک مستطیل باکس کی شکل میں رولر لائن کے نیچے ہوتا ہے، اسے ٹیکسٹ ایریا کہتے ہیں جو بھی مواد دستاویز میں ٹائپ کیا جاتا ہے یا بھرا جاتا ہے، وہ اسی علاقے میں دکھائی دیتا ہے۔

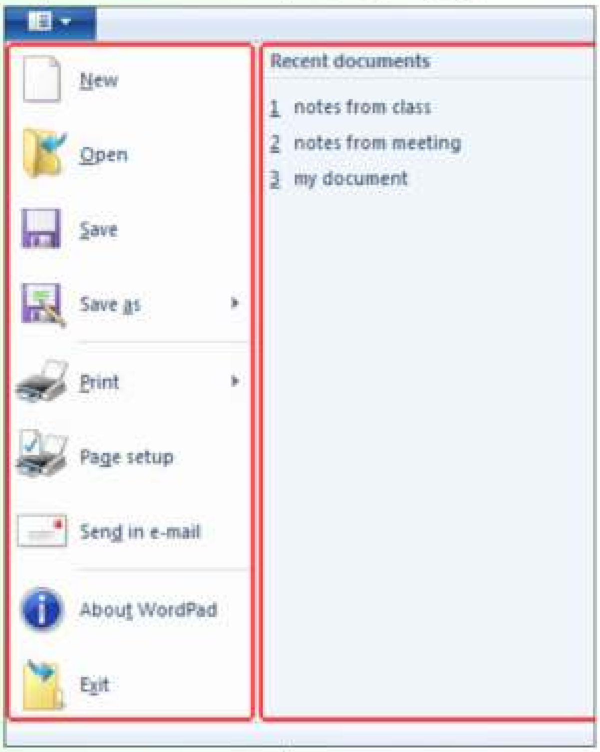

تصویر w-8.3: ورڈ پیڈ بٹن کا پل ڈاؤن مینو

کرسر (Cursor): ٹیکسٹ ایریا میں ایک کھڑی لکیر (|) کی شکل کا کرسر ہوتا ہے، جس سے کی بورڈ پر ٹائپ کیے جانے والے حروف یا نشانات کی حالت کا اشارہ ملتا ہے۔ آپ تیر کے نشان والے بٹنوں کا استعمال کر کے اس کو فائل کی حد میں مطلوبہ جگہ پر لے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ماؤس پوائنٹر کو فائل میں کہیں بھی کلک کر کے آپ کرسر کو ایک بار میں ہی وہاں لے جا سکتے ہیں۔

نئی دستاویز بنانا (Creating a New Document)

اگر آپ ورڈ پیڈ میں بالکل نئی دستاویز بنانا چاہتے ہیں، تو پہلے اوپر بتائے گئے طریقے سے ورڈ پیڈ کو لوڈ کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر W-8.2 کی طرح ورڈ پیڈ کی ونڈو حاصل ہوگی۔ اگر آپ ورڈ پیڈ پر پہلے سے ہی کوئی دستاویز بنا رہے ہیں اور اب ایک نئی دستاویز بنانا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے ونڈو کو خالی کرنا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے پہلے پرانی دستاویز کو اسٹور کر دیجیے۔ (اس کا طریقہ آپ کو آگے بتایا جائے گا)، پھر درج ذیل کام کیجیے:

1۔ ورڈ پیڈ بٹن پر کلک کیجیے۔

2۔ پل ڈاؤن مینو میں 'New' آپشن چنیے۔

اب آپ اس دستاویز میں اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی مواد ٹائپ کر سکتے ہیں۔ دستاویز میں آپ جو بھی بھرنا چاہتے ہیں، اسے ٹائپ کیجیے۔ آپ کو پیراگراف ختم ہونے سے پہلے 'Enter' کنجی دبانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ایک لائن پوری بھر جانے پر کرسر اپنے آپ اگلی لائن پر آ جاتا ہے۔ آپ دائیں حاشیے (Right margin) سے آگے مواد ٹائپ نہیں کر سکتے۔ ٹیکسٹ کو خود ہی نئی لائن پر بھرتے جانے کے اس عمل کو ورڈ ریپنگ (Word Wrapping) کہا جاتا ہے۔ آپ کو انٹر کنجی تبھی دبانی چاہیے، جب جاری پیراگراف ختم ہو گیا ہو اور آپ نیا پیراگراف شروع کرنا چاہتے ہوں۔ انٹر کنجی تب بھی دبائی جاتی ہے، جب آپ کسی لائن کو خالی چھوڑنا چاہتے ہیں۔

World's Worst Drivers

The record for the world's worst drivers is a loss-up between two candidates: First, a 75-years -old man who received 10 traffic tickets, drove on the wrong side of the road four times, committed four hit-and-run offences, and caused six accidents, all within 20 minutes on October 15, 1966. Second, a 62-Year-old woman who failed her driving test 40 times before passing it in August, 1970. Unfortunately, by that time, she had spent over $700 in lessons, and could no longer afford to buy a car.

مشق کے لیے اوپر دیے ہوئے ٹیکسٹ کو ٹائپ کیجیے۔ اس کو پورا ٹائپ کرنے کے بعد آگے بتائے گئے طریقے سے محفوظ کر لیجیے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

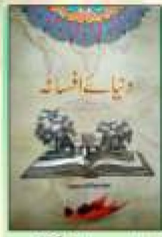

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: یوسف رامپوری محلّہ: ٹنڈولہ، ٹانڈہ، رامپور 244925 (یوپی)

محمد عبدالقادر سروری کی تصنیف 'دنیائے افسانہ' اردو افسانوی ادب پر اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اختصار اور خوش اسلوبی کے ساتھ اردو کے افسانوی ادب کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے بات کو صرف صنفِ 'افسانہ' تک محدود نہیں رکھا بلکہ قصے اور ناول سے بھی بحث کی ہے۔ کتاب میں سب سے پہلے افسانہ کے حوالے سے اس طور پر بحث کی گئی ہے کہ آیا اس کی اہمیت اور غرض و غایت کیا ہے۔ اس کے بعد افسانے کے مقام، خصوصیات اور محاسن کو بھی زیرِ تذکرہ لایا گیا ہے۔ اس پہلو پر صاحب کتاب کی بھرپور توجہ کی وجہ واضح ہے کہ جب تک قاری کسی بھی علم، صنف اور فن کی اہمیت و مرتبت اور خصوصیات و امتیازات سے واقف نہیں ہوتا، اس وقت تک اس علم و فن کے ساتھ اس کا رشتہ کماحقہ استوار نہیں ہو پاتا۔ جیسا کہ مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''اردو افسانہ نگاری کے حامیوں کو ابھی تک اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا کہ جس فن کو وہ اپنا مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہیں، اس کی اہمیت، خصوصیات اور اس کے اصولوں سے اردو دانوں کو واقف کریں تاکہ عوام کی ایک بڑی تعداد جو افسانوں کو نہایت شوق کے ساتھ پڑھتی ہے معلوم کرے کہ دیگر فنون کے مقابلے میں اس فن کا رتبہ کیا ہے اور اس فن کے محاسن کیا ہیں؟ اور آئندہ نسلیں جو اردو افسانہ نگاری کے میدان کو اپنی جولاں گاہ بنانا چاہیں، انھیں بھی اپنی زبان کے افسانوں کی روایات سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو جائے۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد عبدالقادر سروری نے یہ کتاب قارئین اور طلبائے ادب کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ یعنی وہ یہ چاہتے ہیں کہ اردو ادب کے طالب علم افسانے کے فن سے واقف ہوں، اس لیے کہ بلاشبہ افسانہ ادب کی اہم صنف ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ان قارئین کو بھی فن افسانہ سے واقف کرانا چاہتے ہیں جو ناول اور افسانے پڑھنے کے شوقین ہیں تاکہ وہ ناول اور افسانوں کو مزید اشتیاق کے ساتھ پڑھیں اور بھرپور محظوظ ہوں۔

افسانے پر بات کرتے ہوئے مصنف نے افسانے کی اقسام کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور افسانے کے آغاز و ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ 'افسانہ' کیسے پیدا ہوا، اس کے پیچھے کیا عناصر کارفرما تھے، قدیم زمانے میں افسانوں کی نوعیت اور خصوصیت کیا تھی؟ لوگ کیسے اور کیوں قصے سنتے اور سناتے؟ ان پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے ساتھ یونانی، رومی، مذہبی، مشرقی قصوں پر بھی مصنف نے بات کی ہے اور پھر قرونِ وسطیٰ سے ہوتے ہوئے اٹھارویں صدی تک قصے کہانیوں نے کیا صورت حال اختیار کرلی، اس کو بھی کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان قصوں اور داستانوں سے ناول نگاری کے آغاز اور اس پر یورپی و فرانسیسی انقلابات کے اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں ناول کی پیدائش، ناول کے موضوع، ناول کے عناصر، ناول کے منازل، ناول کی خصوصیات، ناول نگار کے فرائض جیسے عنوانات قائم کرکے باقاعدہ ان سے متعلقہ مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ناول کی پیدائش کے تحت لفظ ناول کے اشتقاق و مآخذ سے بحث کی ہے اور اس بابت مختلف نظریات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ناول کے موضوع کے ذیل میں مصنف نے جو بحث کی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ناول کے کیا موضوعات ہونے چاہئیں۔ ناول کے عناصر پر بات کرتے ہوئے ناول کے اجزائے ترکیبی پر اس طور پر گفتگو کی گئی ہے کہ ناول پڑھنے اور لکھنے والے اس سے استفادہ کرسکیں۔ 'اعلیٰ ناول کی خصوصیات' کے تحت یہ بات بآسانی معلوم کی جاسکتی ہے کہ ناول کو کون سی چیزیں عمدہ اور معیاری بناتی ہیں اور کن خصوصیات کی بنیاد پر ناول عوام و خواص کے درمیان مقبولیت حاصل کرسکتا ہے۔ اس بحث سے ناول کے معیار کو جانچنے پرکھنے کے ضوابط کا علم ہوتا ہے۔ گویا یہ پوری بحث نہایت معلوماتی اور مفید ہے۔ 1857 کے بعد اردو ناول نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے کئی بڑے ناول نگاروں جیسے نذیر احمد، سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، حکیم محمد علی خان، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ظفر عمر وغیرہ کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی حیثیت اردو ناول کے فن، تاریخ اور ناول نگاری پر تنقیدی جائزے کی بھی ہوگئی ہے۔

افسانوی ادب کا عمومی احاطہ کرنے کے بعد مصنف نے اردو زبان کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ذیل میں ابتدائی دور کے افسانوں کی نوعیت اور خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو افسانے کو آگے بڑھانے میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان کا بھرپور اعتراف اس کتاب میں موجود ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت جو اردو میں افسانوی ادب تخلیق کیا گیا، اس کو تفصیل اور ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے 'اردو مختصر افسانے' کا عنوان قائم کر کے اردو کے مختصر افسانوں کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔ آخر میں 'اردو افسانوں کا مستقبل' کے ذیل میں مصنف نے اردو افسانہ لکھنے والوں کو مفید اور قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

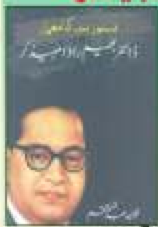

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

صفحات: 156، قیمت: 70 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: نوشاد عالم، اکیڈمی آف پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس نام چومسکی کمپلیکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کتاب 'دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر' خواجہ عبدالمنتقم کی تصنیف ہے جو 13 ابواب اور 2 ضمیموں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مصنف خواجہ عبدالمنتقم وزارت قانون، وزارت اقلیتی امور، ایمٹی یونیورسٹی اور اور یونین پبلک سروس کمیشن سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں۔ قانون سے متعلق ان کی انگریزی، اردو اور ہندی زبانوں میں دو درجن سے اوپر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'حرف آغاز' کے تحت مصنف نے اس تصنیف کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عام لوگوں کے سامنے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر سے متعلق کچھ اہم واقعات کو اس طرح معروضی انداز میں پیش کرنا ہے جس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اور ان کی شخصیت کے روشن پہلو بھی اجاگر ہو جائیں۔

بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر صرف ممتاز قانون داں اور سرکردہ واضع قانون ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک ممتاز سیاسی مفکر، فلسفی، انسانی حقوق کے سچے اور مخلص علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم انسان بھی تھے۔ علاوہ ازیں تعلیم کے میدان میں بھی انھیں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ انھوں نے ایک مخصوص نظریۂ تعلیم کی تشہیر و تبلیغ کی ہے جس سے مختلف مذاہب اور مختلف طبقات کے لوگ مستفیض ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس سماجی جمہوریت کی ہمیشہ وکالت کی جس میں تمام لوگوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہو، انہیں حق مساوات عطا کیا گیا ہو اور ایک باوقار زندگی گزارنے کا موقع ملے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مدھیہ پردیش کی اچھوت سمجھی جانے والی مہار ذات کے ایک معمولی خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے ذات اور برادری کی متعصبانہ تقسیم کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ سماجی و سیاسی سطح پر بے جا امتیازی رویے کی وجہ سے ہی ان کی فکر میں مساوات اور انصاف کی چاہت کا شدید احساس ملتا ہے۔

کتاب کا آغاز بابا صاحب کے درجن سے اوپر ترغیبی پیغامات سے ہوتا ہے جن میں سے کچھ اہم پیغامات یہ ہیں مثلاً میں ایسے مذہب کو پسند کرتا ہوں جو آزادی، مساوات اور اخوت کا سبق دیتا ہو، ذہنی ارتقاہی وجود انسانی کا آخری ہدف ہونا چاہیے، کسی کمیونٹی نے کتنی ترقی کی ہے میں اس کا اندازہ اس بات سے لگاتا ہوں کہ اس میں خواتین نے کتنی ترقی کی ہے، محض طویل زندگی سے بامعنی مختصر زندگی کہیں بہتر ہے اور آخر میں یہ اہم پیغام کہ سماجی آزادی کے بغیر قانون کے ذریعہ عطا کی گئی آزادی بے معنی ہے۔ محض ان چند منتخب پیغامات ہی سے ان کے نکتہ رس ذہن، فکری بالیدگی، پختہ شعور اور ہندوستانی سماجی زندگی کی مزاج شناسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے فکر و عمل سے ہمیشہ اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ سماجی ظلم، سیاسی ظلم سے کہیں زیادہ مہلک ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے پس ماندہ لوگوں کی ترقی و بہبود کے لیے صرف قانونی تحفظ کافی نہیں۔ قانونی تحفظ اور مراعات سے کماحقہ استفادے کے لیے ہندوستان کی سماجی زندگی کے بطن سے اخوت و مساوات اور انصاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے تبھی آئین میں عطا کردہ حقوق و مراعات کی افادیت و معنویت قائم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس سماجی جمہوریت کے قیام و استحکام کے لیے وقف کردی جس کے ستون مساوات اور سماجی انصاف پر قائم ہوں۔

کتاب کے پہلے دو ابواب میں بابا صاحب کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کے ساتھ ان کی شخصیت اور واضع قانون کی حیثیت سے ان کے مرتبہ کا ذکر مختصراً لیکن تحقیقی انداز میں کیا گیا ہے۔ دیگر ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کیے گئے ہیں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر سماجی جمہوریت اور انسانی حقوق کے زبردست حامی، ڈاکٹر امبیڈکر اور درج فہرست ذاتوں و درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد کو آئینی و قانونی تحفظ، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر حقوق خواتین کے حقیقی علم بردار، درج فہرست ذاتوں و قبائل اور دیگر طبقات کے آئینی و قانون و انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق ادارے، ڈاکٹر امبیڈکر اور اقلیتوں کا قانونی تحفظ، ہمارا آئین عدلیہ کی آزادی اور اعتماد عامہ کا ضامن، درج فہرست ذاتوں و درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ زیادتیاں مستوجب سزا میلا ڈھونے والے افراد کے حقوق کا تحفظ اور ان کی باز آباد کاری سے متعلق قانون، ڈاکٹر امبیڈکر کے ہندی اور دیگر زبانوں کے بارے میں خیالات، ڈاکٹر امبیڈکر کا نظریۂ تعلیم، ذات پات پر مبنی امتیاز بنام نسلی امتیاز۔ اور آخر میں چارٹ کی شکل میں ڈاکٹر امبیڈکر سے متعلق کچھ اہم واقعات و سوانحی خاکہ دیا گیا ہے۔

غرض بابا صاحب کی حیات و خدمات پر یہ مختصر لیکن پُر مغز کتاب پڑھ کر ایک قاری ان کی باعظمت شخصیت کے ان گنت پہلوؤں اور گوشوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ کتاب میں 2 ضمیموں کی شمولیت اور آخر میں چارٹ کی شکل میں بابا صاحب کے سوانحی نقوش مرتب کرنے کی کوشش کتاب کی وقعت میں اضافے کا محرک بنی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

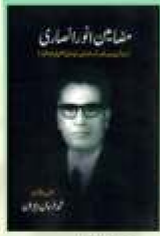

مضامین انور انصاری

ترتیب وتقدیم: محمد فرحان دیوان
صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: پروفیسر قدوس جاوید، سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی

آج کی ہر نئی تنقیدی تحریر گواہی دیتی ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی تخلیقی ادب نہ صرف لکھا جارہا ہے بلکہ پڑھا بھی جارہا ہے لیکن اردو شعر وادب کے تقریباً پانچ سو سالہ سفر کی تاریخ میں ایسے کئی پڑاؤ ہیں جہاں تخلیقی اور تنقیدی نگارشات کے قیمتی لعل و گہر رہروانِ ادب کے ہاتھوں سے پھسل گئے ہیں اور ان پر گمنامی کی گرد جم چکی ہے۔ لیکن زندہ اور متحرک زبان میں، جیسی کہ اردو ہے، تلاش وجستجو کے ذوق وشوق سے بہرہ ور ایسے دیوانے بھی ہوتے ہیں جو اپنی فرزانگی کو بروئے کار لاکر نادر ونایاب تخلیقی یا تنقیدی کارناموں کو ڈھونڈ کر، ان پر جمی گمنامی کی گرد جھاڑ کران کے عدم کو وجود اور غیاب کو حضور بنا کر ادب کے سرمائے میں اضافہ کرتے ہیں۔ پروفیسر انور انصاری کے مضامین ایسے ہی گم گشتہ تنقیدی جواہر پارے تھے جنھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نوجوان محقق 'محمد فرحان دیوان' نے انتہائی دشواریوں کے ساتھ نہ صرف ان کی بازیافت کی بلکہ کرم خوردہ مضامین کو دیدہ ریزی کے ساتھ پڑھا، اصل کتب، حوالوں اور اقتباسات تک رسائی حاصل کی اور پھر انھیں ترتیب دے کر ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کروادیا۔

فرحان دیوان نئی نسل کے چندہ وارادانِ ادب میں سے ایک ہیں جنھیں معتبر ومستند نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی سے استفادہ کا شرف حاصل رہا ہے۔ قاسمی صاحب نے اپنے شاگرد فرحان دیوان کی مرتب کردہ کتاب 'مضامین انور انصاری' کی 'تقریظ' میں مصنف اور مرتب کے تعارف کے طور پر لکھا ہے:

''پروفیسر انور انصاری بنیادی طور پر ماہر نفسیات اور نفسیات کے استاد تھے... یہ کتاب انور انصاری کے مضامین کا مجموعہ ہے، انھوں نے اپنے ادبی مذاق اور مطالعہ کے اظہار کا ایک عمدہ طریقہ ان مضامین کی شکل میں نکالا تھا.... میرے عزیز شاگرد محمد فرحان دیوان کو جب ان کے مضامین کے مطالعہ کا موقع ملا تو انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ان کے ....مضامین دستیاب ہوجائیں تو انھیں یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کردیا جائے... مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ پہلی ادبی کاوش جس میں مقدمہ کے طور پر ان کا تجزیہ بھی شامل ہے، انھیں اعتبار بخشے گا۔''

(تقریظ، مضامین انور انصاری، مرتب محمد فرحان دیوان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص 5،6)

اس کتاب میں شامل انور انصاری (ولادت: 10 جولائی 1922، وفات: 30 جولائی 1978) کے سات مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں:

1۔ اردو میں تنقید کی ابتدا
2۔ جدید تنقید کا پس منظر (تذکروں کی روشنی میں)
3۔ جدید تنقید کی ابتدا (حالی، شبلی اور ان کے متبعین)
4۔ مغرب زدہ تنقید (بجنوری اور ان کے متبعین)
5۔ جمالیاتی تنقید (تنقید کا تصوری یا خالص فنی نقطہ نظر)
6۔ ترقی پسند تنقید (تنقید کا مارکسی یا تاریخی نقطہ نظر)
7۔ تخلیقی عمل کا نفسیاتی تجزیہ

کہنے کی ضرورت نہیں کہ عنوانات نئے نہیں ہیں۔ اردو میں ان یا ان سے ملتے جلتے موضوعات پر اچھا، بُرا بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ انور انصاری کے مضامین میں ایسا بہت کچھ ضرور ہے جسے اردو تنقید میں اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ابوالکلام قاسمی جیسا محتاط نقاد انور انصاری کے ذوق ادب کو قابل تحسین اور معلومات کو قابل رشک نہ قرار دیتا۔

اس کتاب میں شامل انور انصاری کے مضامین میں سے کون سا مضمون کب شائع ہوا اس کی نشاندہی کتاب میں نہیں کی گئی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ مضامین 1978 سے قبل ہی وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن ان کے ایک مضمون 'مغرب زدہ تنقید' سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب انور انصاری ایسے مضامین لکھ رہے تھے، اردو تنقید میں عبدالرحمٰن بجنوری (محاسن کلام غالب) اور کلیم الدین احمد (اردو تنقید پر ایک نظر) کی جملہ بازیوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ انور انصاری ان دونوں ناقدین کے مشہور زمانہ فتووں کو 'تنقیدی رائے' ماننے سے ہی انکار کرتے ہیں اور اسی لیے انور انصاری اپنے مضامین میں جگہ جگہ شاعری اور تنقید کے منصب پر جستہ جستہ اپنے تصورات اور تعصبات کا اظہار کرتے ہیں۔

انور انصاری نے اپنے مضامین میں سادہ اور شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے اس لیے قاری کو ان کے مافی الضمیر تک رسائی میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ محمد فرحان دیوان نے انور انصاری کے مضامین شائع کرکے اپنے ادبی ذوق کا بین ثبوت تو دیا ہی ہے ساتھ ہی نئی نسل کی ادبی ذمے داری بھی نبھائی جس کے لیے وہ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تفہیم و تعبیر

مصنف/ ناشر: پروفیسر خالد محمود
صفحات: 432، قیمت: 238 روپے، سنہ اشاعت: 2017
مبصر: ڈاکٹر خالد مبشر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب 'تفہیم وتعبیر' معروف ومعتبر نقاد، محقق، شاعر اور طنز ومزاح نگار پروفیسر خالد محمود کی پچیسویں تصنیف ہے۔ ان کی قبل ازیں مطبوعات کا تعلق مختلف اصناف شعر وادب تنقید، تحقیق، ترتیب وتدوین، صحافت، سوانح، طنز ومزاح، خاکہ، انشائیہ، ترجمہ، شاعری، درسیات اور تبصرہ وتجزیے سے تھا۔ اس سے پروفیسر خالد محمود کے وسیع تر ذہنی اور ذوقی کینوس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

432 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 'تفہیم وتعبیر' بھی تنوع سے عبارت ہے۔ اس میں 28 تنقیدی وتحقیقی مقالے، پانچ انٹرویو اور 23 تبصراتی اور تعارفی تحریریں شامل ہیں۔

اولین 5 مقالے علامہ شبلی کے حوالے سے ہیں۔ یہ امتیاز تو نہیں لیکن ما بہ الامتیاز پہلو ان مقالوں کے موضوعات اور مشتملات ہیں۔ پہلا ہی مقالہ 'دارالمصنفین، معارف اور غالب' قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس میں صاحب مضمون کی تحقیقی ژرف بینی، تنقیدی شعور اور ارتکاز فکر بھی کچھ سمٹ آیا ہے۔ یوں بھی یہ مضمون بیک وقت دارالمصنفین کی علمی تاریخ، رسالہ معارف کے سو سالہ سفر اور غالب کو ایک نئی جہت سے دیکھنے کے لیے دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا مقالہ 'شبلی اور ان کی نظریہ شاعری' غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک ''اگر انھوں (شبلی) نے سنجیدگی سے اس طرف رخ کیا ہوتا تو اس میدان میں بھی وہ اپنے ہم عصروں سے آگے ہوتے۔''

صاحب مضمون کے خیال میں شبلی نے عارضی اور وقتی سیاسی موضوعات کو اپنی فنی قوت اور شاعرانہ طبیعت سے دوام عطا کر دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے اس مضمون میں اقبال کی شاعری بالخصوص شکوہ پر شبلی کی نظم 'تماشائے عبرت' کے اثرات کی حیرت انگیز طور پر جستجو کی ہے۔ مضمون 'شبلی کی اردو غزل اور غالب' اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور مختلف تحریر ہے۔ اس میں غالب کی زمینوں اور ان کے مضامین سے ماخوذ یا مستفاد شبلی کے اشعار کا نہایت دقتِ نظر سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں خالد محمود نے شبلی کی غزلوں پر فکرِ غالب کے اثرات تلاش کیے ہیں۔ لیکن توازن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کہیں بھی شبلی کو غالب سے بڑا تو کیا ہم پلہ بھی قرار دینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مقالہ 'مکاتیب شبلی کی گل افشانیاں' کا عنوان ہی بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ مقالہ نگار نے بے حد نکتہ رسی کے ساتھ شبلی کی شگفتہ طبعی اور طنز و ظرافت آمیز مزاج کی عکاسی کے لیے ان کے خطوط سے جا بہ جا تراشے پیش کرتے ہوئے شبلی کی شخصیت کے ایک الگ گوشے کو روشن کیا ہے۔

شبلی کے حوالے سے تحریر کردہ پانچ مضامین محض اتفاق یا سیمناری ضرورتوں کا پروردہ نہیں، بلکہ اس کے پیچھے پروفیسر خالد محمود کی اپنی شخصیت اور ان کی علمی نسبت بھی طے کی جاسکتی ہے۔ ان کے استاد پروفیسر عبدالقوی دسنوی، سید سلیمان ندوی کے ہم وطن بھی تھے اور ان کے شاگرد معنوی بھی۔ شبلی سے سید سلیمان ندوی کا تعلق اظہر من الشمس ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر خالد محمود کا شجرۂ علمی علامہ شبلی سے جاملتا ہے۔ ان کے مزاج میں بھی شبلی کے جمالیاتی ذوق کی جھلک، کلاسیکی رچاؤ اور اپنی تاریخ و تہذیب سے وابستگی محسوس کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا پروفیسر خالد محمود کو دبستانِ شبلی کے سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

شامل کتاب مضامین کے مطالعے سے ایک تاثر پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ پروفیسر خالد محمود کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل کافی اور اطمینان بخش مواد جمع کرتے ہیں، اس کو اپنے تخلیقی و تنقیدی وجود میں جذب کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد نہایت دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ قلم کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک معلمانہ شان نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر تحریر کے پیچھے شعوری طور پر طلبہ ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کا نام 'تفہیم و تعبیر' بھی ان کے اسی رویے کی غمازی کرتا ہے۔

اس کتاب میں شامل ایک مضمون 'غزل اور تدریس غزل' بطور خاص ان کی طبیعت کا نچوڑ ہے۔ اس مضمون میں ان کے اندر کا معلم پوری قوت کے ساتھ جاگ اٹھا ہے۔ اس میں غزل کی خارجی اور داخلی خصوصیات نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل انٹرویوز بے حد معنی خیز ہیں۔ ان میں ان کی شخصیت، مزاج، علمی وادبی ذوق اور مختلف ادبی مسائل کے حوالے سے ان کے افکار و نظریات مجتمع ہوگئے ہیں۔

کتاب کے آخر میں شامل ان کے تبصروں اور تعارفی تحریروں سے نہ صرف ان کے شوق مطالعہ کے رنگارنگی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان تبصروں کی مدد سے ان کے ادبی نقطۂ نظر کی تفہیم و تعبیر بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت اس کی زبان ہے۔ صحیح معنوں میں لفظوں کا انتخاب، عبارتیں اور طرز بیان حد درجہ تفہیمی، مستند اور شفاف ہیں۔

یہ کتاب معنوی ہی نہیں بلکہ صوری طور پر بھی جاذب نظر ہے۔ امید کہ اردو دنیا اس تازہ ادبی شہ پارے کا پرتپاک خیر مقدم کرے گی۔

بمبئی میں اردو (1914 تک)

مصنف: ڈاکٹر میمونہ دلوی
صفحات: 462، قیمت: 450 مجلد، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی
مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
محکمہ اعلا تعلیم حکومت جموں و کشمیر

اُردو کی علاقائی تاریخوں میں دکن میں اُردو (نصیر الدین ہاشمی) اڑیسہ میں اُردو (حفیظ اللہ) کشمیر میں اُردو (پروفیسر عبدالقادر سروری) اور تاریخ اُردو تمل ناڈو (علیم صبا نویدی/ ڈاکٹر جاویدہ حبیب) خاص اہم ہیں۔ بمبئی میں اُردو (1914 تک) از ڈاکٹر میمونہ دلوی (1934-2008)۔ اصل میں یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے 1961 میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (اسماعیل یوسف کالج بمبئی) کی نگرانی میں تیار کیا اور 1971 میں اس کی پہلی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ مقالہ طریقۂ تحقیق اور موضوع کے حوالے سے بھی قابل تقلید ہے۔

'بمبئی میں اُردو' یا علاقائی ادب یا اُردو کی تاریخ یہ کچھ ایسا موضوع ہے کہ جس پر مسلسل کام ہوسکتا ہے، لیکن زیر نظر کتاب کو اسی صورت میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے، جو اس کی اصل صورت برسوں پہلے تھی، حالانکہ اس مقالے کا موضوع موصوفہ نے 1914 پر ہی روک لیا تھا۔ جبکہ ہمارا اصل ادب خاص کر اُردو تنقید، ترقی پسند تحریک، جنگ آزادی، بٹوارہ، فسادات وغیرہ جیسے بڑے بڑے موضوعات اس کے بعد ہی شروع ہوتے ہیں۔ جب یہ مقالہ لکھا گیا، تو اس وقت بھی اُردو میں جدیدیت کا رجحان چلتا تھا۔ اور جب اس کی دوبار اشاعت عمل میں لائی گئی، اس وقت مابعد جدیدیت سے پرے بھی ہم سوچتے ہیں۔

خیر موجودہ اشاعت میں ڈاکٹر میمونہ دلوی کے شوہر نامدار ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اس کتاب میں 'ابتدائیہ' اور 'اختتامیہ' کا اضافہ کر کے کسی حد تک ہماری تشنگی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'ابتدائیہ' میں دکن میں اُردو اور دکنی ادب کی تاریخ نویسی اور پھر اس مقالے کے بارے میں تین صفحات میں اپنی آراء ڈاکٹر عبدالستار صاحب نے پیش کی۔ البتہ اختتامیہ (صفحہ 435 تا 448) میں انھوں نے بمبئی میں اُردو (کے آغاز سے لے کر 1914 تک) پر پہلے طائرانہ نظر ڈالی، اس کے بعد 1914 سے 1960 تک شہر ممبئی کی اُردو خدمات کا مختصراً جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔

'بمبئی میں اُردو' کے مشمولات پر جب ایک نظر ڈالی جائے گی، تو اس میں ابتدائیہ، پیش لفظ اور اختتامیہ کے ساتھ ساتھ ہمیں چھ ابواب نظر آجاتے ہیں۔ اور ان ابواب کی ترتیب باضابطہ طور پر یونیورسٹی میں لکھے جارہے تحقیقی مقالات کے اصولوں پر کی گئی، جس میں مستند حوالے حواشی اور آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی باضابطہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارے اسکالرس اور نگران صاحبان تحقیق کے ان بنیادی اصولوں سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔ ہر باب موضوع کی ایک ایک کڑی ہے۔ ہر باب کو ذیلی سرخیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول کو پس منظر کے طور پر ''بمبئی کی سیاسی و سماجی تاریخ'' کا عنوان دے دیا گیا ہے۔ جس میں 1۔ بمبئی 2۔ سیاسی تاریخ 3۔ آبادی اور 4۔ اُردو کے سرپرست خاندان جیسے ذیلی موضوعات پر بات کی گئی ہے۔

باب دوم میں 'تذکرۂ شعرا و نثر نگار' (الف) تذکرۂ شعرائے دور اول اور (2) تذکرۂ نثر نگار دور اوّل، کے تحت الگ الگ ان شعراء اور ان نثر نگاروں کے احوال و کوائف مع نمونہ کلام و نثری ٹکڑوں کو پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے تقریباً 1792 سے 1857 کے

درمیان بمبئی میں اُردو کے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ان میں بہت سارے شعرا و نثر نگاروں کی تخلیقات غیر مطبوعہ تھیں، جنہیں مصنفہ نے مختلف کتب خانوں میں مسودات کی صورت میں دیکھا تھا۔ مصنفہ نے (3) تبصرہ کے تحت اس دور کا بھر پور محاکمہ بھی پیش کیا ہے۔ اسی باب کے دوسرے حصے (ب) میں 1۔تذکرۂ شعرائے دور دوم 2۔ تذکرۂ نثر نگار دور دوم اور 3۔ پھر تبصرہ میں (الف) کی ہی طرح دوسرے دور کے شعرا و نثر نگاروں (1857 کے بعد) کا تذکرہ پیش کیا گیا اور اس دور کا بھی محاکمہ پیش کیا گیا۔

یہاں مصنفہ کا یہ ماننا ہے کہ بمبئی کی ابتدائی اُردو پر دکنی زبان کا اثر غالب رہا، جبکہ دوسرے دور پر سرسید احمد خان اور ان کی تعلیمی سماجی ادبی تحریک کا براہ راست اثر بمبئی کی زندگی اور یہاں کی اُردو پر رہا۔

باب سوم 'صحافت' کے لیے مختص رکھا گیا ہے۔ جس میں بمبئی کی اُردو صحافت۔ تفصیلی مطالعہ 2۔ بمبئی کی اُردو صحافت۔ ایک جائزہ 3۔ بمبئی کے اُردو اخبار۔فہرست اور 4۔ بمبئی کے اُردو مطابع جیسے ذیلی عنوانات کے تحت موضوع کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی۔ موصوفہ نے مختلف حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ؟ 'محمدی' (1847) اخبار کو اولیت حاصل ہے، جس کے مالک آنریبل ناخدا محمد علی روگھے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے الگ الگ بمبئی کے مختلف اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا مجموعی طور پر جائزہ بھی لے لیا اور 1912 تک کے مختلف اخبارات ان کا سنہ اجراء، نام اخبار، ایڈیٹر، مطبع اور ان کے اطلاع کے ذریعہ کی طویل فہرست بھی درج کی گئی۔ اسی طرح بمبئی کے قدیم مطابع کی فہرست بھی یہاں پیش کی گئی۔ ایک اہم بات کا انکشاف کرتے ہوئے موصوفہ لکھتی ہیں کہ'' بمبئی کے غیر مسلموں میں ہندوؤں اور پارسیوں نے بھی یہاں اپنے پریس قائم کیے تھے۔ جہاں سے اُردو کی کتابیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ (ص 221)

باب چہارم 'علمی و ادبی تحریکیں' کے عنوان سے ہے، جس پر سات ذیلی عنوانات کے تحت روشنی ڈالی گئی۔

1۔ بمبئی کی علمی و ادبی تحریکیں۔ایک جائزہ 2۔گلدستے 3۔ رسالے 4۔انتخابی مجموعے 5۔علمی ادارے 6۔ تعلیمی ادارے اور 7۔ کتب خانے۔ مصنفہ نے طوالت کے پیش نظر یہاں کافی اجمال سے کام لے کر ان تحریکوں اور اداروں کو صرف متعارف ہی کروایا ہے۔

باب پنجم میں بمبئی میں اُردو ڈراما کو زیر بحث لایا گیا۔ یہاں پر میں ضمناً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو ڈراما کی شروعات لکھنؤ سے نواب واجد علی شاہ نے کی۔ اسکے بعد کچھ عرصے کے لیے ہمارا ڈراما کلکتہ چلا گیا، پھر ہم نے اس کا سنہری دور بمبئی میں ہی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور آغا حشر کی صورت میں دیکھا۔ اور اس کے بعد ایسا دوسرا دور آج تک اُردو ڈراما کو نصیب نہ ہو سکا۔ تو اس بات کے پیش نظر موصوفہ نے 1۔اُردو ڈرامے کا آغاز 2۔شہر بمبئی میں تھیٹر اور ڈرامے 3۔ بمبئی کے تھیٹروں میں اُردو ڈرامے اور 4۔اُردو ڈراما نگار جیسے ذیلی عنوانات کے تحت بات کی۔

باب ششم میں 'لوگ گیت' کے حوالے سے مع نمونوں کے مفصل بات کی گئی اور کہا گیا ہے:

'' قیاس غالب ہے کہ بمبئی کے یہ لوگ گیت اس وقت وجود میں آئے ہوں گے، جبکہ یہاں کے عوام نے اُردو زبان کو اپنی زندگی اور معاشرت کا ایک جزو بنا لیا ہوگا اور بمبئی کا تعلق سیاسی طور پر کبھی گجرات اور کبھی دکن سے قائم رہا ہوگا۔'' (ص 416)

الختصر' بمبئی میں اُردو' اگرچہ برسوں پہلے لکھی گئی کتاب آج دوبارہ شائع کی گئی، اور اس موضوع کو اور Extend نہیں کیا گیا ہے، مگر پھر بھی اس کی تاریخی اہمیت و افادیت سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا ہے۔

زنجیر در

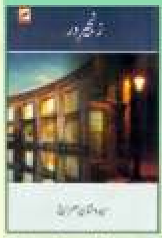

مصنف: سیدہ شان معراج

صفحات: 136، قیمت: 200 روپے

ناشر: تارین گلی، ڈاکٹر موہن نرسنگ ہوم کے سامنے شاہجہاں پور

مبصر: راشدہ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی

زنجیر در سیدہ شان معراج صاحبہ جو شاہجہاں پور کی خواتین شاعرات میں اہم مقام رکھتی ہیں، کے تحقیقی و تنقیدی مع تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے متفرق مضامین جیسے :مولانا ابوالکلام: بہ حیثیت شاعر، حجاب پردہ نشین: تاثر کے آئینے میں، ہم نے فراق کو دیکھا تھا، ریگ نم پہ قدموں کے نشاں کا شاعر: شاذ تمکنت، ڈاکٹر انجم جمالی، مثنوی اسرار محبت 'محبت خاں' نبی حسن خیال، فن اور شخصیت، اُردو مثنوی میں محبوب کا تصور، ہولی یک جہتی کی علامت وغیرہ شامل کیے ہیں اس کے علاوہ سیدہ شان معراج کی تنقیدی بصیرت پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے مجتبیٰ حسین اور سید شریف الحسن نقوی کے مضامین شامل ہیں جس میں شریف الحسن نقوی شان معراج کے بارے میں لکھتے ہیں: 'ان تمام مضامین سے مصنفہ کی علمی، ادبی اور ناقدانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے حسب ضرورت ایسے الفاظ استعمال کرتی ہیں جو ان کی تحریر کو جاندار اور پُر اثر بنا دیتی ہے۔

اپنے پہلے مضمون مولانا آزاد جن کا ذکر صحافت اور سیاست کے تعلق سے ہی کیا جاتا ہے شان معراج ان کے شاعرانہ ذہن پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں اگر (مولانا نے) انھوں نے شعر گوئی کو سنجیدگی سے مشق سخن بنایا ہوتا تو اردو زبان کے صفِ اول کے شعراء میں نہ سہی ایک اچھے شاعر کا اضافہ ضرور ہوتا اور مثال کے طور پر مولانا کے بہترین اشعار کا انتخاب کر کے ان کی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اپنے دوسرے مضمون حجاب پردہ نشین کے بارے میں لکھنے سے پہلے ادب میں خواتین کی تخلیقات کو دوئم درجے پر رکھنے کی ذہانت پر فرماتی ہیں'' ہمارے یہاں شاعری کو بڑی حد تک مردوں کی جاگیر سمجھا گیا اور یہ بدعت ہمارے مزاجوں میں اس حد تک رچ بس چکی ہے کہ جن خواتین نے شعر گوئی کا حوصلہ کیا بھی تو اپنے کلام میں عکاسی مردانہ جذبات کی ہی کی یہاں تک کی صیغہ بھی تذکیر کا روا رکھا۔

شان معراج نے ہم نے فراق کو دیکھا تھا مضمون کے تحت اپنی ذاتی ملاقات اور تاثرات کو اس میں قلم بند کیا اور فراق کے اس شعر

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا اُن کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

اور اپنی ملاقات کا ذکر نہایت ہی سادہ اور سلیس انداز میں کیا ہے فراق جیسی شخصیت سے ملنا اور انھیں اپنی شاعری سنانا نہایت ہی جگر کاری کا کام تھا مگر شان معراج اس منزل سے آسانی سے گزر کر معراج کو پہنچیں اور معراج صاحب کے اس شعر نے

اے مری عمر کے مغرور گزرتے لمحو
تم نے جاتے ہوئے مڑ کر کبھی دیکھا بھی نہیں

فراق جیسی شخصیت کو بھی کچھ دیر کے لیے نہ صرف غمگین بلکہ آبدیدہ کر دیا۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں شاذ تمکنت اور انجم جمالی کی شاعرانہ بصیرت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے شاذ تمکنت کی ناگہانی موت پر دکھ کا اظہار کیا ہے اس کے علاوہ شاہجہاں پور کے ایک باکمال مگر گمنام شاعر نبی حسن خیال کے فن اور شخصیت پر گفتگو کی ہے اس کے علاوہ اردو مثنوی میں محبوب کا تصور میں حسن و عشق کے معنی و مطالب کے علاوہ اردو ادب میں استعمال ہونے والے اور مختلف ملکوں اور تہذیبوں میں حسن کو پرکھنے کے پیمانے جس طرح سے الگ الگ قائم ہیں اس نکتے پر بھی بحث ملتی ہے کتاب میں شامل آخری مضمون الگ نوعیت کا ہے جس میں ہولی جیسے تہوار جو ملکی اور قومی یک جہتی کی علامت تصور کیا جاتا ہے اس کو دور قدیم سے جدید تک جس طرح سے اہمیت دی جاتی رہی ہے اور اردو شاعروں نے جس طرح سے اس تہوار کو اپنے فن اور فکر کا حصہ بنایا ہے اس پورے منظر نامے کو شان معراج نے اس مضمون میں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے اور مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے لکھتی ہیں کہ ہندوستانی زبان کا ادیب و شاعر اس سے قطع نظر کہ وہ کسی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہے، اس ہفت رنگ تیوہار کے کیف و رنگ، سرشاری و مستی میں چور نظر آتا ہے اور ہولی کو مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اس کے علاوہ اردو میں جن شاعروں کی تخلیقات موجود ہیں اس کا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔

غرض زنجیر در سیدہ شان معراج کی تحقیقی، تنقیدی، تاثراتی نیز ذاتی نوعیت کی کتاب ہے جس کو انھوں نے اپنی خوبصورت و سلیس نثر کے ذریعہ پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے جو اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی میدان میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

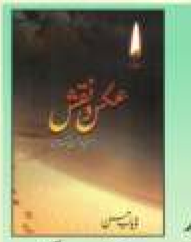

عکس و نقش (تاثراتی و تجزیاتی مضامین)

نام مصنف: نایاب حسن

صفحات: 240، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: سلیم صدیقی پورنوی، R/TP.: 48، موتی چہ بلاک، بنگلور

'عکس و نقش' نایاب حسن کے تاثراتی و تجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے، کتاب (عکس و نقش) اور کتاب کے مصنف دونوں اسم با مسمیٰ ہیں، جس کا کتاب کے مطالعے کے بعد بخوبی احساس ہوتا ہے۔ یہ کتاب کئی کتابوں کا آئینہ اور نچوڑ ہے، اس کے مطالعے کی مدد سے بہت سی کتب سے مکمل نہ سہی بڑی حد تک آگاہی حاصل ہو جاتی ہے، اس کتاب کا ہر مضمون الفاظ و تعبیرات کا حسین چمن زار ہے، فاضل مصنف نے الفاظ کو اس عمدگی کے ساتھ برتا ہے کہ پڑھتے ہوئے قاری انہی میں ڈوب جاتا ہے اور اتنا ڈوب جاتا ہے کہ بسا اوقات مضمون مکمل ہو جاتا ہے، مگر دل ھل من مزید کی صدا لگاتا رہ جاتا ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ ان بزرگ شخصیات سے متعلق ہے، جن کی دینی، ادبی، تخلیقی یا تجدیدی خدمات سے مصنف (نایاب حسن) متاثر ہیں یا ان سے عقیدت رکھتے ہیں یا پھر ان کی شاگردی اختیار کی ہے یا وہ ایسی شخصیات ہیں جو اپنی خدمات و کارنامے کی وجہ سے آفتاب بن کر چمکیں اور ایک عالم کو منور کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر دو مضامین ہیں، ایک تو ان کی تجدیدی خدمات اور علمی مقام و مرتبے پر مشتمل ہے اور دوسرا ان کے فلسفۂ تصوف پر، اس کے بعد حضرت نانوتوی کی عملی زندگی کے تین اہم پہلوؤں پر مبسوط روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد فلاح امت کے حوالے سے شیخ الہند کے افکار و تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد سرسید احمد خان کے تعلیمی افکار کی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے، اور پھر ایک بہت ہی تحقیقی مضمون علامہ شبلی نعمانی کی اردو تاریخ نگاری پر مشتمل ہے، یہ اس کتاب کا اہم مضمون ہے، اس میں فاضل مصنف کی تحقیقی طبیعت، تفتیشی مزاج، علمی حذاقت اور اخذ و ضبط کی صلاحیت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تاثراتی تحریر اردو ادب کے مسلم شاعر و نثار عامر عثانی سے متعلق ہے، جس میں ان کے نثری محاسن کا بہترین تجزیہ ان کے رسالہ ماہنامہ 'تجلی' کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ کتاب میں ایک مضمون مولانا حسین احمد مدنی کی تصانیف کے جائزہ پر مشتمل ہے، پھر بالترتیب سابق محدث دارالعلوم دیوبند شیخ عبدالحق، مولانا ریاست علی بجنوری استاد حدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا کفیل علوی اور مولانا مرتضی وغیرہ پر تاثراتی و تجزیاتی مضامین ہیں، سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ اس حصے کا مرکزی عنوان 'چندے آفتاب' رکھا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ان شخصیات سے متعلق ہے، جو آسمان ادب کے ماہتاب ہیں، جنہوں نے اردو ادب کو نہ صرف سنوارا اور نکھارا؛ بلکہ آفاق عالم میں اس کو نئی پہچان بھی دی۔ اردو پر سب سے زیادہ اور بڑا احسان امیر خسرو کا ہے یا یہ کہہ لیجیے کہ وہ اردو کے ماتھے کا خوبصورت جھومر ہیں، جب تک اردو لکھی، پڑھی اور بولی جاتی رہے گی، تب تک امیر خسرو بھی یاد کیے جاتے رہیں گے، اردو کے ساتھ وہ تاریخ اردو میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے؛ لہٰذا امیر خسرو اس حصے میں مقام اول پر فائز ہیں، 'امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت' میں جہاں خسرو کی شاعرانہ عظمت کا کھل کر اعتراف کیا گیا ہے، وہیں خسرو کی دوسری ادبی ہنرمندیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، خسرو ہندی گیت میں کئی سُروں کے موجد ہیں اور ایک ایک شعر میں کئی کئی زبانوں کو ایک ساتھ استعمال کرنے کی بنا بھی اردو میں انہوں نے ہی ڈالی ہے؛ اس لیے اس تحریر میں خسرو کے ان پہلوؤں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، مضمون کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اقبال کے شاعرانہ کلام میں مختلف اعاظم رجال اور پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، جن میں حضرت ابراہیمؑ کی ذات اہم ہے اور یہ اقبال کے یہاں مختلف رنگ و روپ میں جلوہ گر ہیں، نایاب حسن نے کلام اقبال میں حضرت ابراہیم کے تذکرے کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جون ایلیا اردو ادب کا وہ بڑا نام ہے، جس نے اپنی علمی قابلیت، فلسفیانہ مزاج و آہنگ اور نثر نگاری کی جادوگری سے اردو قارئین کو اتنا ہی فیض یاب کیا جتنا کہ اپنی شاعری سے شاعرانہ ذوق رکھنے والوں کو، پوری زندگی خود تو جون خون تھوکتے رہے، مگر اپنے قاریوں کو موتیوں سے نوازتے رہے، فی الوقت نوجوان نسل میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعروں میں جون ایلیا نہایت مقبول ہیں، البتہ جون ایلیا کا ایک رخ وہ بھی ہے، جس سے نئی نسل ناواقف ہے اور وہ ہے ان کی سحر طراز نثر نگاری، نایاب نے ایک مضمون میں جون ایلیا کی نثری خوبیوں پر بھی گفتگو کی ہے اور بہت خوش اسلوبی سے کی ہے۔ زاہدہ حنا بہترین قلم کار ہیں، جون ایلیا کی مناسبت سے نایاب حسن نے زاہدہ حنا کو بھی پڑھا ہے، جس کا تذکرہ مقدمے میں کیا بھی گیا ہے۔ ایک تحریر ان پر بھی ہے، یہ تحریر بھی جاندار ہے۔ شورش کاشمیری اردو کی وہ عظمت رفتہ ہیں، جنھوں نے جیل کی سلاخوں سے لے کر بھوک ہڑتال تک اردو خطابت، ادب و صحافت کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، انہوں نے اردو نظم و نثر کو جو کچھ دیا ہے، وہ بہت زیادہ اور بے حد قیمتی ہے، ایک مضمون ان پر بھی ہے۔ پروین شاکر پر لکھا گیا تاثراتی مضمون بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، اس میں پروین شاکر کی نظموں میں استعمال کی گئی ان نئی تعبیرات کو جمع کیا گیا ہے، جو صرف پروین شاکر کے یہاں ملتی ہیں، یہ ایک انفرادی نوعیت کی کوشش اور مصنف کے ادبی شعور کی پختگی کی علامت ہے۔ ابن صفی کو مصنف اپنے قلمی سفر کا محرک مانتے ہیں؛ اس لیے ایک مضمون ان پر بھی ہے، جو بہت ہی دل پذیر

و دل پسند ہے،ان کے علاوہ اقبال سہیل، انتظار حسین، ملک زادہ منظور، ندا فاضلی، محسن نقوی، کلیم عاجز اور سعود عثمانی کے فکر وفن کے مختلف گوشوں پر لکھے گئے مضامین بھی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

ایک خوبی اس کتاب کی یہ بھی ہے کہ تمام مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں، اسی طرح ہر مضمون دلائل وشواہد سے مبرہن ہے، سنی سنائی باتوں کا اس میں کہیں دخل نہیں ہے۔ کتاب میں جن شخصیات کے فکر وفن کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے،ان پر پہلے سے بھی لکھا جاتا رہا ہے مگر نایاب نے اپنے مضامین میں انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے ان شخصیات کی سوانح پر گفتگو کرنے کے بجائے ان کے مخصوص علمی وتخلیقی گوشوں کو موضوع تحریر بنایا ہے اور خاص طور پر ان کی عملی زندگی کے ان گوشوں پر بات کی ہے، جن پر لکھنے والے یا تو لکھتے نہیں یا بہت کم لکھتے ہیں۔ کتاب جس طرح مضامین کے اعتبار سے عمدہ ہے، اسی طرح ٹائٹل، کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے بھی دلکش وجاذب نظر ہے۔

دریچہ

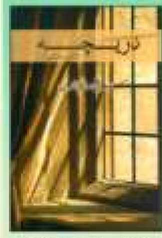

مصنف: صدیقی صائم الدین

صفحات: 232، قیمت: 145 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: اطہر حسین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس

صدیقی صائم الدین نوجوان قلم کاروں میں ہیں۔ان کے مقالات اور مضامین اردو کے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔وہ محقق، نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیق کار بھی ہیں۔ ان کی اب تک دو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔زیر تبصرہ کتاب 'دریچہ' صدیقی صائم الدین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شعری مضامین ہیں جبکہ دوسرے حصے میں نثری۔

پہلا حصہ 'مضامین متعلق نظم' کے عنوان سے ہے جس میں کل 11 مضامین ہیں۔ ابتدائی تین مضامین خواجہ حیدر علی آتش، حسرت عظیم آبادی اور سرور جہان آبادی کے بارے میں ہیں۔ ان مضامین میں جہاں نقد واحتساب کا فریضہ انجام دیا گیا ہے وہیں صدیقی صائم الدین نے ان شعرا کے ابتدائی حالات اور ان کے اہم سوانحی گوشوں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان شعرا کے تجزیے میں اہم شعری میلانات اور مضامین کی نمایاں جہتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران براہ راست متن سے حوالہ دے کر اپنے دعووں کی دلیل فراہم کی گئی ہے اور کہیں کہیں اشعار کی عمدہ تعبیر وتشریح بھی کی گئی ہے۔ البتہ غزل کے ان اہم شعرا کے مطالعہ میں پیش روتنقیدی تحریروں سے براہ راست استفادہ نہیں کیا گیا ہے اور غالباً اسی لیے ابتدائی تینوں مضامین میں کسی طرح کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ آتش کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''الغرض آتش کے پاس عشق ہو کہ تصوف۔ دونوں ہی بدرجہ اتم موجود ہیں'' (ص33) واضح رہے کہ بدرجہ اتم کا 'ت' کتاب میں مشدد ہے۔

شعری حصے میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا فیض احمد فیض، مجاز، سردار جعفری، جذبی، مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے التزام کے ساتھ ان شعرا کے اہم سوانحی گوشوں اور کوائف کا ذکر کیا ہے۔ شعری سفر کے آغاز سے آخری وقت تک ان کے یہاں کس طرح کی تبدیلی واقع ہوئی اور کن پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی۔ فاضل مصنف نے شعری متن سے اپنی بات کو مدلل کیا ہے۔

ادب کی تفہیم اور تجزیے کی یہ کاوش ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ البتہ موضوعات کے عناوین کے انتخاب میں سہل اور عام فہم الفاظ کا استعمال زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مشمولات میں ایک مضمون 'ازہاب ذہن معین احسن جذبی' کے عنوان سے ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جذبی نے اپنی شاعری کو سطحیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔

اختر الایمان کی شاعری سے جہاں انہوں نے سماجی حسیت کا نقشہ پیش کیا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے یہ اشعار بے حسی کی تصویر ہیں مگر ان میں روشنی کے بجائے امید کی کرن ہے۔ انھوں نے مختلف مذہبی، تہذیبی اور سماجی علامتوں کے توسط سے اس جدوجہد کا نقشہ کھینچا ہے جس کے متلاشی تو سب ہیں مگر عمل پیرا کم ہی ہوتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'مضامین متعلق نثر' کے عنوان سے ہے۔ نثری حصہ محض تین مضامین پر مشتمل ہے۔ 'مولانا ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند' کے عنوان سے ایک مقالہ ہے اس میں تقسیم ہند سے متعلق مولانا کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے۔ صائم الدین نے اس کے لیے ہماری آزادی کو اپنے مطالعہ کا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ دریچہ کے ایک مضمون 'عصمت چغتائی حیات اور ادبی خدمات' سے عصمت چغتائی کی زندگی کے ہمہ جہت پہلو مزید ان کی ادبی خدمات سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا آخری مضمون 'افسانہ رقص ناتمام میں نسوانی مسائل کی عکاسی' ہے۔ اس افسانے میں عزیز احمد نے عورتوں پر ہونے والے مظالم اور ان کی کیفیات کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ سماج کا ایک مسئلہ لڑکیوں کی ان کی مرضی کے بغیر شادی بھی ہے۔ عزیز احمد کے بیشتر افسانے اپنی مثال آپ ہیں مگر افسانہ رقص ناتمام میں عزیز احمد نے اپنے منفرد اسلوب اور جادو بیانی سے نسوانی کردار کو جس طرح سے قاری کے سامنے پیش کیا ہے اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ اس اہم افسانے کا صائم الدین نے عمدہ تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور اس کے نسوانی مسائل کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

صدیقی صائم الدین جواں سال قلم کار ہیں ان سے ادبی دنیا کو توقعات وابستہ ہیں۔ یقیناً اس کتاب کے مطالعہ سے ان کے تنقیدی شغف کا خاطر خواہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کو اور مہمیز کریں گے اور شعر وادب کی تفہیم وتعبیر کا بہتر سے بہتر فریضہ انجام دیں گے۔

فکشن

زہرہ بیگم

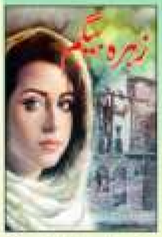

صفحات: 280، قیمت: 320 روپے

مصنفین: امیر مہدی، سلیم شیرازی

ناشر: کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، دہلی 6

مبصر: منظر نیاز (ڈپٹی ڈائرکٹر پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا، اردو یونٹ، این ایم سی بلڈنگ، نئی دہلی)

امیر مہدی اور محترم سلیم شیرازی کی مشترکہ تصنیف زہرہ بیگم ہے۔ اسے امیر مہدی نے اپنی والدہ مرحومہ مصنف جہاں کے نام موسوم کیا ہے۔ امیر مہدی بذات خود لکھنؤ سے وابستہ ہیں اور محترم سلیم شیرازی بھی لکھنوی ہیں لیکن تلاش روزگار میں لکھنؤ سے دہلی آئے۔

'زہرہ بیگم' ایک طرح کی آپ بیتی، خودنوشت اور ناول تینوں کی خصوصیت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مصنفین نے الگ الگ ابواب قائم کرکے تحریری تاثر کو ایک منفرد انداز بخشتا ہے۔ جس میں مرزا ہادی رسوا کے معروف ناول امراؤ جان ادا کے انداز کی

جھلک ملتی ہے اور خود امیرن یعنی امراؤ جان کا بھی ضمنی تذکرہ موجود ہے۔ 'پرچھائیاں' کے آغاز میں نثری شاعری کا لطف مضمر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زہرہ بیگم ناول نثر میں شاعری کی مثال ہے۔ تمہید شاعرانہ ہے، ذکر چمنستان کا ہے لیکن اصلاً وہ گورستان ہے۔ مصنفین نے تخیل اور حقیقت کا ایک نادر اور حسین مرقع پیش کیا ہے۔ دونوں مصنفین اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے انداز میں احساسات اور خیالات میں غوطہ زن بھی ہیں لیکن شعور کی رو انہیں حقیقی سنگلاخ زمین پر بھی کھینچ لاتی ہے۔ آغاز داستان 'ظالم اماں' سے ہوتا ہے۔ اور پوری کہانی انہیں کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ ظالم اماں اصلاً کوئی اور نہیں بلکہ زہرہ بیگم ہی ہیں۔ جن کی شخصیت خاصی تہہ دار ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ناول کا مرکزی کردار ہونے کے باوجود انہیں غم و آلام کی گرد نے کہیں کہیں دھندلا دیا ہے اور ان کی شخصیت ایسا لگتا ہے کہ دکھوں اور آلام میں تپ کر غیر اہم سی ہوگئی ہے۔ تاہم اس پیکر کے اندر وہ اصل پیکر پوشیدہ ہے جس نے کبھی آسودگی اور خوشحالی بھی دیکھی تھی، جو کبھی الہڑ اور سیدھی سادی سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔

زہرہ بیگم کے مختصر تعارف کے بعد مصنفین نے اس عہد کی تصویر کشی کرتے ہوئے نوابی دور اور مابعد نوابی دور کے فرق کو واضح کیا ہے۔ تہذیب و تمدن، نشست و برخاست، آداب و القاب، رہن سہن، لباس، تراش و خراش، بود و باش، رسم و رواج، انداز حیات کی جزیات اور تفصیلات اچھے انداز میں پیش کی گئی ہیں جو اپنے آپ میں خاصی دلچسپ ہیں۔ گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ رونما ہونے والے تہذیبی بدلاؤ اور بود و باش کے فرق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مصنفین نے قصے کو بڑی خوبی سے آگے بڑھایا ہے۔ زہرہ بیگم کے اوائل عمری کے حالات اتنی چابک دستی اور خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ کرلیا گیا ہے۔ زہرہ بیگم کی والدہ منی بیگم کا بھی تعارف ان ہی کے ساتھ کرایا گیا ہے اور یہ تعارف بڑے بے ساختہ انداز میں کرایا گیا ہے۔ ناول کے پلاٹ میں قدرے بکھراؤ کا احساس ہوتا ہے۔ بیک وقت بیسوں کردار ابھرتے ہیں جن میں اکی والے صاحب، زہرہ بیگم، منی بیگم، واجد رضا، ڈاکٹر نانو اور بیشمار دیگر کردار ہیں جو اپنی اپنی بولیاں بولتے نظر آتے ہیں اور ہر کردار مختصر ہونے کے باوجود اپنا ایک تاثر ضرور چھوڑتا ہے۔ زہرہ بیگم کے کردار کی نشو ونما لکھنؤ کی درگاہ عباس کے پس منظر میں بڑی خوبی سے ہوتی ہے اور رسم و رواج و طرز معاشرت کے مناظر جزیات کی تفصیل کے ساتھ آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ گویا قاری چشم تصور سے اس زمانے کے لکھنؤ کا نظارہ کر رہا ہو اور اہم سے لے کر غیر اہم اور ذیلی کرداروں سے بھی واقف ہوتا جا رہا ہو۔ مصنفین نے جس انداز میں بے شمار کرداروں کو سلسلہ وار تاہم بڑے فطری انداز میں قاری سے متعارف کرایا ہے وہ اپنے آپ میں انہیں دونوں حضرات کا فن ہے۔ عام طور پر بے شمار کردار والے کردار قاری کے ذہن پر بار بنتے ہیں اور اصل قصہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ تاہم مصنفین نے کمال فن سے ایسا نہیں ہونے دیا ہے۔ پڑھنے والا کہیں بھی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ درگاہ عباس کے قیام کی تاریخ سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ آرائش و زیبائش، اضافے و ابتلا سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ مولوی احمد اللہ شاہ اور راجہ جگن ناتھ سنگھ سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ تاہم زہرہ بیگم کی کہانی کہیں پیچھے نہیں چھوٹتی اور ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ 1947 میں ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزادی حاصل ہوئی اور اسی دن منی بیگم نے قید حیات سے نجات پائی۔ مصنفین نے بعض کرداروں کی وفات کے بعد ان کی گذشتہ زندگی کی روداد اس انداز سے بیان کی ہے کہ ان کرداروں کے فوت ہونے کے باوجود ان کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً منی بیگم کے حالات کی جزیات ان کے رحلت کی بعد بیان ہوئی ہیں۔ منی بیگم کو بیٹے کا ارمان بھینس کی دولتی سے لاحق ہوا تھا۔ ضامن عباس کی کم ظرفی اور زہرہ بیگم سے منسلک داستان، یہ سب واقعات بیک وقت بڑی تیز رفتاری سے گزرتے ہیں۔

تقسیم ہند کے باب میں ہندوستان کی تاریخ اور اس سے وابستہ تلخ حقائق بیان ہوئے ہیں اور انتہائی صاف گوئی اور بیباکی سے اس وقت کے اہم رہنماؤں کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ 'فیروزے کا ہار' روسا پر گزرنے والے حالات کا عکاس ہے۔ 'زو کی سیر' اس فطری ڈرامائیت کی حامل ہے جو اس وقت کا تقاضا تھا اور قاری کو تھوڑی دیر کے لیے تجسس و اندیشے سے دوچار کرتا ہے۔ 'کشتہ'، 'ایک پہیے کی گاڑی' اگرچہ ذیلی عنوانات ہیں تاہم غیر اہم ہوتے ہوئے بھی درمیانی خلا کو پر کرنے کا کام کرتے ہیں۔ 'مہری کی اینٹ' مرکزی کردار کو نمایاں کرنے کی کوشش ہے۔ 'نیلوفر'، 'اولالی' جیسے ابواب مصنف کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ 'پیاں شکن' ناکام عشق کی ناگفتنی کو گفتنی بنانے کی خوبصورت مثال ہے۔ 'کسمپرسی'، 'مغفرت' دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ اپنے زمانے کی ازحد معروف اور مقبول پردۂ سیمیں کی اداکارہ محترمہ مہہ جبیں مینا ناز عرف مینا کماری کا شعر

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے اُٹھ جاؤں گی میں
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

ازحد خوبصورت اور برمحل استعمال ہوا ہے۔ ساتھ ہی یہ شعر اس مظلوم اداکارہ کی یاد بھی تازہ کرتا ہے۔ یہ ایک طرح کا موازناتی اشارہ بھی ہے جو ہمیں زہرہ بیگم اور مینا کماری کی زندگیوں میں مماثلت تلاش کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

مجموعی طور پر زہرہ بیگم نام کا یہ ناول مصنفین کے ذاتی تاثرات اور ان کے پس منظر کا عکاس ہے۔ اور اپنے اندر متعدد خاندانوں کی روداد سمیٹے ہوئے ہے اور قاری کو ابتدا سے انتہا تک باندھے رہتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، رشتوں کی ناپائیداری اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رونما ہونے والے تغیر کا نام زہرہ بیگم ہے جو قاری کو دنیا کی کم مائگی نہیں بلکہ دنیا کی بے ثباتی کا بھی گہرا احساس کراتا ہے۔

شخصیات

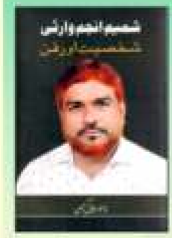

شمیم انجم وارثی : شخصیت اور فن

مرتب: ڈاکٹر اقبال حسین

صفحات: 264، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: محمد سعید اختر، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر تبصرہ کتاب 'شمیم انجم وارثی: شخصیت اور فن' وقار قادری کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے اقبال حسین نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں وقار قادری کے نو مضامین کے علاوہ چھ مضامین دیگر ناقدین کے شامل ہیں۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں 'مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت' کے عنوان سے مغربی بنگال میں اردو ادب اور شمیم انجم وارثی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب دوم میں وقار قادری کے لکھے نو مضامین شامل ہیں۔ جس میں وقار قادری نے شمیم انجم وارثی کی شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے بحث کی ہے۔ باب سوم میں دیگر ناقدین کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن میں فراز حامدی، ڈاکٹر محبوب راہی، علیم صبا نویدی، رؤف خیر، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور حلیم صابر کے مضامین شامل ہیں۔ باب چہارم میں شمیم انجم وارثی کے تعلق سے ناقدین کی گراں قدر آرا" کے عنوان سے دیگر محققین و ناقدین کے تاثرات کو

شامل کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں 'منظوم خراج تحسین' کے عنوان سے وقار قادری کی دو نظموں کے علاوہ دیگر شعراء کے کلام کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت' میں وقار قادری نے بنگال کی ادبی زندگی، فورٹ ولیم کالج، مدرسہ عالیہ، دبستان مٹیا برج، مرشداباد میں ابھرنے والے شاعروں 'قدرت اللہ قدرت' انشاء اللہ انشا' دردمند اور باقر مخلص وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون 'دل بھی روشن اور شخصیت بھی روشن' میں وقار قادری نے شمیم انجم کی پوری شخصیت، حلیہ، اردو ادب سے تعلق اور ان کے تلامذہ پر روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا مضمون 'شمیم انجم وارثی کی نعتیہ شاعری' کے بارے میں ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کے دو مجموعے 'روپ روپ تیری تجلی' اور 'حرف حرف خوشبو' کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اور نعتیہ ہائیکو، نعتیہ تنکا، نعتیہ کہہ مکرانیاں، نعتیہ دوہا غزل، نعتیہ گیت، نعتیہ ماہیے کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ تیسرا مضمون 'شمیم انجم وارثی بحیثیت دوہا نگار' ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس صنف سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ چوتھا مضمون 'زمین تاروں کا شاعر: شمیم انجم وارثی' ہے۔ وقار قادری نے بچوں کی نفسیات پر لکھی انجم کی نظموں کا مجموعہ 'جنگل جنگل موز' کو موضوع بحث بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شمیم انجم وارثی بچوں کی نفسیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ 'شمیم انجم کی غزلیہ شاعری'، 'شمیم انجم وارثی کی جاپانی شاعری'، 'شمیم انجم بحیثیت گیت کار'، 'شمیم انجم بحیثیت ماہیا نگار'، 'رباعی گوئی میں شمیم انجم وارثی کا شناخت نامہ' وغیرہ مضامین شامل کتاب ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک صنف سخن کے اسیر نہیں ہیں بلکہ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور موضوع کا حق ادا کیا ہے۔

تیسرے باب میں مختلف ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر فراز حامدی، ڈاکٹر محبوب راہی، علیم صبا نویدی، رؤف خیر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ چوتھے باب میں شمیم انجم کے متعلق مختلف ناقدین کی گراں قدر آرا کو شامل کیا گیا ہے۔

مضامین

میزان قلم

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: زرقا رحمٰن، پرنسپل علامہ اقبال اسکول، سنبھل یوپی،

مختلف کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ڈاکٹر عاکف سنبھلی کی ایک اہم کتاب 'میزان قلم' اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

اس کتاب کا آغاز خود موصوف کی تحریر 'ابتدائیہ' سے ہوتا ہے جس میں آپ نے کتاب کی غرض و غایت اور اہمیت و افادیت اور اس کے مشمولات کا تعارف پیش کیا ہے جس کا اندازہ ذیل میں پیش کیے گئے اقتباس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:

''زیر نظر کتاب میں مذہبی، ادبی، شعری اور سیاسی۔ غرض کہ کسی بھی زمرے کی کوئی تخصیص ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس میں تقریباً ہر ایک موضوع و مضمون کی کتاب کو شامل کر لیا گیا ہے۔ ان کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے—''

ڈاکٹر صاحب بذات خود بھی کتابوں کے زبردست شوقین و دلدادہ رہے ہیں اور کتابیں پڑھنا اُن کا بنیادی ذوق رہا ہے۔ کتاب کے ان تبصروں سے عاکف صاحب کے ذوق کتب بینی کے ساتھ ہی ان کا کتابوں کے تئیں پیار بھی جھلکتا ہے کیونکہ انھوں نے کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت اس بات کو ترجیح دی ہے کہ قارئین کے دل میں زیر تبصرہ کتاب کی اہمیت و افادیت پوری طرح اجاگر ہو جائے اور وہ اس کو خریدنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس سے جہاں ایک طرف وہ کتابوں کے تئیں اپنی محبت کو ظاہر کرتے ہیں، وہیں دوسری جانب اپنے فرض کو نبھانا بھی چاہتے ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ کتاب پر تبصرہ کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھ کر اور اس کے جملہ مواد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ قاری کی دلچسپی اس کتاب میں قائم ہو اور وہ اس کے مطالعے کے لیے بے چین ہو اٹھے۔

کتاب خواہ ادب سے تعلق رکھتی ہو یا وہ تذکرہ و سوانح پر مشتمل ہو یا پھر تنقید و تاریخ سے ہی اس کا واسطہ کیوں نہ ہو۔ تقریباً تمام ہی کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت وہ اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کے اس جوہر کو سمجھنے کے لیے تصوف پر مشتمل ایک کتاب 'تصوف اہل اللہ' پر کیے گئے تبصرے کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں اسلام کی بڑی عظیم و وقیع شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ بالخصوص ائمہ معصومین، بایزید بسطامی، ذوالنورین مصری، امام احمد بن حنبل، خواجہ معین الدین اجمیری، عبدالقادر جیلانی، سہیل تستری، ابوالحسن خرقانی، شبلی بغدادی، وارث علی شاہ، گدڑی شاہ بابا کا بڑی تحقیق و تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تبصرہ نگاری کی شاہکار اس کتاب میں اردو کی اہم 42 کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے جس میں آبشار ادب، بی ڈی کالبد ہمدم — آگرہ میں اردو صحافت، ڈاکٹر سید اختیار جعفری — اوراق حیات، شاہ عمران حسن — ٹونک میں اردو کا فروغ، سید ساجد علی ٹونکی — ساغر نظامی کی نثر نگاری، ڈاکٹر محمد زاہد رسالہ شاہراہ، نوشاد منظر — شعاع نوا (مجموعہ نعت)، رئیس احمد نعمانی — عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر، محمد ہارون — علاقائی زبانوں کی کہانیاں، ڈاکٹر بانو سرتاج — مشاہیر کے خطوط، نارنگ ساقی کے نام، ڈاکٹر سیفی سرونجی — بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'میزان قلم' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ کمپوزنگ معیاری، پروف ریڈنگ، صاف و شفاف طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کی حامل اس کتاب کی قیمت دو سو روپے مناسب ہی ہے جس کو براہ راست مصنف یا 'کتابی دنیا' ترکمان گیٹ دہلی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مختصر تبصرے

چراغ شب گزیدہ

شاعر: الطاف احمد اعظمی

صفحات: 192، قیمت: 150 روپے

ناشر: البلاغ پبلی کیشنز، اعظمی اپارٹمنٹ جامعہ نگر نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'چراغ شب گزیدہ' پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے اندر کل ایک سو سات غزلیں اور مختلف موضوعات پر کہی گئی نظمیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ غزلوں کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا قطعی آسان ہے کہ شاعر کو شاعری کے تمام رموز و نکات سے کما حقہ واقفیت ہی نہیں بلکہ درک تامہ حاصل ہے۔ اسی طرح سے شاعری کے لوازمات میں سے خیال بندی کو بھی اہم مرتبہ حاصل

رہا ہے۔ اس مجموعہ کے اندر خاص طور سے غزلوں میں جو خیال آرائی اور ندرت ہمیں دیکھنے کو ملی وہ قابل تعریف ہے۔ اور اس مقام تک پہنچنے میں جہاں ایک طرف شاعر کے فکر کی بلندی نظر آتی ہے وہیں اسلوب شاعری میں ان کا اپنا ایک خاص رنگ جھلکتا ہے اسی طرح نہ صرف غزلوں میں ہی غزلیہ رنگ جھلکتا ہے بلکہ نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ یقین ہو جاتا ہے واقعی کسی خیال کو ایک لڑی میں کیوں اور کیسے پرو دیا جاتا ہے۔ پورے مجموعہ کے مطالعے کے بعد یہ بات بہت آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ الطاف صاحب کو نہ صرف ایک نثار کی حیثیت سے ادبی دنیا جانے گی بلکہ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا سکہ ادب میں بٹھا دیں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے "اللہ کے لیے یہ کوئی بعید نہیں ایک آدمی میں دنیا کی تمام صفات جمع کردے" الطاف صاحب کی شخصیت ہمہ جہت اور گوناگوں ہے اللہ کرے 'فکر تخیل' زیادہ۔ کتاب کی طباعت دیدہ زیب اور سرورق عمدہ ہے اور صفحات کے حجم کو دیکھتے ہوئے نہایت ہی مناسب قیمت رکھی گئی ہے۔

مظہر عشق

شاعر: ڈاکٹر زرتاج ہاشمی سحر

صفحات: 180، قیمت: 107 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'مظہر عشق' ڈاکٹر زرتاج ہاشمی سحر کا اولین شعری مجموعہ ہے اس کتاب کے اندر ایک نعت نبیؐ اور ایک سو چھ غزلیں جب کہ نو نظمیں شامل ہیں۔ شاعری کرنا یا شعر کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تاہم کوئی ایک آدھ شعر موزوں ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ شاعر ہے بلکہ یہ صنف انتہائی سخت اور جان لیوا ہے۔ کیوں کہ یہاں بات سے بات نہیں پیدا کی جاتی بلکہ کسی داستان یا واقعہ یا تلمیحات کو ایک مصرعہ میں ڈھال دیا جاتا ہے اور یہی اچھے شعر کی نشانی اور شاعر کا کمال ہوتا ہے۔ جہاں ایک نثر لکھنے والا اپنی بات کی وضاحت میں نہ جانے کتنے صفحات رنگ دیتا ہے تاہم ایک اچھا شاعر اُسی بات کو محض ایک مصرعہ میں پیش کر دیتا ہے مذکورہ مجموعہ میں شاعر نے کئی ایک اہم بات کو بالکل اسی طرح پیش کیا ہے۔ نادر تشبیہات کا استعمال جا بجا اس مجموعہ میں نظر آتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کی پکڑ مطالعہ کائنات پر بہت گہری ہے۔ کیونکہ سحر صاحب کو شاعری ایک طرح سے ورثہ میں ملا ہے وہ خود کہتے ہیں "مجھ کو جو کچھ شعر کہنے کا فہم و ادراک حاصل ہوا ہے وہ میرے والدین کی ہی تربیت کا نتیجہ ہے میرے استاذ پروفیسر ڈاکٹر رشید صدیقی کی باتیں اور نصیحتیں ادب اور زندگی کے تعلق سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی نکتہ روشن کرتی ہیں"۔ امید ہے ادبی حلقہ اس مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لے گا اور شعری دبستان میں یہ کتاب ایک باغ کی نہ سہی کم از کم کلی تو ثابت ہی ہوگی جس کے غنچوں کے پھوٹنے کی آواز رفتہ رفتہ سخن فہم عوام کو اپنی طرف مائل کرے گا۔

ہینگر میں ٹنگی نظمیں

شاعر: فرحان حنیف وارثی

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ نگر نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ہینگر میں ٹنگی نظمیں' مشہور نظم نگار فرحان حنیف وارثی صاحب کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے نہایت ہی جاں فشانی سے مرتب کیا ہے بقول فرحان صاحب "میں نے تقریباً بیس برس قبل اپنے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت کا ارادہ کیا تھا مگر یہ ممکن نہ ہو سکا یہ خواب میری پلکوں کے کسی کونے میں پڑا تھا اب اتنے سال بعد میں نے استری کر کے اس خواب کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی ہے"۔ اس مجموعے کے اندر زندگی کے اندر پیش آنے والے ذاتی اور خارجی معاملات پر بھی نظمیں ہیں تو ملکی اور عالمی مسائل پر بھی۔ ایک طرف حسن کے ریگزاروں میں شاعر اپنے دل کی تسلی تلاش کرتا ہے تو دوسری طرف اسے ان ہریالیوں میں بھی خزاں نظر آتی ہے اور یہی ایک مایہ ناز نظم نگار کی نشانی ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے نظریہ سے دیکھتا ہے مزید یہ کی تخصص الفاظ پر شاعر کو قدرت حاصل ہے جہاں جیسا ماحول وہاں اسی حساب سے شاعر نے لفظوں کا استعمال بخوبی کیا ہے اور مشکل سے مشکل خیال بھی ایک خوبصورت لڑی میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور قاری کے ظرف و بساط پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اسے کس طرح نوازتے ہیں 'کرفیو جاری ہے'، 'ایک دکھی بوڑھے کی کہانی'، 'مونالیزا'، 'لیمپ پوسٹ'' کاش'، 'تم مجھے آج بھی یاد ہو' نمائندہ نظموں کی صفوں میں جگہ پانے کی حقدار ہیں۔ جگہ جگہ اس میں نصیحت کے پہلو بھی جھلکتے ہیں اور یہ نصیحت بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ بقول شاعر" یہ سیاہ، سفید، سبز، زرد، سرخ، پیلی اور نیلی نظمیں میرے اندر کہیں موجود تھیں جنہیں میں نے لفظوں کے برش سے سنوار کر ہینگر پر ٹانگا ہے۔ آپ اپنی پسند کی نظم ہینگر سے اتار کر پڑھ سکتے ہیں بس اتنی سی درخواست ہے کہ نظم پڑھنے کے بعد اسے واپس ہینگر پر ٹانگنا نہ بھولیں"۔ امید ہے باذوق قارئین ان نظموں کو پڑھنے کے بعد ہینگر پر نہیں بلکہ دل کی سرخ دیواروں پر ٹانگیں گے۔ تاکہ یہ نظمیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔

روشن سائے

شاعر: قیصر رزاق

صفحات: 184، قیمت: 180 روپے

ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'روشن سائے' جدید شاعری کے ایک اہم شاعر قیصر رزاق صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ کتاب کی ابتدا ایک حمد، نعت اور منقبت سے کی گئی ہے جو کہ بڑوں کا وطیرہ رہا ہے اس کتاب کے اندر کل اکیاسی غزلیں ہیں جن میں دو غزلیں طرحی ہیں جب کہ آٹھ نظمیں بھی ہیں اور ایک قطعات و رباعیات کے ساتھ ساتھ تہنیت و سہرا اور ایک زندگی نامہ بھی ہے۔ غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا ذہن پختہ سے پختہ تر ہو چکا ہے اور شاعری ان کے مزاج کا حصہ ہی نہیں بلکہ روزمرہ کا کام بن چکی ہے۔ اور اصناف شاعری میں داخلیت اور خارجیت پر بہت بحثیں ہو چکی ہیں تاہم اس مجموعہ میں جہاں بھی شاعر نے داخلی عنصر کا استعمال کیا ہے وہ قابل صد آفریں ہے۔ اور اس بات کی علامت ہے کہ مشق انتہائی عروج پر ہے اس میں دونوں باتیں آسکتی ہیں ایک تو یہ کہ شاعری ورثہ میں ملے دوسری یہ کہ کوشش جاری رہے تو منزل آسان ہو جاتی ہے قیصر صاحب میں دونوں چیزیں ہیں شاعری سے ان کے خاندان کا لگاؤ پرانا ہے اور پھر ان کی اپنی محنت اور لگن نے اس میں چار چاند لگا دیا ہے۔ مذکورہ کتاب کے مبصر کو پوری امید ہے کہ یہ مجموعۂ کلام اردو ادب میں اور خاص طور سے جدید شاعری کے حوالے سے دستاویز ثابت ہوگا۔ پروف ریڈنگ کی غلطیوں سے بہت حد تک مبرا ہے جب کہ کتاب کا سرورق اور کاغذ دیدہ زیب ہے اور پہلی نظر میں دیکھنے والوں کو اپنی جانب مائل کرتا ہے۔

محمد اسعد اللہ

1444/45، فیاض گنج، آزاد مارکیٹ، دہلی۔ 110006

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال اور حکومتِ ہند کا اردو کی ترقی میں تعاون

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے 'ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال اور حکومتِ ہند کا اردو کی ترقی میں تعاون' کے عنوان پر 'اسکائی لارک ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی مظفر نگر کے زیر اہتمام ہوٹل گولڈن ان میرٹھ روڈ مظفر نگر میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار میں تشریف لائے مہمان خصوصی اتر پردیش اردو اکادمی کے ممبر کنور باسط علی نے کہا جس طرح ہندی ملک کی جان ہے ٹھیک اسی طرح اردو ملک کی خوبصورتی ہے، موصوف نے کہا کہ قدیم گنگا جمنی تہذیب کو باقی رکھنے میں اردو کا اہم کردار رہا ہے، محترمہ پروفیسر ثمینہ بی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم لوگ اردو زبان سیکھ رہے ہیں، اور قومی کونسل اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ سیمینار سینئر سماج سیوی محترمہ رانی عباس نے کہا کہ اردو نے نہ صرف سماج کو باندھنے اور جوڑنے کا کام کیا ہے بلکہ عوام کے لیے بھی بھائی چارے اور محبت کی راہیں ہموار کی ہیں، سیمینار کی نظامت جناب عبدالحق سحر نے کی جبکہ اظہار تشکر کے فرائض قاری محبوب نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2018

اردو زبان کے فروغ میں اہل لکھنؤ کی خدمات

لکھنؤ: اکادمی آف ماس کمیونی کیشن قیصر باغ لکھنؤ کے ہال میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہل لکھنؤ کی خدمات کے عنوان پر سید منظور احمد اشرفی میموریل وشال اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے اردو زبان کے اشتراک سے ایک سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کی صدارت رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی فیض آباد کے پروفیسر محمد نسیم خاں نے کی اور مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے شرکت کی۔ معروف افسانہ نگار محسن خان نے مہمانان کو گل دستہ پیش کر کے خیر مقدم کیا۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر نسیم خان نے کہا کہ لکھنؤ اردو ادب کے آسمان کا ایک درخشاں ستارہ ہے۔ پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے اودھ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ برہان الملک سے لے کر واجد علی شاہ تک سبھی حکمراں، نہ صرف ادب نواز بلکہ خود بھی اعلیٰ پائے کے تخلیق کار تھے۔ آصف الدولہ خود صاحب دیوان شاعر ہیں۔ آخری تاجدار واجد علی شاہ نے تو فنون لطیفہ کی جی کھول کر سرپرستی کی۔ اردو ادب میں ڈرامے کا وجود لکھنؤ کی سرزمین کا مرہونِ منت ہے۔ مشہور افسانہ نگار محسن خان نے کہا کہ فکشن کے میدان میں سرزمین لکھنؤ سرسبز و شاداب نظر آتی ہے۔ داستان گوئی ہو یا جدید ناول نگاری لکھنؤ کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ امراؤ جان ادا لکھنوی ادب کا بے بدل شاہکار ہے۔ مہمان خصوصی امبیڈکر سے تشریف لائے فضل اللہ خاں نے کہا کہ دہلی میں پروان چڑھی اردو زبان کو لکھنؤ نے ایک منفرد لہجہ عطا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 مئی 2018

شہباز امروہوی کی شاعری

امروھہ: جعفر ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے ایک سیمینار محلہ گھیر بچھیاں جعفر پبلک اسکول میں کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ زینت مسند عتیق الرحمٰن فاروقی، مشکور حسن شوق، یوپی اردو ادب سوسائٹی کے صدر کوثر علی عباسی، سابق چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز رہے۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے عتیق الرحمٰن فاروقی نے کہ کہا سرزمین امروہہ نے جن ادبی شخصیات کو جنم دیا ان میں غلام ہمدانی مصحفی، میر تقی میر کے استاد میر سعادت علی، اردو کی قدیم مثنوی کے خالق اسماعیل امروہوی، رئیس امروہوی، صادقین امروہوی، جون ایلیا وغیرہ کے علاوہ اسی گہوارہ علم و ادب کے ایک بزرگ شاعر شہباز امروہوی بھی تھے، ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشفق بزرگ بھی تھے۔ ڈاکٹر ناصر پرویز نے کہا کہ ان کے مزاج میں زندہ دلی اور ان کے طنز میں رمز و کنایہ کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے بے شمار تاریخی قطعات بھی کہے ہیں۔ شہباز امروہوی کا طنز ایک دردمند انسان کا طنز ہے اور ان کا مزاج ایک شائستہ اور مہذب آدمی کا مزاج ہے۔ حسن جعفر نے کہا کہ اردو کے بیشتر شعرا کی طرح شہباز امروہوی نے بھی غزل کی دہلیز سے اردو شاعری میں قدم رکھا۔ ابتدا میں گل اس کے بعد مسلم، پھر شاہین، اور آخر میں شہباز تخلص اختیار کیا۔ ان کے علاوہ شہاب انور، انیس احمد، اختر العباس گلزار، طاہر حسن، سلیم جعفر وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 مئی 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

مدارس کے اساتذہ کو تربیت دے گی حکومت

نئی دہلی: مدارس عربیہ کو جدید عصری علوم سے آراستہ کرنے کی کوششوں میں مصروف مرکزی وزارت اقلیتی امور نے اب نیا تربیتی پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مدارس کے اساتذہ کی تعلیمی مہارت کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس سلسلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) اور کچھ دیگر اداروں کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہے۔ وزارت اقلیتی امور کے ماتحت ادارہ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ایم اے ای ایف) کے ذریعہ اس پروگرام کا نفاذ کیا جا رہا ہے۔ یہ تربیتی پروگرام وزارت کی '3 ٹی' (ٹیچر، ٹفن اور ٹوائلٹ) منصوبے کا حصہ ہے۔ اس پروگرام کے تحت مدارس کے اساتذہ کو 40-40 کے بیچ میں ملک کے کچھ اہم تعلیمی اداروں میں تربیت دی جائے گی۔ یہ تربیت کم از کم 15 دن کے لیے ہوگی اور ضرورت کے مطابق اس کی مدت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ پروگرام پورے سال میں چلایا جائے گا۔ ایم اے ای ایف کے مطابق مدارس کے اساتذہ کو تربیت دینے کے لیے اس نے جامعہ، اے ایم یو اور ممبئی کے تعلیمی ادارہ 'انجمن اسلام' کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور آنے والے دنوں میں جنوبی ہند اور مشرقی ہندوستان کے کچھ اداروں کے ساتھ بھی معاہدہ کیا جائے گا۔ ایم اے ای ایف کے سکریٹری رضوان الرحمان نے بتایا کہ 3 ٹی اقلیتی امور کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی اور وزارت کی اہم پہل ہے۔ اس کے تحت ہم مدارس کے اساتذہ کو تربیت دے رہے ہیں تاکہ ان کی تعلیمی مہارت میں بہتری ہو سکے۔ اسی کوشش کے تحت ہم نے ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور یہ آئندہ بھی کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی دھارے کے اداروں میں پڑھانے والے اساتذہ کے پاس بی ایڈ، ایم ایڈ اور دیگر ڈپلوما ہوتے ہیں اور ان کے تربیت یافتہ ہونے کا فائدہ بچوں کو ملتا ہے۔ مدارس میں ایسا نہیں ہے۔ اگر مدارس کے اساتذہ بھی تربیت یافتہ ہوں گے تو اس کا فائدہ مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو ملے گا۔ رضوان الرحمان نے کہا کہ ہم 40-40 بیچ میں مدارس کے اساتذہ کو تربیت دیں گے۔ اس تربیتی پروگرام میں ہم شعبہ تعلیم کے ماہرین سے بھی مدد لیں گے۔ ابتدائی طور پر ہم نے کچھ مدرسوں کی نشاندہی کی ہے۔ آہستہ آہستہ ہم تمام مدارس کو اس پروگرام کے دائرے میں لائیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' 4 جون 2018

یونیورسٹیوں کے معیار تعلیم میں سدھار لانے کی ہدایت

پٹنہ: راج بھون میں گورنر ستیہ پال ملک کی صدارت میں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی میٹنگ میں گورنر نے واضح الفاظ میں کہا کہ راستے میں اگر پریشانی آتی ہے تو فوراً ان کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن کسی طرح کی

بہانے بازی کے خلاف سختی سے نمٹنا ہوگا۔ سبھی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کو میٹنگ میں لیے گئے فیصلہ کو سختی سے نافذ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یونیورسٹیوں میں ٹیچروں اور طلبہ کی موجودگی اور اکادمک اور امتحان کلینڈروں پر صد فیصد عمل کرکے ضروری کارروائی کرنے کی ہدایت دی۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے گورنر نے کہا کہ ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے سدھار کی کوششوں کو سبھی امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اس لیے وائس چانسلروں کو چاہیے کہ وہ اپنی طاقت اور دماغ اور کوشش کا پورا استعمال کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے مقررہ ایجنڈے پر تیزی سے کام کریں۔

گورنر نے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے حلقہ میں بہتری کے لیے کی جا رہی کوششوں کا سفر کافی لمبا ہے۔ لیکن صاف طریقے سے طے شدہ پروگرام کے تحت کام کرنے پر کوئی بھی نشانہ آسان ہو جاتا ہے۔ گورنر نے کہا کہ یہ بات سامنے آئی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ٹیچروں اور ملازمین کی مقررہ اور بقایا تنخواہ وقت پر نہیں دی جا رہی ہے جس کی وجہ سے کئی طرح کے مسائل بھی سامنے آ رہے ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں کارروائی ہونی چاہیے۔ میٹنگ میں یونیورسٹی کو بھی سرکاری خریداری کے لیے مقررہ پورٹل استعمال کرنے کو کہا گیا۔ ساتھ ہی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ٹیچروں اور ملازمین کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے بینک کھاتوں کی انٹر لنکنگ کا کام بھی پورا کرانے کے لیے کہا گیا۔ میٹنگ میں محکمہ تعلیم کے جنرل سکریٹری آر کے مہاجن، گورنر کے چیف سکریٹری وویک کمار سنگھ سمیت محکمہ تعلیم کے سینئر افسران نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'سہارا' پٹنہ، 31 مئی 2018

ہندی صحافت کی تاریخ

نئی دہلی: ہندی صحافت کی پہلی تاریخ آج سے تقریباً 125 سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف بھارتیندو ہریش چندر کے پھوپھی زاد بھائی رادھا کرشن داس تھے۔ یہ کتاب کئی سالوں سے نایاب تھی اور اب اس

کی دوبارہ اشاعت ہو رہی ہے۔ کاشی ناگری پرچارنی سبھا سے 1984 میں شائع ہونے والے ہندی کے اس وقت کے اخباروں کی تاریخ کے مطابق 1845 میں شائع ہونے والے بنارس اخبار کو ہی ہندی کا پہلا اخبار مانا جاتا تھا لیکن 1930 کی دہائی میں پنڈت بنارسی داس چترویدی کی ادارت میں کولکاتہ سے شائع ہونے والے 'وشال بھارت' میں شائع ایک مضمون کے مطابق 'ادنت مارتنڈ' ملک کا پہلا ہندی اخبار تھا۔ یہ 30 مئی 1826 کو شائع ہوا تھا اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ 30 مئی کو ہی پورے ملک میں 'ہندی پترکاریتا دوس' منایا جاتا ہے۔ بہار یونیورسٹی کے صدر شعبہ ہندی رام نرنجن پریملندو نے اس تاریخ کو مرتب کیا ہے۔ اس کی کوئی بھی جلد ملک کی کسی لائبریری میں موجود نہ تھی۔ انھوں نے یو این آئی کو 'یوم صحافت' کے موقع پر بتایا کہ اس کتاب کی ایک جلد 'ناگری پرچارنی سبھا' میں موجود تھی لیکن وہ غائب

قومی اردو کونسل کا کتاب موبائل وین ٹور پروگرام

مہاراشٹر، گجرات اور راجستھان

	مقام	تاریخ
.1	اکولہ (مہاراشٹر)	28 تا 30 جون 2018
.2	امراؤتی (مہاراشٹر)	1 تا 3 جولائی 2018
.3	دریاپور (مہاراشٹر)	4 جولائی 2018
.4	اکوٹ (مہاراشٹر)	5 جولائی 2018
.5	شیگاؤں (مہاراشٹر)	6 تا 7 جولائی 2018
.6	ملکاپور (مہاراشٹر)	8 تا 9 جولائی 2018
.7	جلگاؤں (مہاراشٹر)	10 تا 13 جولائی 2018
.8	چالیس گاؤں (مہاراشٹر)	14 تا 15 جولائی 2018
.9	مالیگاؤں (مہاراشٹر)	16 تا 19 جولائی 2018
.10	دھولیہ (مہاراشٹر)	20 تا 21 جولائی 2018
.11	سکری (مہاراشٹر)	22 جولائی 2018
.12	سورت (گجرات)	23 تا 25 جولائی 2018
.13	انکلیشور (گجرات)	26 تا 27 جولائی 2018
.14	بھروچ (گجرات)	28 تا 30 جولائی 2018
.15	جمبوسر (گجرات)	31 جولائی 2018
.16	بڑودہ (گجرات)	1 تا 2 اگست 2018
.17	آنند (گجرات)	3 تا 4 اگست 2018
.18	احمد آباد (گجرات)	5 تا 6 اگست 2018
.19	ہمت نگر (گجرات)	7 تا 8 اگست 2018
.20	اُدے پور (راجستھان)	9 تا 10 اگست 2018
.21	اجمیر (راجستھان)	11 تا 12 اگست 2018
.22	جے پور (راجستھان)	13 تا 14 اگست 2018

کتابوں کی موبائل وین سے متعلق مزید جانکاری اس نمبر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

وی صدیق: موبائل نمبر 9990597329, (Watsapp No): 8920490683

ای میل v.siddique007@gmail.com, sales@ncpul.in

ہوگئی تھی جو انھیں آج سے 22 سال قبل بنارس کی کچوڑی گلی میں پٹری پر بکنے والی پرانی کتابوں میں ملی تھی جسے وہ مرتب کر کے از سر نو شائع کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کچوڑی گلی میں ملی اس کتاب میں ایک جلد کاشی ناگری پرچارنی سبھا کو دے دی گئی تھی۔ اسے 32 صفحات کی تمہید کے ساتھ شائع کرانے کا کام کیا گیا ہے۔ یہ راج کمل پرکاشن سے شائع ہو رہی ہے۔ اس میں 139 اخباروں و رسالوں کا ذکر ہے جو 1845 سے 1904 کی درمیانی مدت یعنی 55 برسوں میں شائع ہوئے۔ رادھا کرشن داس پیشے سے ٹھیکہ دار تھے اور انھوں نے ہی کاشی پرچارنی سبھا کی عمارت بنوائی تھی، ان کی پیدائش 1865 اور موت 1907 میں ہوئی تھی۔

انھوں نے 1900 میں بابو ہریش چندر کی سوانح بھی لکھی تھی۔ 1845 میں بنارس اخبار شیو پرساد ستارہ ہند کی مدد سے نکلا تھا۔ مسٹر پریملند و نے بتایا کہ کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے پہلی کتاب 'ہندی پتر کاریتا کا اتیہاس' بھی شائع کی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت میں بابو شیام سندر داس اور کارتک پرساد نے مدد کی تھی۔ یہ کتاب تقریباً 70 صفحات پر مشتمل تھی جو اب نئی تمہید کے ساتھ اور اس زمانے میں اس کتاب پر ہوئے تنقیدی جائزے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 31 مئی 2019

جامعات کے اردو نصاب ریختہ سائٹ پر اپلوڈ

نئی دہلی: نئے تعلیمی سال کے آغاز پر ریختہ فاؤنڈیشن نے اردو ادب کے طلبہ کے لیے ریختہ ویب سائٹ پر ایک ایسا گوشہ متعارف کرایا ہے جس میں ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جاری اردو نصابات شامل ہیں۔ طلبا اپنے تعلیمی ادارے کے نام پر کلک کرتے ہی جاری نصاب تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور شامل متون اور کتابوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر دستیاب اپنی نوعیت کی یہ پہلی نصابی سہولت ہے۔ ویب سائٹ پر موجود اس گوشے میں فی الحال ملک کے 71 تعلیمی اداروں میں رائج بی اے اور ایم کے نصاب شامل ہیں۔ اس فہرست میں مزید تعلیمی اداروں کو شامل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس فیچر کے استعمال اور اس سے استفادے کو آسان بنانے کے لیے تعلیمی اداروں کے نام سے متعلقہ نصاب پی ڈی ایف فارمیٹ میں اپلوڈ کیا گیا ہے جسے آف لائن بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ تعلیمی ادارے کے نام پر کلک کرتے ہی مکمل نصاب کھل جاتا ہے۔ طلبہ نصاب میں موجود کوئی بھی کتاب، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ اور انشائیہ صرف ایک کلک پر پڑھ سکتے ہیں۔ ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف کا کہنا ہے کہ 'ریختہ' نے یہ گوشہ نصابی مواد تک رسائی میں آنے والی دشواریوں کے پیش نظر ترتیب دیا ہے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 22 مئی 2018

دہلی :

فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام وزارت ثقافت، حکومت ہند کے تعاون سے فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر بعنوان 'انسانوں جانوروں اور پیڑ پودوں کو شدید نقصان پہنچانے والے خرد بینی کیڑے' کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت جسٹس بدر دریز احمد، سابق چیف جسٹس، جموں وکشمیر نے کی۔ سالانہ فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر دیتے ہوئے زوالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے کہا کہ کیڑوں کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں حالانکہ یہ کیڑے ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیڑوں کی 37 ایسی قسمیں ہیں، جو انسانوں میں پائی جاتی ہیں اور ان سے ہمیں شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ایسے کیڑے ہر جگہ اور ہر زمین میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے فصلوں کو بھی بہت نقصان پہنچتا ہے۔ میں نے تیس چالیس برسوں تک ان کیڑوں کا تعاقب کیا ہے۔ جو ہمیں نظر نہیں آتے، ان کیڑوں کی وجہ سے سالانہ تقریباً بیس ہزار سے پچاس ہزار تک اموات ہوئی ہیں۔ یہ کیڑے آنکھوں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں اور ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی جسٹس بدر دریز احمد، سابق چیف جسٹس جموں وکشمیر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج کا لیکچر سائنسی موضوع پر تھا۔ ایسے موضوعات پر مزید پروگرام ہونے چاہئیں۔ سائنس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ لیکچر دیگر پروگراموں کی طرح نہیں ہے بلکہ بہت منفرد ہے۔ اس لیکچر کے ذریعے ہم مرحوم فخرالدین علی احمد صاحب کو یاد کر رہے ہیں۔ آج کا یہ لیکچر بہت اہم ہے۔ سائنس کی دنیا ہمیں بتاتی ہے کہ ہم ابھی کتنے پانی میں ہیں۔ یہ زندگی جتنی پراسرار ہے اس کا علم اب تک ہمیں نہیں ہوا ہے۔ انسان جب سے ہے، تب سے اسرار کا انکشاف ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے تعارفی اور استقبالیہ کلمات کے دوران کہا کہ یہ لیکچر ملک کے سابق صدر جمہوریہ اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے بانی فخرالدین علی احمد کے یوم پیدائش کے موقعے پر ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ اس جلسے میں بڑی تعداد میں مختلف علوم و فنون کے لوگ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2018

یو این آئی اردو سروس کی 26 ویں سالگرہ

نئی دہلی (یو این آئی) ہندوستان میں کثیر لسانی خبر رساں ایجنسی یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کی اردو سروس 5 جون کو 26 سال پہلے شروع کی گئی تھی۔ اس وقت کے وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ نے 5 جون 1992 کو اس سروس کا آغاز کیا تھا۔ اردو دنیا میں آج بھی یو این آئی اردو سروس واحد ایسی خبر رساں ایجنسی ہے جو قومی اردو اخبارات کو تمام شعبہ ہائے زندگی کی خبریں فراہم کرتی ہے۔ یو این آئی اردو نے اپنا سفر 5 سبس کرائبروں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ آج ان سبس کرائبروں کی تعداد 400 سے زیادہ ہے۔ دہلی، یوپی، مدھیہ پردیش، بہار، بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک، تلنگانہ، آندھرا پردیش اور جموں وکشمیر کا بڑے پیمانے پر احاطہ کرنے والے اردو اخبارات، ٹی وی چینلوں کو اردو میں خبریں فراہم کرنے میں یو این آئی کا اہم کردار ہے۔ 2013 میں 12 اگست کو یو این آئی کی اردو ویب سائٹ کا اس وقت کے مرکزی وزیر کے رحمٰن خان نے مرکزی وزیر آسکر فرنانڈیز، شری کانت جینا اور منیش تیواری کی موجودگی میں افتتاح کیا تھا۔ یو این آئی کے ایڈیٹر انچیف اشوک اپادھیائے کا کہنا ہے کہ خبروں میں خبر نگار کی اپنی فکر کا دخل یا تجزیاتی آمیزش نہیں ہونی چاہیے اور یہی یو این آئی کی پہچان ہے۔ کولکاتا میں اردو ایڈیٹر کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر اپادھیائے نے کہا تھا کہ اگر صحافی خبروں کو اپنی فکر سے متاثر کرتا ہے تو وہ صحافت کو نقصان پہنچاتا ہے جس کا معاشرے پر منفی اثر پڑتا ہے۔ انھوں نے اردو صحافت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یو این آئی ملک کی دیگر زبانوں میں بھی سروس شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور یہی اس ملک میں زبانوں کے درمیان رابطے کا حسن ہے۔ ہندی زبان کو بھی اردو کی قربت سے فیض پہنچا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کیو ایس ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ میں سرفہرست

نئی دہلی (یو این آئی) کامیابی کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے معروف کیو ایس ورلڈ یونیورسٹی رینکنگ میں بھی جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ کیو ایس رینکنگ 2019 میں ہندوستان کی 24 یونیورسٹیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے، جن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو 13 واں رینک ملا ہے۔

جامعہ کو کیو ایس رینکنگ 800-751 میں رکھا گیا ہے، اس یونیورسٹی کو پہلی مرتبہ کیو ایس رینکنگ میں جگہ ملی ہے۔ یونیورسٹی کو ملے اس بڑے اعزاز پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ گزشتہ کچھ سالوں کے درمیان جامعہ نے تحقیق، تعلیم و تعلم اور اپنے تحقیقی مقالات اور ریسرچ پر کافی دھیان دیا ہے جس کے مثبت اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ این آئی آر ایف اور ٹائمز ایرا ایجوکیشن سمیت ملکی سطح پر اور عالمی پیمانہ پر بھی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ اب ہم نے عالمی رینکنگ میں اہم جگہ بنا لی ہے ایسے میں ہماری ذمے داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ اب جامعہ کے کارکنان کے اوپر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جامعہ کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے مزید محنت کریں اور اس کی بہتری کے امکانات پر بھی غور و خوض کریں۔

لندن میں واقع کیو ایس نے 2019 کی اپنی رینکنگ میں 85 ملکوں کی 1000 یونیورسٹیوں کو جگہ دی ہے۔ اپنی

سالانہ رپورٹ میں انھوں نے کہا ہے کہ ملک کے کچھ معروف اداروں نے حیران کن مظاہرہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان کی 24 یونیورسٹیوں نے اس رینکنگ میں جگہ پائی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آئی کیو اے سی کے ڈائرکٹر پروفیسر شفیق احمد انصاری نے کہا کہ سبھی شعبہ جات کے فعال اساتذہ اور کارکنان کی وجہ سے یہ اعزاز حاصل ہوا۔

اردو مضمون کے امتحان میں طلبا کی نمایاں کارکردگی

نئی دھلی: سی بی ایس ای کے ذریعے کل 12 ویں کلاس بورڈ امتحان کے نتیجوں کا اعلان کردیا گیا ہے۔ حکیم فقیر اللہ سوسائٹی فار سوشل ویلفیئر (این جی او) کے زیر انتظام چلنے والے اردو زبان تعلیمی سینٹر واقع راجیو نگر، منڈولی سے امسال بھی طالبات کا سی بی ایس ای 12 ویں کلاس کا پرائیویٹ طور سے اردو مضمون کے امتحان کے لیے رجسٹریشن کرایا گیا تھا، اس سینٹر کی طالبات نے اردو مضمون کے امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اردو مضمون کے نتیجے میں سینٹر کی طالبہ ناظمین بنت شمع پروین شہراب خاں نے اردو مضمون کے پرچہ کے کل نمبر 100 میں سے 89 نمبر وA2 گریڈ جبکہ رخسار پروین بنت پروین ابرار احمد نے 82 نمبر و بی 1 گریڈ حاصل کر کے سینٹر، سینٹر صدر اور اپنے والدین کا نام روشن کیا ہے جبکہ سینٹر کی ہی شاہین پروین بنت شمیمہ بیگم شکیل احمد نے 72، نیہا پروین بنت شاکرہ بیگم عبدالعزیز نے 63، کومل چودھری بنت شبنم سرتاج علی نے 60 نمبر حاصل کر کے اردو مضمون سے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مئی 2018

اترپردیش:

قومی اتحاد اور بین مذہبی مفاہمت میں سرسید کی خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سرسید اکادمی کے زیر اہتمام 'قومی اتحاد اور بین مذہبی مفاہمت میں سرسید کی خدمات' موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا آغاز ہوا جس میں مقررین نے سرسید کے وژن، ان کی اصلاحی جدوجہد اور بین مذہبی مفاہمت کو آج کے حالات کی عین ضرورت قرار دیتے ہوئے اس کی افادیت سمجھنے اور اسے اپنانے پر زور دیا۔ سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر سید علی محمد نقوی نے کہا کہ سرسید نے بین مذہبی مفاہمت و تعلقات پر نہ صرف زور دیا بلکہ سبھی مذاہب کے رہنماؤں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھتے ہوئے کشادہ قلبی، رواداری، گفت و شنید اور مکالمہ کو برت کر دکھایا۔ پروفیسر نقوی نے کہا کہ سرسید نے ہمیشہ یہ کہا اور لکھا کہ 'قوم' کا تصور ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور ان سبھی مذاہب کے پیروکاروں پر مشتمل ہے جو اس ملک میں بستے ہیں۔ سرسید نے ہندو اور مسلمان کو ایک دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تعبیر کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کا مشن مذہبی ہم آہنگی، رواداری اور افہام و تفہیم کا تھا، انھوں نے اس ملک سے محبت کا پیغام دیا اور یہ سبھی چیزیں ان کی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ اے ایم یو کے پرووائس چانسلر پروفیسر تبسم شہاب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ عدم رواداری سماج کے لیے ایک خطرہ ہے۔ سرسید نے اپنے نبیرے کی رسم بسم اللہ، راجہ جے کشن داس کی گود میں کرائی۔ پروفیسر شہاب نے کہا کہ حسن اخلاق، کشادہ قلبی، علم کی تلاش اور ڈائیلاگ و مکالمہ سرسید احمد خاں کی زندگی کا خاصہ تھے۔

'بین مذہبی مفاہمت میں سرسید کی خدمات' کے موضوع پر دو روزہ منعقدہ سمینار کے دوسرے دن تین سیشن ہوئے جس میں ماہرین نے الگ الگ موضوعات پر مقالے پیش کر کے سرسید احمد خاں کی شخصیت و کارناموں کے مختلف جہات سے روشناس کرایا۔ اے ایم یو کے شعبۂ تاریخ کے صدر پروفیسر سید علی ندیم رضاوی، ڈاکٹر مظفر حسین سید، پروفیسر سید عزیز الدین حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر گلفشاں خاں، پروفیسر عبیداللہ فہد، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر سمیع اختر، پروفیسر صغیر افراہیم وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔

'قومی اتحاد اور بین مذہبی مفاہمت میں سرسید کی خدمات' موضوع پر منعقدہ سمینار کی اختتامی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شان محمد نے کہا کہ 1857 کے ہولناک واقعات کی روداد پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے، انگریزوں نے مسلم امرا و روسا کے محلات زمین بوس کر دیے تھے، ہمارے مجاہدین آزادی کو تہ تیغ کر دیا، سرسید احمد خاں ان واقعات کے عینی شاہد تھے، انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کیے بغیر ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی مغلوبیت و محکومیت ختم نہیں ہو سکتی۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم اس کی روشنی میں مستقبل کا لائحۂ عمل تیار کریں۔ سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر سید علی محمد نقوی نے آخر میں خطاب کرتے ہوئے قومی سمینار میں آمد کے لیے پروفیسر اختر الواسع اور دیگر سبھی معاونین کا اور سرپرستی کے لیے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مئی 'میرا وطن'، 10 مئی 2018

ظفر گورکھپوری کی یاد میں تقریب کا انعقاد

گورکھپور: انجمن ترقی اردو ہند شاخ معظم آباد (گورکھپور) کی جانب سے 'بیاد ظفر گورکھپوری' کی ایک تقریب میں اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے انعام یافتگان کو سند اعترافیہ پیش کیا گیا۔ خیال رہے کہ اکادمی نے 17-2016 کے انعام اسکیم میں شہر معظم آباد (گورکھپور) کے سات لوگوں کو نوازا ہے۔ جو غالباً شہر گورکھپور کے لیے ایک تاریخ ہے۔ اس تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے صدر انجمن معروف معالج ڈاکٹر عزیز احمد نے کہا کہ گورکھپور ادبی اور لسانی اعتبار سے مجنوں، پریم چند اور فراق کا شہر رہا ہے۔ یہاں کے تخلیق کاروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ آج بھی گورکھپور کی روایتوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ یہ تاریخی روایت جاری و ساری رہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر محمد شاہد حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ میرا بھی تعلق اسی دبستان گورکھپور سے ہے اور یہ میری خوش بختی ہے کہ میں اپنے شہر کے ان باصلاحیت تخلیق کاروں کی 'تقریب سند اعترافیہ' میں شامل ہوں۔ شہر کی نامور شخصیت جسٹس کلیم اللہ خاں مہمان معزز نے اپنی تقریر میں کہا کہ انجمن ترقی اردو ہند، شاخ معظم آباد (گورکھپور) نے ان انعام یافتگان کی حوصلہ افزائی کر کے ایک بڑی روایت کو اعتبار بخشا ہے۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ دبستان گورکھپور اس دور انحطاط میں بھی اعلیٰ ادبی قدروں کی آج بھی نمائندگی کر رہا ہے۔ معروف شاعر و ناظم مشاعرہ ڈاکٹر کلیم قیصر نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر محمد شعیب، ڈاکٹر درخشاں تاجور، عبدالحئی پیام، ڈاکٹر اشفاق احمد عمر، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، جناب نسیم سلیم پوری، جناب عثمان غنی، ڈاکٹر ریحانہ بیگم کو مہمانان کرام نے سند اعترافیہ اور شال پیش کر کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: اشفاق حق، انجمن ترقی اردو ہند، گورکھپور، 6 مئی 2018

قرۃ العین حیدر: حیات و خدمات

بجنور: قادری ادبی فاؤنڈیشن دہلی کے مالی تعاون سے انجمن ترقی اردو شاخ ضلع بجنور (رجسٹرڈ) اترپردیش کے زیر اہتمام 2018 بعنوان 'قرۃ العین حیدر: حیات و

خدمات' ایک روزہ قومی سمینار انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت صدر انجمن اردو ترقی خورشید محسن زیدی ایڈوکیٹ اور زاہد حسین نے کی۔ معمر بزرگ شاعر شوق امروہوی نے مہمان ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔ محمد آفتاب پرنسپل مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ شاعر شفق بجنوری کے ذریعے نعت رسول سے سمینار کا آغاز ہوا۔ اس موقعے پر ملک کے مختلف شہروں سے آئے سبھی مہمان مقالہ نگاروں کو نشان اعزاز و اسناد سے نوازکر ان کی عزت افزائی کی گئی۔ جبکہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر رباب انجم، ارشد ندیم کرت پوری، ادیب وصحافی حبیب سیفی دہلی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر سیدہ سبطین، ڈاکٹر شائستہ، ذہین گل کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامت تقریب کے کنوینر و ادیب امیر نہٹوری نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 مئی 2018

اردو اکادمی میڈیا سینٹر کا افتتاح

لکھنؤ: اردو ایسی زبان ہے جو کڑواہٹ مٹاتی ہے۔

ہندی سے اس کا وہی رشتہ ہے جو دو بہنوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اردو کو فروغ دینا ہے، اس کی ترویج و توسیع کرنا ہے تو مذہبیت اور جذباتیت سے اوپر اٹھ کر سوچنا اور کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما نے بحیثیت مہمان خصوصی اردو اکادمی کے میڈیا سنٹر کے افتتاح کے موقعے پر کیا۔

نائب وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے اس لیے اسے کسی مذہب سے نہ جوڑا جائے۔ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں اور ان میں بہت پیار ہے مگر یہی پیار و محبت ان کے چاہنے اور لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کے درمیان بھی ہونا چاہیے۔ دنیش شرما نے کہا کہ کسی بھی زبان کے فروغ کے لیے خاموشی سے، جذباتی ہوئے بغیر، حقوق، اختیارات اور سیاست کے چکر میں پڑے بغیر کام کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو بے حد شیریں زبان ہے اس لیے اس کا استعمال دوریوں کو کم کرنے کے لیے کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ اردو کے پاس ادبا، شاعروں اور ماہرین کا خزانہ ہے مگر ابھی تک ان کا صحیح استعمال نہیں ہو پایا ہے۔ قبل ازیں، سابق وزیر اور سینئر بی جے پی رہنما لال جی ٹنڈن نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ یہ سینٹر لکھنؤ اور محبان اردو کو ریاستی حکومت کی جانب سے ایک نایاب تحفہ ہے جو اردو کی ترقی اور فروغ میں اور باصلاحیت اردو صحافی تیار کرنے میں اہم رول ادا کرے گا۔ سابق کارگزار وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عمار رضوی نے اکادمی کو کمرشیل اور اقتصادی طور پر مضبوط بنانے کے لیے اقدام کرنے پر زور دیتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ کتابوں کی فروختگی کا مناسب انتظام کریں جس کے لیے لکھنؤ میں کم از کم دو سیلز کاؤنٹر بنائے جائیں۔ قبل ازیں، اکادمی کی چیئرپرسن پروفیسر آصفہ زمانی نے استقبالیہ خطاب کے دوران اکادمی کی اہم سرگرمیوں اور حصولیابیوں پر مختصر بات کی۔ پروگرام کی نظامت خلیل خان نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مئی 2018

'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' کے عربی ترجمے کی بیروت سے اشاعت

علی گڑھ: عہد سرسید میں علامہ شبلی نعمانی نے ایم او اے کالج میں پروفیسر عربی و فارسی کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دینے کے علاوہ تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ایام علی گڑھ کی ان کی اولین تصنیف 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' ہے، جسے انھوں نے اصلاً سرسید کی فرمائش پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس (منعقدہ 27 دسمبر 1887 بمقام لکھنؤ) میں مقالے کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اسے سرسید نے بڑے اہتمام سے علاحدہ رسالے کی صورت میں قومی پریس، لکھنؤ سے جون 1888 میں طبع کرایا اور اس کی کاپیاں کانفرنس کے ممبران اور کالج کے بہی خواہوں کو ارسال کیں۔ سرسید نے اس پر تفصیلی ریویو بھی لکھا تھا جو علی گڑھ انسی ٹیوٹ گزٹ کی زینت بنا۔

حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ 'الحركة العلميه و كيف طورها الاسلام' کے نام سے دار الكتب العلميه، بیروت سے شائع ہوا ہے۔ اس کے عربی مترجم ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) ہیں۔ اس عربی کتاب میں سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کے مقالے 'علامہ شبلی کے ایام علی گڑھ کی اولین تصنیف مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم: ایک تعارفی مطالعہ' کا ترجمہ بھی شامل ہے جو 'معارف' کے شبلی نمبر (نومبر و دسمبر 2014) میں شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 مئی 2018

ادبی محفل

میرٹھ: اسرار گاندھی معاصر اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے انسان کے

دوہرے پن کو پیش کیا ہے۔ انسانی نفسیات پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو شعبۂ اردو میں معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی کے اعزاز میں منعقد ادبی محفل میں بطور صدر خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسرار گاندھی کی کہانیاں موجودہ سماج کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے انھیں فکشن ایوارڈ کے لیے منتخب کر کے ایک اہم کام کیا ہے۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز محمد نجم الدین نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بعد ازاں مہمانوں کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے اتر پردیش اردو اکادمی کے ایگزیکیوٹیو ممبر کنور باسط علی شریک ہوئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ اسرار گاندھی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ اسرار گاندھی ایک معتبر اور مستحکم آواز ہے۔ ان کے افسانوں کا اصل محور سماج کا دوسرا چہرہ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔ پروگرام کے آخر میں یونائیٹڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن کے صدر اور ہیمنت گوئل نے اسرار گاندھی کو شال اور پروفیسر اسلم جمشید پوری اور کنور باسط علی نے ٹرافی پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مئی 2018

بہار:

جشن اردو

پٹنہ: وزیر تعلیم کرشن نندن پرساد ورما نے کہا کہ ریاستی حکومت دوسری سرکاری زبان اردو کے فروغ کے لیے

کوشاں ہے۔ حکومت فروغ اردو کے لیے کسی بھی سطح پر کی جاری کوششوں کو ہر ممکن تعاون دے گی۔ جناب ورما محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام شری کرشن میموریل ہال میں منعقد جشن اردو کے افتتاحی پروگرام سے خطاب کر رہے تھے۔ وزیر تعلیم جناب ورما نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ان کی یہ منشا ہے کہ ریاست کے سبھی سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کو لازمی بنایا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی پرائیویٹ اسکولوں میں بھی اردو کی تعلیم کا مناسب نظم کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ اس کے عملی نفاذ کی کوشش لگاتار جاری رہنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا فروغ اور ترقی صرف حکومت کی سطح سے ہی ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سبھی اردو دانوں کو سنجیدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ اردو کے تعلق سے حال کے برسوں میں لوگوں کے نظریات میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ غیر اردو دانوں کے اندر بھی اردو سیکھنے کا جذبہ بیدار ہوا ہے اور لوگ اردو سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اردو ڈائرکٹوریٹ اور اس کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی کی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ اور عملی نفاذ کے لیے ڈائرکٹوریٹ کی سطح پر سرگرم اور کامیاب کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے ڈائرکٹوریٹ سے وابستہ سبھی لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ وزیر تعلیم جناب ورما نے کہا کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک مکمل تہذیب کا نام ہے۔ اردو کی شیریں زبانی کے سبھی لوگ قائل ہیں۔ اس سے قبل محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے پرنسپل سکریٹری ارون کمار سنگھ نے کہا کہ اردو ڈائریکٹوریٹ کے قیام کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈائرکٹوریٹ اس سمت میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز کریمی نے اس موقعے پر کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی خصوصی دلچسپی کے بعد سال 2012 میں جشن اردو پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس کے بعد ہر سال جشن اردو پروگرام کا عظیم الشان طریقے سے انعقاد کیا جارہا ہے جس میں سبھی اردو دوستوں کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ جشن اردو کا مقصد اردو کے فروغ اور غیر اردو دانوں کے درمیان اردو کو مقبول بنانے کے لیے ماحول سازی ہے۔ افتتاحی پروگرام سے جشن بہار ٹرسٹ کی بانی محترمہ کامنا پرساد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی اظہار خیال کیا۔ افتتاحی اجلاس میں اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر شفیع مشہدی، ہندی پرگتی سمیتی کے صدر ستیہ نارائن، بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کے چیئرمین الحاج محمد ارشاد اللہ، شیعہ وقف بورڈ کے چیئرمین ارشاد علی آزاد، بہار اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین الحاج محمد الیاس عرف سونو بابو، راجیو سبھا رکن ڈاکٹر احمد اشفاق کریم، محکمہ داخلہ، جنرل ایڈمنسٹریشن اور اقلیتی فلاح کے پرنسپل سکریٹری عامر سبحانی بھی شریک ہوئے۔ افتتاحی اجلاس میں کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے ہزاروں سامعین کو محظوظ کیا۔

دو روزہ جشن اردو پروگرام کے دوسرے دن تین الگ الگ اجلاسوں میں مختلف موضوعات کے حوالے سے اردو زبان کے سامنے درپیش مسائل اور اس کے حل کے ساتھ ساتھ فروغ اردو کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ پہلے اجلاس میں 'گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے' کے تعلق سے اردو زبان کے فروغ میں اردو صحافت کے کردار کے موضوع پر ملک کے معروف صحافی اور کالم نویسوں نے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس کی صدارت مشہور و معروف شاعر معصوم مرادآبادی نے کی جبکہ مہمان خصوصی پروفیسر علیم اللہ حالی تھے۔ نظامت فخرالدین عارفی نے کی۔ ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں صحافت کا کردار بھی کافی اہم ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کے ساتھ ساتھ ٹی وی چینل کے توسط سے لوگوں میں اردو کے سلسلے میں دلچسپی بڑھی ہے۔ خوشگوار پہلو یہ ہے کہ آج کی اردو صحافت عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی ہے جس سے اردو کی ترویج میں مدد مل رہی ہے۔ اس اجلاس میں سہیل انجم، ایس ایم اشرف فرید، راشد احمد، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر سید احمد قادری، احمد جاوید، سید شہباز اور محفوظ عالم نے گرانقدر خیالات کا اظہار کیا۔ دوسرے اجلاس میں 'یہ بستی ادب بھی بازار تن ہے' کے تعلق سے بہار کا ادبی منظرنامہ کے موضوع پر معروف ادیبوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی جبکہ مہمانان اعزازی پروفیسر عبدالصمد اور مشتاق احمد نوری تھے۔ نظامت کی ذمے داری فخرالدین عارفی نے بحسن وخوبی ادا کی۔ اجلاس میں بہار کے نسائی ادب پر پروفیسر قمر جہاں نے سیر حاصل گفتگو کی جبکہ غلام سرور کی صحافت کے موضوع پر معروف صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے انقلابی گفتگو کی۔ وہیں بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس، مسائل اور امکانات کے موضوع پر ڈاکٹر صفدر امام قادری نے عالمی اور پر مغز گفتگو کی جبکہ لطف الرحمن کا ادبی سرمایہ کے موضوع پر ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے معلوماتی باتیں کہیں۔ 'بہار میں اردو تحریک ایک جائزہ' کے موضوع پر معصوم عزیز کاظمی نے بہت ہی موثر انداز میں گفتگو کی۔ تیسرے اجلاس میں پھول کھلے ہیں گلشن گلشن کے تعلق سے آزادی کے بعد بہار میں اردو ادب کے موضوع پر مقالے پیش کیے گئے۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی جبکہ مہمان خصوصی تھے شفیع مشہدی اور مہمان اعزازی تھے شوکت حیات۔ اس اجلاس میں استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ جشن اردو کا مقصد قومی سطح پر لوگوں میں فروغ اردو کے لیے بیداری کا احساس دلانا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، حقانی القاسمی، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے مختلف موضوعات پر مفید اور معلوماتی مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس میں شوکت حیات، میجر بلبیر سنگھ بھسین اور شفیع مشہدی نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے صدارتی خطاب

میں موضوع کے تعلق سے مختلف نکات کا احاطہ کیا۔ چوتھے اجلاس میں اردو جسے کہتے ہیں کہ تعلق سے 'میں اردو ہوں' کے عنوان سے ڈرامہ پیش کیا گیا۔ ہندی اور اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنؤ (اترپردیش) کے زیر اہتمام دہلی اور لکھنؤ کے مشہور فنکاروں کی ڈرامائی پیشکش نے حاضرین کا دل جیت لیا۔ وہیں اختتامی اجلاس میں رادھیکا چوپڑا نے شام غزل میں اپنی غزل گوئی سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 29،30 اپریل 2018

پنجاب:

شام افسانہ کا انعقاد

مالیرکوٹلہ: پنجاب میں افسانہ کلب کی جانب سے ایک شاندار شام افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر اسرار گاندھی الہ آباد سے تشریف لائے۔ نظامت کے فرائض کلب کے جنرل سکریٹری ناصر آزاد نے ادا کیے۔ اس کے بعد محمد بشیر مالیرکوٹلوی کے ناول 'جسی' کا اجرا اور عمر فاروق کی بچوں کے لیے کہانیوں کی کتاب 'پڑوسی' کا اجرا ہوا۔ دونوں کتابوں کے اجرا کے بعد ڈاکٹر ندیم احمد نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں ناول 'جسی' کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے 'جسی' ناول پر مقالہ پڑھنے کے بجائے زبانی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ بشیر مالیرکوٹلوی نے جس ڈھنگ سے پنجاب کی چھوٹی چھوٹی رسموں اور روایتوں کو پیش کیا ہے، اردو ادب میں آج تک نہیں ہوا۔ آپ نے بچوں کے ادب کے بارے میں بھی بات کی۔ بعد میں افسانوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ سب سے پہلے جناب اسحٰق رکن کلب نے اپنا طنز و مزاح سے بھرپور مضمون پیش کیا۔ سکریٹری کلب جناب ناصر آزاد اور صدر کلب ارشد منیم نے اپنے اپنے افسانے پیش کیے۔ آخر میں سینئر افسانہ نگار جناب اسرار گاندھی نے اپنا افسانہ 'جنگل سے پرے' پڑھ کر داد وصول کی۔ آخر میں صدر کلب جناب ارشد منیم نے حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: عثمان رسول، مالیرکوٹلہ، 24 مئی 2018

جموں و کشمیر:

'اردو زبان' کو پرائمری سطح تک لازمی مضمون بنانے کا اعلان

سری نگر: جموں و کشمیر حکومت نے ریاست کی سرکاری زبان 'اردو' کی ترقی و ترویج کی سمت میں ایک اور بڑا اور غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے ریاست کے تمام سرکاری و

نجی اسکولوں میں 'اردو زبان' کو پرائمری سطح تک لازمی مضمون بنانے کا اعلان کردیا ہے۔ اسکولی تعلیم، حج و اوقاف اور قبائلی امور کے وزیر چودھری ذوالفقار علی نے یو این آئی سے بات کرتے ہوئے کہا 'ہم نے ریاست کے تمام سرکاری و نجی اسکولوں میں اردو زبان کو پرائمری سطح تک لازمی مضمون بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'

انھوں نے مزید کہا کہ ریاست میں امسال محبوبہ مفتی حکومت کی طرف سے 'اردو زبان' کے فروغ کے لیے اٹھایا جانے والا دوسرا قدم ہے۔ اس سے قبل 23 فروری کو 'اردو' کی ترقی و ترویج کے لیے 'جموں و کشمیر کونسل برائے فروغ اردو زبان' نامی ادارے کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ یو این آئی کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جہاں وادی کشمیر کے بیشتر سرکاری و نجی تعلیمی اداروں میں 'اردو زبان' کو دسویں جماعت تک ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جارہا ہے، وہیں جموں اور لداخ کے بیشتر سرکاری و نجی تعلیمی اداروں میں ریاست کی سرکاری زبان کو نہیں پڑھایا جارہا ہے۔ ایک سرکاری عہدیدار نے بتایا 'اردو کو ریاست کے تمام اسکولوں میں پرائمری سطح تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے سے نہ صرف ریاست کی سرکاری زبان کو فروغ ملے گا بلکہ اس زبان میں ڈگریاں حاصل کرچکے نوجوانوں کو روزگار بھی فراہم ہوگا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی

مہاراشٹر:

گراما لوک تقریب کا انعقاد

اورنگ آباد: ضلع اورنگ آباد کے داود نگر میں 10 مئی کو ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے گراما لوک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت حافظ خورشید نے کی جبکہ نظامت کے فرائض یوسف جمیل یوسف نے انجام دیے۔ اس خوبصورت تقریب کا انعقاد ساحر داودنگری کی سرپرستی میں کیا گیا۔ یہ تقریب داود نگر کے مولانا حالی اردو لائبریری کے احاطے میں منعقد ہوئی۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کی اس خوبصورت پہل کی لوگوں نے کافی ستائش کی۔ حافظ خورشید نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے اٹھایا گیا یہ ایک غیر معمولی قدم ہے جس کے ذریعے قصبات اور گاؤں میں بسنے والے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم ملا ہے جس کے ذریعے گاؤں اور دیہات کے فنکار بھی اپنی فنکاری کا جوہر دکھا سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ شہر میں رہنے والے لوگوں کو اکثر مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں مگر چھوٹے شہروں، قصبات اور گاؤں میں بسنے والے لوگوں کو بہت کم موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کو نکھار سکیں اور منظر عام پر لا سکیں ایسے میں ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے گراما لوک پروگرام کا انعقاد یقیناً ایک قابل مبارک باد پہل ہے۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر آر پی ساہو نے کہا کہ داود نگر جیسے چھوٹی سی جگہ میں ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے اتنا خوبصورت پروگرام سجایا گیا ہے میں ساہتیہ اکادمی کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔

روزنامہ 'صدائے انصاری' مہاراشٹر، 24 مئی 2018

مدھیہ پردیش:

جدید تعلیم اور سرسید احمد خاں

گوالیار: غربت سے نکلنے کا صرف ایک راستہ 'جدید تعلیم' ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنے کا بھی ایک ہی راستہ جدید تعلیم

ہے۔ مندرجہ بالا خیالات کا اظہار ڈاکٹر ستیش سنگھ سکروار نے مدرسہ خلیل میں باغبان سکھا سمیتی کی جانب سے منعقدہ پروگرام 'جدید تعلیم اور سرسید احمد خاں' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج گوالیار کے متعدد خیالات و جماعت کے لوگ یہاں انھیں یاد کرکے اپنے آبا و اجداد کو یاد کرنے کی جو پہل کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ سرسید احمد خاں نے جس طرح قوم کو تعلیمی بیداری لانے کے لیے جدوجہد کی۔ آج بھی ویسی ہی تعلیمی جدوجہد کرنے کا وقت ہے۔ پروگرام کی صدارت باغبان سکھا سمیتی کے صدر محمد چاند رامینی نے کی۔ سمیتی کی جانب سے ڈاکٹر سکروار کو اردو نوازی کے لیے ایک شیلڈ پیش کیا گیا۔ پروگرام کے آخر میں 4 درجن سے زیادہ طلبا کو سرسید تعلیم ایوارڈ سے نوازا گیا۔

رپورٹ: محمد چاند رامین، گوالیار، مئی 2018

یادِ اقبال

بھوپال: علامہ اقبال ادبی مرکز اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کی جانب سے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر علامہ اقبال کی 80 ویں برسی پر دو دن کا یادِ اقبال پروگرام کا انعقاد رویندر بھون، بھوپال میں کیا گیا جس میں پہلے دن

(مورخہ 26 اپریل 2018) انٹرنیشنل سمینار اکادمی کے ذریعے شائع کتب اور اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کتب کا اجرا کیا گیا، اور شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے علامہ اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے شروع میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی نے استقبالیہ تقریر میں پروگرام کے غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ انٹرنیشنل سمینار میں جناب اشفاق حسین، کنیڈا نے مضمون 'اقبال، اُفق دانش کی ایک روشن لکیر'، ڈاکٹر حنا افشاں رضوی کانپور نے 'اقبال کی شاعری میں وجود زن کا تصور' اور ڈاکٹر احسن اعظمی بھوپال نے 'اقبال اور نسل نو' پر اپنے مضامین پڑھے۔ جناب اشفاق حسین نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ پیغام تمام عالم انسانیت کے لیے ہے۔ ڈاکٹر حنا افشاں رضوی نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ علامہ کی شاعری صرف شاعری نہیں ایک مکمل نظام حیات پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر احسان نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ علامہ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر ہونے کے ساتھ قانون کے ماہر، بلند پایہ فلسفی بالخصوص اسلامی فلسفے کے نکتہ داں، مفکر و دانشور تھے۔ عالمی سمینار کی صدارت جناب حسن مسعود، بھوپال نے اور پروگرام کی نظامت محترمہ رشدا جمیل بھوپال نے کی۔ سمینار کے بعد کنیڈا سے محترم اشفاق حسین، امریکہ سے محترم فرحت شہزاد، دلی سے محترمہ سلمہ شاہین، رائے بریلی سے محترمہ تارہ اقبال، بھوپال سے محترم ظفر صہبائی، محترم ضیا فاروقی، محترم عارف علی، عارف اور قاضی ملک نوید نے علامہ اقبال کو اپنا منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس منظوم مشاعرے کی صدارت بھوپال کے بزرگ شاعر محترم ظفر نسیمی نے اور نظامت کے فرائض جلالپور کے محترم ہاشم رضا جلالپوری نے انجام دیے۔ اس موقعے پر اکادمی کے ذریعے شائع جناب نعیم کوثر، بھوپال کی کتاب 'کہرے کا چاند' (افسانوی مجموعہ) اور جناب اسحاق اثر، اندور کی کتاب 'یہ دل کی کائنات ہے' (آزاد نظمیں) کی رسم اجرا ہوئی۔ اکادمی کے مالی تعاون سے شائع 6 کتابوں کا بھی اجرا ہوا جن کے نام ہیں: آواز کا پتھر (شعری مجموعہ)، نعیم اختر خادمی، برہانپور، دیوان اعظم، ڈاکٹر اعظم، بھوپال، بھوپال کہانیاں (طنزیہ و مزاحیہ)، ڈاکٹر انور محمد خاں، بھوپال، کسک (شعری مجموعہ) محمد حنیف دردسرونجی، سرونج، شور دروں (شعری مجموعہ) مجاز آشنا، برہانپور اور نوید سحر (شعری مجموعہ) حامد حسن شاد بھوپال۔

پریس ریلیز: سکریٹری ایم پی اردو اکادمی، بھوپال، 18 مئی 2018

اردو اکادمی دہلی کے تقسیم انعامات 2017 کا منظر

اعزاز و اکرام:

چھ کل ہند اور تیرہ صوبائی سطح کے اعزاز

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام مالی سال 18-2017 کی 'تقریب اعزاز' گک کٹ بھون کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ جناب منوج شریواستو، پرنسپل سکریٹری، محکمہ ثقافت جناب اشوک شاہ، پرنسپل سکریٹری، سماجی انصاف ومحکمہ فلاح و بہبود معذوران، محترمہ انوراوھا شنکر، اے ڈی جی (ایڈمنسٹریشن) مدھیہ پردیش پولس، جناب اجات شترو شریواستو، کمشنر، بھوپال زون، جناب اکشے کمار سنگھ، ڈائریکٹر، ثقافت کی باوقار موجودگی میں اعزاز دیے گئے۔ اس موقعے پر محکمہ ثقافت کے پرنسپل سکریٹری جناب منوج شریواستو نے کہا کہ خاتون ادیبہ کے نام پر ملک کی کسی بھی اکادمی میں اعزاز نہیں ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی سنسکرتی وبھاگ کے ذریعے پچھلے دو سال سے نواب شاہجہاں بیگم اور سورج کلا سہائے کے نام پر اعزاز شروع کیے گئے۔ اردو ڈراموں اور تھیٹر کی ترقی کے لیے مشہور ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف کے نام پر اس سال سے ایوارڈ دیا جارہا ہے۔ پروگرام کی شروعات میں جناب راجیو سنگھ نے گیت اور نظمیں پیش کیں۔ اس سے قبل اکادمی کی سکریٹری محترمہ ڈاکٹر نصرت مہدی نے سبھی مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ محکمہ ثقافت کے احکامات کے مطابق کام کرتے ہوئے اردو اکادمی کی سرگرمیوں اور پروگراموں میں پہلے کے مقابلے بہت اضافہ ہوا ہے۔ محکمہ ثقافت کو اردو اکادمی سے امید بھی یہی ہے کہ اردو زبان زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔ اکادمی کا باوقار نواب صدیق حسن خاں اعزاز پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن کو دیا گیا۔ تحقیق وتنقید میں آپ کا نام قابل ذکر ہے۔ کل ہند اعزاز: حکیم قمر الحسن اعزاز ڈاکٹر ماجد حسین بھوپال کو، جوہر قریشی اعزاز، جناب مصطفیٰ کمال، حیدرآباد کو، میر تقی میر اعزاز جناب محمود سحر اجین کو، حامد سعید خاں اعزاز جناب رہبر جونپوری بھوپال کو، شاداں اندوری اعزاز جناب عزیز انصاری اندور کو، ابراہیم یوسف اعزاز، جناب حمید اللہ خاں ماموں بھوپال کو دیا گیا۔

صوبائی اعزاز: سراج میر خاں اعزاز، جناب شیخ نظامی جبلپور کو، باسط بھوپالی اعزاز، جناب ایاز قمر بھوپال کو، محمد علی تاج اعزاز، جناب صابر ادیب بھوپال کو، نواب شاہ جہاں بیگم تاجور اعزاز جناب ظہیر پرویز مہو کو، پنالال شریواستو نور اعزاز، جناب اتل اجنبی، گوالیار کو، سورج کلا سہائے سرور اعزاز، جناب حیدر بیابانی، بیتول کو، جاں نثار اختر اعزاز، جناب تبسم دھاروی دھار کو، ندا فاضلی اعزاز، جناب نیر دموہی دموہ کو، شعری بھوپالی اعزاز، جناب ایس ایم شکیل برہانپور کو، کیف بھوپالی اعزاز محترمہ صالحہ کوثر بھوپال کو، شمبھو دیال سخن اعزاز، جناب آلوک شریواستو، ودیشہ کو اور شفا گوالیاری اعزاز محترمہ رشمی صبا گوالیار کو دیا گیا۔

پریس ریلیز: سکریٹری ایم پی اردو اکادمی، بھوپال، 18 مئی 2018

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم انعامات

نئی دھلی: اردو اکادمی کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم انعامات 2017 برائے یادو ناپر زیونیورسٹیز، بورڈز، اردو سرٹیفکٹ کورس، اردو کمپیوٹر کورس اور اردو کتابت کورس کا انعقاد قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں کیا گیا، جس کا آغاز معروف داستان گو فوزیہ کی داستان 'گاندھی نامہ' سے ہوا۔ اس داستان میں فوزیہ کے ہمراہ فیروز خان نے بھی داستان پیش کی۔ اس موقعے پر اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ جو اردو کے طلبا و طالبات پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کرتے ہیں، انھیں اکادمی انعامات سے نوازتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود نے انعامات حاصل کرنے والے تمام طلبہ و طالبات اور ان کے والدین کو مبارکباد دی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ میں تمام انعام یافتگان اور ان کے والدین

کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ اکادمی اردو کی آئندہ نسلوں کی حوصلہ افزائی کررہی ہے۔ اردو کا مستقبل آپ سے وابستہ ہے۔ سوشل میڈیا کے اس عہد میں اکادمی آپ کو گونگا بننے سے روک رہی ہے۔ اکادمی کے ذریعے اردو کا فروغ ہورہا ہے۔ دہلی اردو کا گھر ہے، اردو یہاں زندہ ہے، آپ کو 3 زبانیں سیکھنا ناگزیر ہے، اردو، ہندی اور انگریزی۔ اکادمی کی تعلیمی سب کمیٹی کے کنوینر فریادالحق وارثی نے اظہار تشکر پیش کیا۔ جبکہ تقسیم انعامات کی نظامت ریشماں فاروقی نے کی۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے سبھی مہمانوں کا گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ اس جلسے میں تقریباً 70 طلبا و طالبات کو مجموعی طور پر 1,32,950 روپے نقد، سرٹیفکٹ اور اکادمی کا نشان پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مئی 2018

تنویر رضا برکاتی

مدھیہ پردیش: مدھیہ پردیش کا ایک معروف علمی و تاریخی شہر برہان پور کو برصغیر ہند و پاک میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہ شہر صدیوں سے علما، ادبا، شعرا، صوفیا کا مرکز رہا۔ یہاں بے شمار تاریخی اور یادگار عمارتیں قائم

ہیں، جو صدیوں سے عوام کو سیر و تفریح کا سامان فراہم کررہی ہیں۔ ان تاریخی عمارتوں میں ایک شاہی قلعہ بھی ہے، جسے مغل شہنشاہ شاہجہاں نے بنوایا تھا، جہاں پر ارجمند بیگم ممتاز محل نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں اور اسی مقام پر 7/ جون 1631 کو بیگم کا انتقال ہوا۔ جس قلعے میں بیگم نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی، اس قلعے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ شہر برہان پور کے لوگوں کے لیے بلاتفریق مذہب وملت شان و وقار، اتحاد و یک جہتی اور پیار ومحبت کی ایک اعلیٰ ترین علامت بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ 49 / برسوں سے آصف پروڈکشن بھارت کے زیر اہتمام بیگم ممتاز محل کی برسی پر اس کی یاد میں 'ممتاز فیسٹول' کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ واضح ہو کہ اس خاص موقع پر ہر سال شہر برہان پور کی کسی خاص علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیت کو بااثر شخصیات کے ہاتھوں ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ ہر سال کی طرح امسال بھی ممتاز فیسٹیول کا انعقاد 7 مئی بروز پیر کو مومن جماعت خانہ میں ایک باوقار تقریب میں پنڈت ساگر ترپاٹھی، سورج ناگر سابق ایس ڈی ایم برہان پور، ڈاکٹر واصف یار، ریاض کھوکھر، ضیاء انعامدار کے ہاتھوں شہر برہان پور کے افق پر ابھرنے والے ایک درخشندہ ستارے جناب تنویر رضا برکاتی کو ان کی گوناگوں خدمات کے اعتراف میں 'کوہ نور آف برہان پور' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

رپورٹ: محسن رضا ضیائی، ناندیڑ، مہاراشٹر، 23 مئی 2018

اجرا:

بے پرواہ روح

نئی دھلی: تخلیقیت میری روح اور محبت میرا پیغام ہے۔ میری شاعری کی اساس محبت اور انسانیت ہے۔ ان خیالات کا اظہار شاعرہ، مصور اور چیف کمشنر آف انکم ٹیکس دہلی سنگیتا گپتا نے اپنے ہندی مجموعۂ کلام 'بے پرواہ روح' کے اردو ورژن کی تقریب پذیرائی سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ آئیڈیا کمیونی کیشنز، پرتھوی فائن آرٹ اینڈ کلچرل سینٹر اور دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب کی صدارت معروف میڈیکل سائنٹسٹ ڈاکٹر سید فاروق نے کیا، جبکہ تعارفی کلمات آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے پیش کیے۔ معزز مقررین میں اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول، صدر شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر ہیم لتا مہیشور، پوسٹ ماسٹر جنرل مظفر ابدالی شامل تھے۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ صدارتی خطبے میں ڈاکٹر سید فاروق نے سنگیتا گپتا کو متنوع صلاحیتوں کا حامل بتاتے ہوئے کہا کہ اردو والوں میں ان کا استقبال ہے۔ پرفیسر خالد محمود نے کہا کہ سنگیتا گپتا کی شاعری اور شخصیت میں ایک کشش ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 15 مئی 2018

'غنچۂ نو' اور 'شعاعیں'

کامٹی: 15 مئی 2018 ڈاکٹر خلیل اللہ لائبریری، بھوئی لائن کامٹی میں آئیڈیل پبلی کیشن ہاوس کامٹی کے زیر اہتمام ماسٹر اظہر حسین کی 'غنچۂ نو' (بچوں کی نظمیں) اور خورشید عالم کا غزلوں کا مجموعہ 'شعاعیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ دونوں کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہیں۔ تقریب کی صدارت جناب ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس ماہر ماحولیات نے کی اور مہمانان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر افتخار حسین اور ڈاکٹر نسیم اختر موجود تھے۔ 'غنچۂ نو' کا اجرا ڈاکٹر ارشد جمال اور 'شعاعیں' کا اجرا استاد مولوی روش جعفری کربلائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اظہار خیال اور صدر محترم ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس کے خطبۂ صدارت کے بعد پروگرام کے اختتام کا اعلان ہوا۔ ماسٹر توحید الحق اور محمد ایوب نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

رپورٹ: سہیل عالم، بھوئی لائن، کامٹی، 24 مئی 2018

'لمحوں کے قدم' کی تقریب رونمائی

ھوڑہ: ادب خوبصورت اور شیریں لفظوں کا وہ پیرایہ ہے جس سے ادیب اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ بلاشبہ ادب سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ متذکرہ باتوں کا اظہار شیب پور پی ایم بستی میں واقع ہوڑہ ہائی اسکول (ایچ ایس) میں منعقدہ ہوڑہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام معروف شاعر و ادیب معصوم شرقی کی کتاب 'لمحوں کے قدم' کی رسم رونمائی کے موقعے پر مقررین نے کیا۔ اس موقعے پر احمد کمال حشمی، صدر بزم شہر نشاط بلال حسن، انجم عظیم آبادی، ڈاکٹر ظہیر انور، نثار احمد، معین وقار، نصر اللہ نصر، ایم علی، ڈاکٹر شمس الحسن انصاری، وحشی ہوڑوی اور دیگر نے صاحب کتاب کی پذیرائی کی۔ حاضرین محفل میں حاجی رفیق انجم، بابو بھائی، فہیم انور، عارف حسین، نقیب اکبر، شکیل افروز، عظیم انصاری، ابراہیم آتش، ارشاد علی، امیت اپادھیائے، ظہیر السلام، قمر الدین قمر، شاہد فروغ، ایم اے قاسم علیگ اور دیگر موجود تھے۔ اس تقریب کے موقعے پر انجم عظیم آبادی کے ہاتھوں معصوم شرقی کی کتاب کا رسم اجرا ہوا جہاں صدر مجلس پروفیسر قیصر شمیم نے صاحب کتاب کی پذیرائی کی، وہیں انھوں نے مفید مشورے سے بھی نوازا۔ پروگرام میں نقابت کے فرائض بحسن خوبی ڈاکٹر مشتاق انجم نے ادا کیے جبکہ ادارہ کے اسسٹنٹ سکریٹری فیروز مرزا اور اصغر ندیم نظامی اور دیگر پیش پیش رہے۔

روزنامہ 'سیاسی پیغام' ہوڑہ، 14 مئی 2018

نورامروہوی نمبر کی رسم اجرا

امروھہ: بزم زندہ دلان امروہہ کے زیر اہتمام ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد محفل مشاعرہ برمکان اکرام زیدی محلّہ

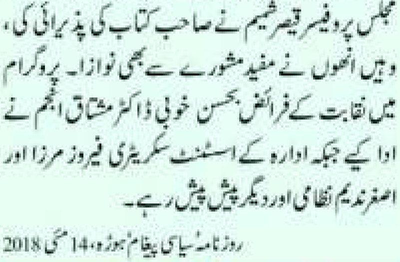

سرائے کہنہ کیا گیا جس میں ہفت روزہ 'عوامی رائے' (ممبئی) کے نورامروہوی نمبر کی رسم اجرا بھی کی گئی۔ صدارت سینئر

شاعر جاوید اقبال نے فرمائی، نظامت کے فرائض سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی (چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ) رہے۔ اجرا جاوید اقبال، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، محبوب حسین زیدی، ڈاکٹر مہتاب امروہوی، سید شیبان قادری، اکرام زیدی، ناصر امروہوی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 17 مئی 2018

چند درخشاں پہلو

جمشید پور: سیرتِ طیبہ کے چند درخشاں پہلو نامی کتاب کا 13 مئی بروز اتوار مسجد ہاجرہ رضویہ اسلام نگر کپالی وایا مانگو جمشید پور میں علمائے کرام کے ہاتھوں سے اجرا ہوا۔ اس موقعے پر مدینہ مسجد کے امام وخطیب و رضا فورئی کے ڈائرکٹر الحاج مفتی عبدالمالک مصباحی نے سیرت کی اہمیت پر بہت معمولی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کامیاب زندگی کے لیے رسول کریم کی سیرت پر عمل کرنا چاہیے۔ مولانا ہارون رشید، ڈاکٹر نورالزماں و مدرسہ فیض العلوم جمشید پور کے پرنسپل مولانا نصیرالدین، واردو کے عظیم مفکر و رائٹر شاکر عظیم آبادی نے بھی تقریر کی اور زودنویس قلم کار حافظ محمد ہاشم قادری صدیقی مصباحی کی دینی، سماجی، اصلاحی وقلمی خدمات کو سراہتے ہوئے مبارک باد پیش کی۔ مصنف نے کتاب کی قیمت آپ کا مطالعہ اور دعا برائے صحت وعافیت وخاتمہ بالخیر (فری) رکھا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2018

مخمور سعیدی کے شعری آفاق

نئی دهلی: ہماری ساری لڑائی حاشیائی اور مرکز کی ہے کیونکہ جو لوگ مرکز میں ہیں وہ انھیں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے جس کی وجہ سے حاشیائی ادب کو وہ مقام نہیں مل سکا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ یہ بات مشہور نقاد حقانی القاسمی نے سیماچل میڈیا منچ کے زیر اہتمام قسیم اختر کی کتاب مخمور سعیدی کے شعری آفاق کے رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ مخمور سعیدی کی شاعری سماج کی تہذیبی، اخلاقی شکستگی کا نوحہ بھی ہے اور اپنے عہد کے انتشار اور اپنے تخلیقی اضطراب کا اظہار بھی۔ مخمور سعیدی کے شعری آفاق کے مصنف ڈاکٹر قسیم اختر نے مخمور سعیدی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالد مبشر، سلمان عبدالصمد، عمران عاکف، امتیاز رومی، افتخار الزماں، منظر امام، ابصار احمد صدیقی اور عابد انور نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت کے فرائض خان رضوان نے ادا کیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 مئی 2018

چہار سو

حیدر آباد: پاکستان کے مشہور رسالے 'چہار سو' کا تازہ شمارہ 'بیگ احساس نمبر' ہے۔ 'چہار سو' کے بانی ضمیر جعفری تھے۔ یہ رسالہ مشہور افسانہ نگار گلزار جاوید کی ادارت میں راولپنڈی میں شائع ہوتا ہے۔ حال میں جن ادیبوں اور شاعروں پر نمبر شائع ہوا، ان میں منیب الرحمٰن، گلزار دہلوی، اسد محمد خاں، اقبال مجید، شمیم حنفی، مجتبیٰ حسین، سلام بن رزاق، حمیدہ معین رضوی، مرزا حامد بیگ، منور رانا، عبدالصمد، نوشی گیلانی، مشرف عالم ذوقی وغیرہ شامل ہیں۔ بیگ احساس نمبر میں ان کے متعلق تفصیلات بعنوان 'سرمئی شام کا اجالا' چالیس سوالات پر مشتمل تفصیلی انٹرویو براہ راست مجتبیٰ حسین، وارث علوی، مرزا حامد بیگ، سرور الہدیٰ، رضوانہ پروین اور مولا بخش کے مضامین کے علاوہ بیگ احساس کا ایک افسانہ اور ایک تنقیدی مضمون شامل ہیں۔ 'چہار سو' ایک ایسا معیاری اور معتبر رسالہ ہے جس کا ہر نمبر اردو حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی بھی ادیب وشاعر کے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 31 مئی 2018

وفیات:

شیخ سلیم احمد

نئی دهلی: معروف ادیب شیخ سلیم احمد 82 سالہ ادیب 10 مئی کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر جسولہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم شیخ سلیم احمد سہارنپور کے ایک گاؤں راجو پور میں 1936 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مظفر نگر اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ سے حاصل کر کے دہلی آگئے اور فتح پوری اسکول میں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ روز ساہتیہ اکادمی میں بھی کام کیا۔ وہاں سے ترقی اردو بیورو سے وابستہ ہوگئے۔ وہیں سے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے 1996 میں سبکدوش ہوئے۔ شیخ سلیم ایک اچھے استاد کے ساتھ ساتھ اچھے افسانہ نگار بھی تھے وہ محقق بھی تھے۔ سلک معنی ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور جلسہ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں پر بھی انھوں نے ایک تحقیقی کتاب شائع کی تھی۔ امیر خسرو سے بھی ان کی گہری دلچسپی تھی۔ خسرو پر بھی ان کی کتاب شائع ہوئی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 مئی 2018

پروفیسر سلیمان خورشید

کلکته: کلکتہ شہر کی معروف سماجی اور علمی شخصیت پروفیسر سلیمان خورشید کا 14 مئی صبح کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 65 سال کے قریب تھی۔ کلکتہ شہر کے کئی تاریخی اداروں سے وابستہ رہے ہیں جن میں مسلم انسٹی ٹیوٹ اور شہرہ آفاق محمڈن اسپورٹنگ کلب قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف ملی کونسل سے بھی وابستہ تھے۔ روزنامہ آزاد ہند، اخبار مشرق، آبشار اور اقرا کے اسپورٹس کے صفحات کو مرحوم نے اپنی خبر نگاری اور تجزیہ نگاری کے ذریعے دستاویزات میں بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسپورٹس کی صحافت میں مشرقی ہندستان میں مرحوم ڈاکٹر جاوید نہال کے بعد مرحوم سلیمان خورشید کو ہی نمایاں پہچان حاصل رہی۔ پروفیسر سلیمان خورشید کی مغربی بنگال کے مسلمانوں کے حالات پر گہری نظر تھی۔ اس کے علاوہ وہ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے تین دہائیوں تک اردو زبان کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے جدوجہد کی۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 16 مئی 2018

محمد عمر واثق

سنبهل: سرائے ترین وشہر سنبھل کے واقعہ نگاری وگیت کے معروف شاعر محمد عمر واثق کا انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 75 سال کے تھے۔ واضح رہے کہ مرحوم نے تقریباً 50 سال سے زائد اردو شعروادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔ اس درمیان ان کے درجنوں واقعہ نگاری کے کتابچے منظر عام پر آئے۔ انھوں نے پسماندگان میں تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ ان کی تدفین میں شہر و اطراف کے ادبا وشعرا نے شرکت کی۔ اس موقعے پر شرکا نے مرحوم کے لیے اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 مئی 2018

پروفیسر زبیر انور

نئی دهلی: معروف دانشور وادیب، معروف دینی وعلمی خانوادے کے سپوت اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر زبیر انور کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور ان کی موت کو تعلیمی وتربیتی میدان کا بڑا خسارہ قرار دیا گیا۔ تواضع وخاکساری، اسلامی وضع قطع اور آداب وشعائر کا پاس ولحاظ، احکام شریعت کی پابندی ان کی پہچان تھی۔ وہ اعلیٰ اخلاق وکردار سے متصف تھے اور سماجی کام میں پیش پیش رہتے تھے اور حقیقی معنوں میں نامور علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان خیالات وتاثرات کا اظہار مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی نے کیا۔ 20 مئی بوقت ظہر دہلی کے ایمس اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پروفیسر زبیر انور معروف عالم دین،

سابق شیخ الحدیث، جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا شمس الحق سلفی کے صاحب زادے اور معروف محقق ڈاکٹر عزیر شمس کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کی اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ میں پروفیسر رہے۔ آپ شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 مئی 2018

نشاط دہلوی

دیوبند: اردو کے استاد شاعر نسیم سہارنپوری کی اہلیہ نشاط دہلوی کا 25 مئی کو انتقال ہوگیا۔ نشاط دہلوی نے اپنا ادبی سفر 50 سال قبل شروع کیا اور ملک کے مختلف حصوں میں اردو کی آبیاری کی۔ نشاط دہلوی، ممبئی، بنگلور وغیرہ میں ایک دور میں کافی مشہور و معروف تھیں۔ نسیم سہارنپوری کے ساتھ شادی کے بعد دونوں کا شعر و ادب سے رشتہ رہا۔ نشاط دہلوی گذشتہ ڈیڑھ سال سے صاحب فراش تھیں۔ 70 سالہ نشاط دہلوی کے انتقال سے اردو ادب کو نقصان ہوا ہے، ان کے انتقال کی خبر کے بعد ابوالمعالی گدی واڑہ میں واقع مکان پر تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، نماز جنازہ احاطہ مولسری میں دارالعلوم دیوبند کے استاد قاری فوزان نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں عمائدین شرکا کے علاوہ علاقہ کے شعرا و ادبا اور سرکردہ افراد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 مئی 2018

مظہر کلیم

ملتان: جاسوسی فکشن یا سری ادب کے شائقین کے لیے مظہر کلیم کے انتقال کی خبر ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ پانچ

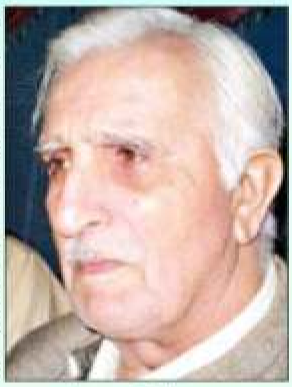

سو سے زیادہ ناولوں کے مصنف مظہر کلیم کا ایک منفرد انداز تحریر تھا اور وہ کئی نسلوں کے محبوب رائٹر تھے۔ ان کا ہفتہ (26 مئی) کے روز ملتان میں انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے بیمار تھے، ان کی عمر 75 برس تھی۔ ایک عرصہ تک اَن گنت اردو مصنفین نے ابن صفی کے تخلیق کردہ زندہ جاوید کرداروں بی فریدی، حمید اور عمران پر مبنی ناولز لکھے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جو اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ مگر مظہر کلیم کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے نہ صرف ڈیٹکو فکشن میں ابن صفی کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ ان کے ناولز کو حیرت انگیز مقبولیت بھی ملی۔ سچ یہ ہے کہ ابن صفی کے 'ڈاے ہارڈ' پرستاروں نے ہر نئے لکھنے والے کو ابن صفی کی کسوٹی پر ہی پرکھنا چاہا، پھر وہ زبان و بیان ہو، پلاٹ یا مزاح۔ ویسے بھی ابن صفی کے قائم کیے سحر سے باہر آنا اس جنریشن کے لیے آسان نہیں تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2018

ڈاکٹر مقبول احمد

دلسنگھ سرائے: آربی کالج کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد کا ہفتہ کی شب یعنی 2 جون 2018 کو سب ڈویژنل اسپتال میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تقریباً بارہ بجے شب آخری سانس لی۔ وہ 65 سال کے تھے۔ اسی سال اکتوبر میں ان کی سبکدوشی تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ، تین لڑکے اور لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ اس موقعے پر کالج انتظامیہ نے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مقبول احمد نہ صرف اچھے پروفیسر تھے بلکہ وہ ایک بہترین انسان تھے۔ اساتذہ یونین کے سکریٹری ڈاکٹر سنجے جھا نے بتایا کہ تقریباً 15 برس تک انھوں نے کالج کی خدمت کی۔ کالج کے پرنسپل آنند موہن جھا، ڈاکٹر مہندر جھا، ڈاکٹر ول کمار، ڈاکٹر مکل بہاری ورما سمیت کالج انتظامیہ نے ان کے انتقال پر غم کا اظہار کرتے ہوئے اہل خانہ کے صبر و تحمل کے لیے نیک خواہشات ظاہر کی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جون 2018

محمد عمر میمن

محمد عمر میمن نے اپنی کتاب The Greatest Urdu Stories Ever Told میں لکھا ہے۔ میں نے جب اپنے

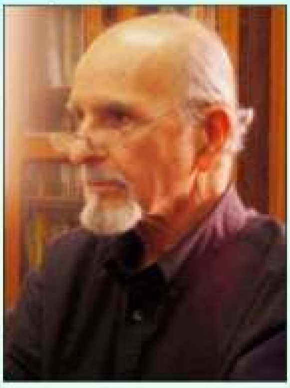

ایک دوست کو کہا کہ میں امریکہ میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں تو اس نے مجھے کہا کہ یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ اس نے کہا کہ میں صرف اپنی خدمت کر رہا ہوں۔ یہ سننا تلخ تھا لیکن یہ سچائی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں دوسروں کی نظر میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں لیکن میری سمجھ میں، میں صرف وہی کر رہا ہوں جو کرنے میں مجھے مسرت حاصل ہو رہی ہے۔

محمد عمر میمن 4 جون کے دن امریکا میں انتقال کر گئے ان کا جنم 1939 کو علی گڑھ انڈیا ہوا تھا۔ چھ بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ 1954 میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی میں آباد ہوگئے جہاں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور پنجل سرمست یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ 1964 میں فل برائٹ اسکالرشپ پر انہیں امریکہ جانا پڑا جس کے بعد سے وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں ہارورڈ یونیورسٹی سے انھوں نے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ اور وہیں انھوں نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس، یو سی ایل اے سے اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی اور 1970 میں وسکانسن میڈیسن سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں وہ 38 سال تک اردو ادب اور عربک اسٹڈیز پڑھاتے رہے اور وہاں سے انگریزی میں دا اینول آف اردو اسٹڈیز بھی نکالتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ لکھنے پڑھنے کام کرتے رہے اور یہ سلسلہ انھوں نے تاحیات جاری رکھا۔ محمد عمر میمن لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں یقین رکھتے تھے اسی لیے انھوں نے اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں بہت سارے تراجم کیے۔ محمد عمر میمن خود اچھے افسانہ نگار بھی تھے لیکن انھوں نے زیادہ توجہ تراجم کو دی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 1989 کو تاریک گلی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انتظار حسین، عبداللہ حسین اور نیر مسعود، ان کے قریبی دوست تھے۔ ایک بار انھوں نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا "میں نے تینوں کو انگریزی کی دنیا میں متعارف کرایا لیکن انھیں کبھی میرا لکھا ہوا ترجمہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی سے اردو تقریباً پندرہ ناول ترجمہ کیے۔ ان کے تراجم کا سلسلہ، تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جس میں بین الاقوامی طور پر مشہور ادیبوں سے کیے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔

فیس بک سے

پروفیسر عظیم الشان صدیقی

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر عظیم الشان صدیقی 4 جون 2018 کو دریا گنج، دہلی میں مغرب کے وقت انتقال کر گئے۔ تدفین دہلی کے پنج پیران قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم ایک عرصے سے بیمار تھے۔

پسماندگان میں ایک بیٹا علی ارشد اور بیوہ شامل ہیں۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا سوگوار ہے۔ عظیم الشان صدیقی 10 اکتوبر 1935 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں پروفیسر محمد حسن کے زیرِ نگرانی ڈاکٹریٹ کا مقالہ تحریر کیا۔ خیال رہے کہ پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ شعبہ کے صدر بھی رہے۔ اچھے استاد کے ساتھ ساتھ انھوں نے متعدد اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جو اردو نصاب کا اہم حصہ ہیں۔ اظہار خیال (1990) اور افسانوی ادب (1983) ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین سیدین (1988)، مشاہیر کی آپ بیتیاں (2000)، افسانہ نگار پریم چند: تنقیدی و سماجی محاکمہ (2006)، اردو ناول آغاز و ارتقا (2008) ان کی اہم کتابیں ہیں۔ 1999 میں وہ شعبۂ اردو سے سبکدوش ہوئے۔ عظیم الشان صدیقی کو دہلی اردو اکادمی نے ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا اس کے علاوہ بھی متعدد اکادمیوں سے انھیں ایوارڈ ملے تھے۔ وہ دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 جون 2018

خراج عقیدت:

ڈاکٹر یوسف

شاھجھاں پور: معروف شاعر و افسانہ نگار اور سہ ماہی 'افق نو' کے بانی ڈاکٹر یوسف گوہر کی ساتویں برسی پر انھیں خراج پیش کیا گیا۔ اس دوران قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کر کے مرحوم کو ایصال ثواب کیا گیا۔ اس دوران شاعر اصغر یاسر نے کہا کہ یوسف گوہر ایک شاعر، افسانہ نگار، ادیب، صحافی اور 'افق نو' کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ اور با اخلاق انسان تھے۔ ان کے دل میں اردو زبان و ادب کی بے پناہ محبت بھری تھی۔ وہ صحیح معنوں میں اردو کے سچے خادم تھے۔ استاد آفتاب عالم خاں کامل وارثی نے کہا کہ ڈاکٹر یوسف گوہر کی اردو ادب میں کی گئی بیش بہا خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے انتقال سے اردو زبان و ادب کا ایک سچا خادم ہم سے رخصت ہو گیا۔ مگر ان کی جلائی اردو کی شمع ابھی روشن ہے۔ محمد احمد انصاری نے کہا کہ ان کے کارنامے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 مئی 2018

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر .... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام: ....

پتہ: ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in, فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فرہنگ ادبیات

مصنف: سلیم شہزاد
صفحات: 831
قیمت: 345 روپے

فلکیاتی بستہ

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 65 روپے

فلکیاتی نظارے

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 60 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

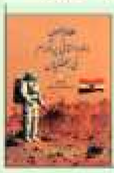

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

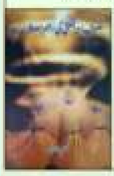

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت 185 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

انتخاب سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اول ودوم)

مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

عروج فن کلیات خلیل الرحمن اعظمی

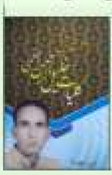

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف: ڈاکٹر سمتیندر رانا ڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

کلیات بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات: 383
قیمت: 180 روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

انتخاب سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 26109746-011، فیکس: 26108159-011، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, July-2018, Vol.20, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/06/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گئے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

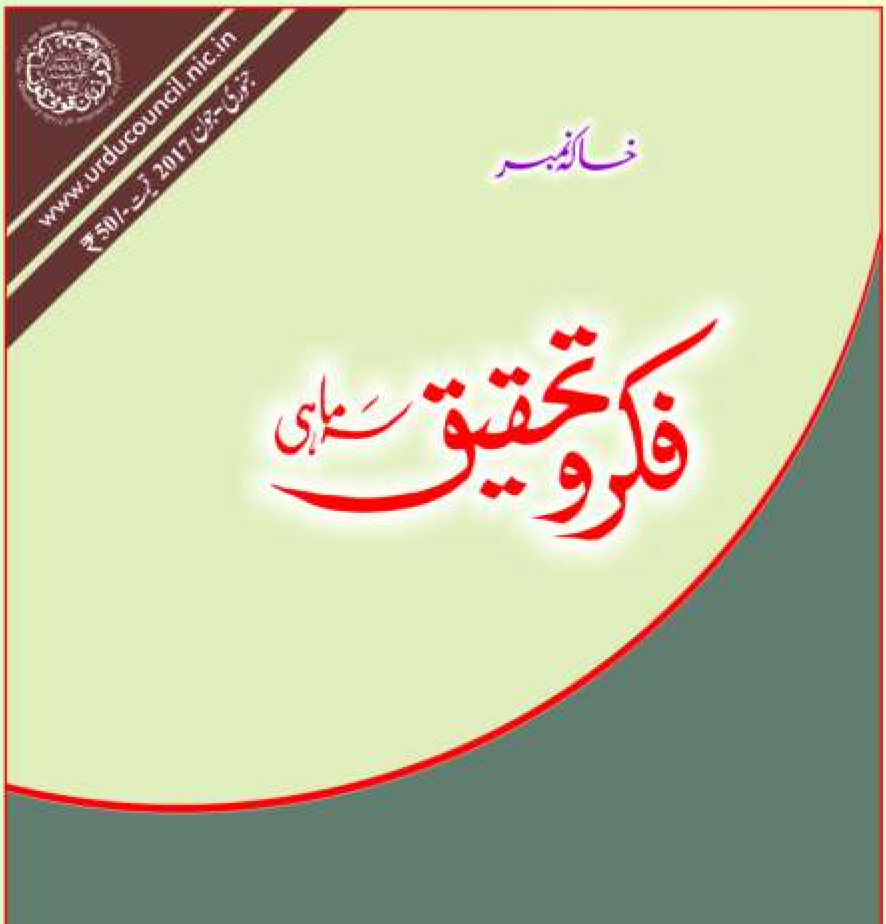

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025